بادشاہوں ، ڈکٹیٹروں ،
شہزادوں ، شہزادیوں ، حاکموں
اور
دیگر مشاہیر تاریخ کی رومانی ،
ازدواجی اور نجی زندگی کی صحیح تفصیلات

مولانا
امان اللہ خاں
ارمان

کتاب منزل ۔ کشمیری بازار ۔ لاہور
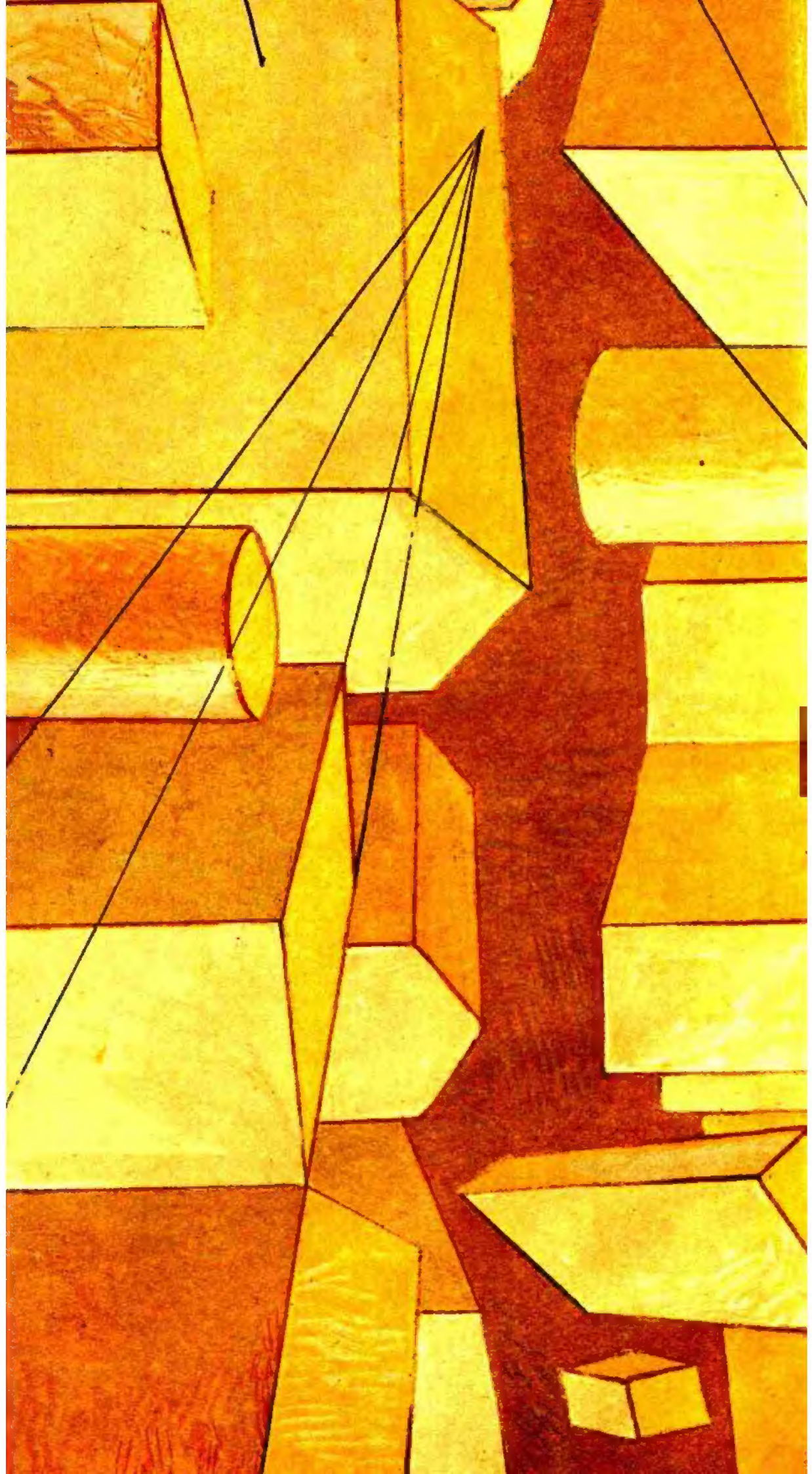
مشاہیر کے رومان

امان اللہ خان آرمان سرحدی

کتاب منزل۔ کشمیری بازار۔ لاہور

مشاہیر کے رومان

بادشاہوں، ڈکٹیٹروں، شہزادوں، شہزادیوں،
حاکموں اور دیگر مشاہیر تاریخ کی رومانی، ازدواجی
اور نجی زندگی کی صحیح تفصیلات

امان اللہ خان آرمان سرحدی

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

مختصر فہرست

فہرس

اِن کتابوں سے مدد لی گئی

۱ ۔ کمال اتاترک — مصنفہ توفیق مصری
۲ ۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا — مصنفہ اے حمید بیرسٹرایٹ لا
۳ ۔ سٹالن کی نجی زندگی — مصنفہ فشر
۴ ۔ تاریخ انقلاباتِ عالم (جلد اول) — مصنفہ ابوسعید بزمی
۵ ۔ دنیا کے ۴۲ مشاہیر کے رومان — مصنفہ عبدالرحیم شبلی بی کام
۶ ۔ دیدوشنید — مصنفہ رئیس احمد جعفری
۷ ۔ وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج — مصنفہ ای پی مون ترجمہ سید اولاد علی
۸ ۔ نورجہان بیگم — مصنفہ مرزا حیرت دہلوی
۹ ۔ نورجہاں جہانگیر — مصنفہ منشی محمد دین فوق
۱۰ ۔ بڑے آدمیوں کا عشق — مصنفہ خوشتر گرامی
۱۱ ۔ شاہی محلات کی پریم کہانیاں — مصنفہ خوشتر گرامی و راجہ مہدی علی خاں
۱۲ ۔ سنگم اور سائے — مصنفہ عبدالقدیر رشک

GREY WOLF by ARMSTRONG — ۸
A KING'S STORY by H.R.H. DUKE OF WINDSOR — ۹
MEMORIES OF WARREN HASTINGS by G.R.G. LEIG. — ۱۰
WARREN HASTINGS by MERVYN DAIRES. — ۱۱
ONE HUNDRED GREAT LIVES by ODHAMS PRESS. — ۱۲

عورت ـــــ حُسن ـــــ محبّت

عورت کیا ہے!

ہٹلر ـــــ بے جا تعریف سے عورت خوش ہوتی ہے مگر جائز تنقید کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

مسولینی ـــــ ۱۔ عورت کو زبان کے ذریعہ مسحور کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کسی شخص کی فطرت میں مردانگی کا جوہر جتنا زیادہ ہو اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے جس شخص کو جتنے زیادہ ذرائع حاصل ہوں، اسی قدر وہ دلی مسرت کے لیے عورت کے ناز و کرشمہ اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی سے بے نیاز رہتا ہے۔

۳۔ عورت کو جسمانی اور دماغی لحاظ سے مرد سے کمتر درجہ حاصل ہے۔

سٹالن ـــــ اپنے عیب معلوم کرنا چاہتے ہو تو جان پہچان کی عورتوں سے دریافت کرو۔

نپولین ـــــ عورت کو سونے کی زنجیر سے باندھ رکھو، تا کہ تم پر سوار نہ ہو سکے۔

کمال اتاترک۔ عورت کو کبھی امتحان میں نہ ڈالو ورنہ تمہیں دُکھ ہوگا۔

گراہم بیل ـــــ عورت فطرتاً نیک خصلت ہے۔

وارن ہیسٹنگز۔ عورتوں کی محفل بہت دلچسپ ہوتی ہے۔

مارٹن لوتھر ـــــ عورت کا محبت بھرا دل دنیا میں سب سے بڑی شے ہے۔

سقراط ـــــ عورتوں کے مشورے پر کبھی عمل نہ کرو، تمام آفات سے محفوظ رہو گے۔

سیموئیل ـــــ خوبصورت عورت کو دیکھنے سے آنکھ اور نیک دل عورت کو دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن۔ عورت انسان اور فرشتوں کے درمیان ایک مخلوق کا نام ہے۔

ٹامس مور ـــ عورت کے آنسو دنیا کی سب سے بڑی آبی قوت ہے ۔
ٹھیکرے ـــ مرد کو خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ عورت اس کی حقیقت کو نہ جانے ۔
یحییٰ برمکی ـــ عمر کی کسی بھی منزل میں عورت کو اس کی مرضی پر نہیں چھوڑنا چاہیے ۔
ہربرٹ سنپر ـــ عورت کا دل اس کے دماغ پر حکومت کرتا ہے ۔
اے شیڈ ـــ ضروری نہیں کہ کوئی عورت بچہ پیدا کر کے ماں بن جائے ۔
آسکر وائلڈ ـــ مرد ہمیشہ عورت کا اولیں مرکزِ خیال بننے کی خواہش رکھتا ہے مگر عورت کی فطرت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ مرد کا آخری رُومانس بننا چاہتی ہے ۔
ٹالسٹائی ـــ دنیا میں جو تعیشات ہم دیکھتے ہیں یہ سب عورت کی ضروریات کا نتیجہ ہیں ۔
گوئٹے ـــ عورت کی شیرینی اور بہار گلاب کے پھول کی طرح جلد زائل ہو جاتی ہے ۔
گوئلر ـــ انسان کے لیے خدا کی سب سے قیمتی بخشش عورت ہے ۔
والٹیر ـــ عورت مرد کو مانوس کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے ۔
تھامس برٹن ـــ عورت کے آنسو ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں جب تک وہ زار و قطار نہ روئے ۔
سپنسر ـــ عورت کا بہترین زیور اس کی شرم اور خاموشی ہے ۔
ڈارتھی ڈکس ـــ بیوہ کے آنسو پونچھنا دنیا کا سب سے خطرناک کام ہے ۔
سعدی ـــ نیک آدمی کے گھر میں بُری عورت اس کے لیے دنیا میں جہنم کے برابر ہے ۔
" ـــ جس گھر میں عورت کی آواز زور سے نکلے اس گھر پر خوشی کا دروازہ بند کر دو ۔
لانگ فیلو ـــ عورت عام طور پر بولتی ہی رہتی ہے ۔
برٹرنڈرسل ـــ مرد عموماً بزدل عورتوں کو پسند کرتے ہیں تاکہ ان کی حفاظت کر کے ان کے داتا بن جائیں ۔
براؤن ـــ سب سے خوش نصیب آدم تھا کہ اس کی کوئی ساس نہ تھی ۔
ایمرسن ـــ اچھی عورتوں کے اقتدار کا نام تمدن ہے ۔
ابوالعلا معرّی ـــ اگر عورتیں نہ بنائی جاتیں تو انسانی سعادت کی ابتدا ہو جاتی ۔
تھوریو ـــ شادی ایک طویل گفتگو کا نام ہے جس میں رہ رہ کر جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ۔

حُسن کیا ہے!

ہٹلر ——— بدصورت عورت اور کمزور مرد کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔

〃 ——— میں نے حُسن کی تعریف سُنی ہے مگر اُسے دیکھا نہیں۔

مسولینی ——— جو عورت حُسن سے محروم ہے وہ نصف زندگی لے کر اس دنیا میں آئی ہے۔

سٹالن ——— حُسن کا کوئی ایک معیار نہیں، لیکن ہر شخص اس کے لیے ایک معیار مقرر کر لیتا ہے۔

نپولین ——— میں نے مردانہ حُسن کو نسوانی حُسن سے بڑھ کر پایا، مگر اس کا تاثر اور ہی ہے۔

کمال اتاترک ۔ یہ میرا ایک عیب ہے کہ میں حُسن کی تعریف میں مبالغہ نہیں کرتا۔

مارٹن لوتھر ——— خوبصورتی کا اثر قبول نہ کرنا گناہ ہے۔

پولائن (نپولین کی بہن) ۔ (بسترِ مرگ پر آئینہ دیکھ کر) خدا کا شکر ہے کہ میں اب بھی خوبصورت ہوں۔

رضیہ سلطانہ ——— آنکھ حُسن کا مرکز ہے۔

گوئٹے ——— حُسن جہاں بھی ہو اس کی تعریف ہی کی جاتی ہے۔

معرّی ——— اگر حُسن ایک آنی جانی چیز ہے تو پھر حسینوں کو رنج ہی رنج ملا ہے۔

〃 ——— کوئی حسین اپنی شکل پر نازاں نہ ہو کیونکہ بدصورتی کی طرح حسن بھی بالآخر مٹی میں ملنے والا ہے۔

رسکن ——— ہم حُسن کی حقیقت سے اس وقت واقف ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر خدا کے ہر کام میں حُسن و جمال کا احساس کرنے لگ جائیں۔

پوپ ——— خوبصورت کو بدصورت سے اس طرح بچنا چاہیے جس طرح ذہین انسان کند ذہن اور غبی سے بچتا ہے۔

ہوگنز ——— تمہاری یہی فتحمندی کیا کم ہے کہ تم خوبصورت ہو۔

جارج فارقویہ ۔ خوبصورت عورتیں زیادہ تبدیلی پیدا کر سکتی ہیں، کیونکہ ہم صرف استاد کی خاطر

نظریات قبول کرتے ہیں۔

شیکسپیر ـــــ عورت اپنے محبوب کی جدائی گوارا کر سکتی ہے مگر اپنے حُسن کی جدائی گوارا نہیں کر سکتی۔

ارسطو ـــــ مجھ سے مت پوچھو کہ حُسن کیا ہے؟ یہ سوال اندھوں سے پوچھو۔

شیلے ـــــ عورت کے لیے یہ باور کر لینا بڑا ہی مشکل ہے کہ وہ حُسن سے محروم ہو گئی ہے۔

نیوٹن ـــــ حُسن عورت کے لیے باعثِ فخر اور مرد کے لیے باعثِ عزّت ہے۔

کیٹس ـــــ حُسن کا بہترین حصّہ وہ ہے جسے ایک تصویر ظاہر نہیں کر سکتی۔

جارج ـــــ حُسن عورت کے لیے قدرت کا سب سے پہلا عطیہ ہے اور یہی سب سے پہلے اس سے چھین لیا جاتا ہے۔

کرامویل ـــــ عورت کا اپنے حسن پر غرور کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے پاس حُسن کے سوا اور کوئی قابلِ فخر شئے نہیں۔

ارونگ ـــــ حسین عورت کا حسن اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک اس کے دل میں محبت کے لیے راستہ پیدا نہ ہو جائے۔

ایمرسن ـــــ جس حُسن میں نزاکت نہ ہو وہ ایسے ہے جیسے نانِ بے نمک۔

لیگس ـــــ حُسن ایک جال ہے جس سے قدرت عقلوں کا شکار کرتی ہے۔

شیلر ـــــ حُسن تمام بنی نوعِ انسان کے لیے باعثِ سعادت ہے۔

چارلس ڈگلس ـ حُسن قبضہ میں آتے ہی گھٹ جاتا ہے مگر اس کی مصیبت عمر بھر ساتھ دیتی ہے۔

ٹینی سن ـــــ حُسن ایک دھوکا ہے، اس سے وہی بچ سکتا ہے جو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ ہو۔

براؤن ـــــ حسین عورت آنکھ کے لیے جنّت، دل کے لیے دوزخ اور جیب کے لیے ویرانی ہے۔

محبّت کیا ہے!

ہٹلر ـــــ محبت انسانی عظمت کے ستون کے لیے دیمک کا کام دیتی ہے۔
مسولینی ـــــ محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔
سٹالن ـــــ محبّت مرض کی طرح ہے جو اہلِ علم ارباب دانش اور بڑے لوگوں کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔
نپولین ـــــ میں اجتماعی مصلحتوں کی بنا پر اور فرد کی سعادت کے لیے محبت کو مضر سمجھتا ہوں۔
کمال اتاترک ـ محبّت ایک طلسمی چراغ ہے جو اندھیرے سے روشنی کی طرف اور روشنی سے اندھیرے کی طرف لے جا سکتا ہے۔
ڈیوک آف ونڈسر (ایڈورڈ ہشتم) ـ محبّت کی صحیح قیمت وہ ہے جو اپنی بساط سے باہر ہو۔
پولائن (نپولین کی بہن) ـــــ محبت مرد کے بس میں شاید ہو سکتی ہے مگر عورت کے بس میں نہیں ہوتی
ملکہ رضیہ ـــــ محبت پر قدرت پا لینے سے عورت گمراہ ہو جاتی ہے اور مرد فرشتہ بن جاتا ہے۔
وارن ہیسٹنگز ـــ میں نے ہمیشہ محبت سے بچنے کی کوشش کی اور ہمیشہ ہی اس گناہ کا مرتکب ہوتا رہا۔
الفونسو (شاہ سپین) ـــــ ماں اور بچے کی محبت پر میں یقین رکھتا ہوں، مگر مرد اور عورت کی محبت پہ مجھے ہمیشہ شُبہ رہا۔
گراہم بیل (ٹیلیفون کا موجد) ـــــ محبت انسانی اخلاق کی محافظ تو ہو سکتی ہے، مگر اس کی ضامن نہیں ہو سکتی۔
برٹرنڈ رسل ـــــ عورتیں مردوں سے ان کے کردار کی بنا پر محبت کرتی ہیں مگر مردوں کو

عورتوں کی شکل و صورت محبت پر مائل کرتی ہے۔

برٹرنڈرسل ـــــ یہ انسانی فطرت ہے کہ انھیں لوگوں کے ساتھ زیادہ خوشی سے محبت کی جاتی ہے، جو بہت کم اس کے طالب ہوتے ہیں۔

〃 ـــــ جنسی محبت پیدا کرنے کے نا قابل ہونا مرد یا عورت کی سب سے بڑی بد قسمتی ہے اس لیے کہ یہ اسے تمام دنیوی لذتوں سے محروم کر دیتی ہے۔

〃 ـــــ وہی محبت سچی خوشی کا ذریعہ ہے جس میں دونوں طرف سچی دلچسپی کا اظہار ہو، مشترکہ بھلائی کا خیال ہو، نہ کہ ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرنیکی خواہش

میری کوریلی ـــــ محبت کی بے چینی لطیف لہروں سے مشابہ ہے اور دل اس کا دریا ہے۔

〃 ـــــ محبت ایک ایسی دنیا ہے جس میں سکون اور اطمینان کی بجائے بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے لیکن اس بے چینی اور اضطراب میں ایسا کیف پنہاں ہے جو دنیا کے سکون و اضطراب میں نہیں۔

ٹینی سن ـــــ کسی سے محبت کرنا پھر اُسے کھو دینا مطلق محبت نہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے

شیکسپیر ـــــ محبت زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے اور سچی اور صحیح زندگی بخشتی ہے۔

〃 ـــــ سچی محبت کے راستے میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں۔

〃 ـــــ محبت صرف اس دھوکے کا نام ہے کہ ایک عورت دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔

براؤن ـــــ اوپری اور ہلکی محبت ہی ایسی ہے جو انسان اور حیوان میں فرق کرتی ہے۔

ٹالسٹائی ـــــ ذہانت پر تصور کی فتح کا نام محبت ہے۔

پال گیرالڈی ـــــ جس وقت آپ عورت سے کوئی بات چھپا کر نہ رکھیں تو محبت کا آغاز ہوتا ہے

بطلیموس ـــــ محبت میں دور تک جانے والے اس بحرِ بیکراں میں ڈوب مرتے ہیں۔

فیثا غورث ـــــ محبت کا ایک عمدہ پہلو یہ ہے کہ وہ فکر کرنے کی عادت ڈالتی ہے۔

اقلیدس ـــــ جو عمدہ گفتگو کرتا ہے وہ محبت میں دیر نہیں کرتا۔

جالینوس ـــــ محبت کی کوئی منزل نہیں۔ اس کی ابتدا اور انتہا ایک ہے۔

افلاطون ـــــ محبت مضبوط دلوں کو کمزوری کی مشق کراتی ہے۔

سقراط ـــــ دل کی بھی ہزار آنکھیں ہوتی ہیں مگر وہ محبوب کے عیبوں کو نہیں دیکھ سکتا۔

بقراط ـــــ مجھے محبت کے لفظ سے وحشت آتی ہے۔

ارسطو ـــــ انسان محبت کرتا ہے مگر دیکھ بھال کر نہیں کرتا۔

دیوجانس کلبی۔ محبت کرنے والے کو اندھوں کے ملک کا بادشاہ بنادو۔

لقمان ـــــ محبت کا ایک انداز ہوتا ہے اور محبت اپنا انداز خود پیدا کرلیتی ہے۔

سعدی ـــــ محبت ایک تلخ جام ہے مگر اس کی حلاوت صرف اہلِ دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

یوسف ابن الحسین۔ محبت کی علامت یہ ہے کہ جو چیز تجھے محبوب سے جدا کرے تو اس چیز سے جدا رہ۔

ڈکنس ـــــ محبت ایک بے پایاں سمندر ہے جس میں تیراک کے لیے ہر وقت خطرہ ہے۔

چیمبرلین ـــــ محبت ایک ایسا نشہ ہے جو دانا اور نادان کو ایک سا مسحور کرلیتا ہے۔

اعرابی پاشا ـــــ محبت ایک غایت ہے۔ محبت کی انتہا نہیں ہوتی۔

فرائڈ ـــــ محبت، عشق اور جنس کے جذبات ہمارے ذہن میں ہلچل مچائے رہتے ہیں۔

اور عقلمند لوگ اسی راستے سے اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ایمرسن ـــــ محبت زندگی کے تاریک بادلوں میں توسِ قزح کی مانند ہے۔

ہربرٹ سپنسر ـــــ محبت 'انا' کے سخت خول کو توڑ دیتی ہے۔

گلیڈسٹون ـــــ محبت انسان کے اندر ایک شریف جذبے کا نام ہے جسے نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

آسکر وائلڈ ـــــ سچی محبت ہمیشہ دلوں کو جوڑ دیا کرتی ہے۔

ٹامس ڈیوال ـــــ محبت جذبات کا ایک گہرا سمندر ہے جو چاروں طرف سے اخراجات سے گھرا ہوا ہے۔

جوش بلنگز ـــــ کہتے ہیں محبت اندھی ہے مگر میں نے محبت کرنے والوں میں ایسے بھی دیکھے ہیں جو اپنے محبوب کو ہر زاویۂ نگاہ سے مجھ سے بدرجہا بہتر دیکھ سکتے ہیں۔

جوش بلنگز ــــ محبت چیچک کی مانند ہے کہ ہم زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس کی زد میں آتے ہیں اور جیسے جیسے عمر پختہ ہو جائے طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے۔

برنارڈ شا ــــ مرد اگر سوچ سکیں تو یہ ایک عمدہ صفت ہے مگر محبت کرنا ناگزیر ہے۔

رابرٹ ڈبلیو چیمبرز۔ محبت کرنے والے سے تمام لوگ محبت نہیں کرتے البتہ اس کی نگرانی ضرور کرتے ہیں۔

ہروان بن ٹراپ۔ بعض لوگوں کو صرف چاہِ زنخدان تک محبت ہوتی ہے مگر غلطی سے تمام لڑکی سے محبت کر لیتے ہیں۔

شیلے ــــ عقلمند اور بے وقوف دونوں محبت میں گرفتار ہو جائیں تو ان دونوں میں فرق نہیں رہتا۔

" ــــ محبت کی چند ساعتیں بے محبت زندگی کے سو برس سے بہتر ہے۔

ورڈز ورتھ ــــ محبت ایک ایسی خوشبو ہے جس کی آغوش میں تمام پھول چھپے ہیں۔

گولڈ سمتھ ــــ محبت ایک قسم کا حیاتیاتی تعاون ہے جس میں ایک کے جذبات دوسرے کے جبلی اغراض کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

لانگ فیلو ــــ سچی محبت ذہن کی وہ آگ ہے جو اس میں ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ کبھی بیمار نہیں ہوتی، نہ کبھی مرتی ہے اور نہ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ نہ اپنے آپ سے منحرف ہوتی ہے۔

جارج سٹیفنس۔ تھوڑی فرقت محبت کو بڑھاتی ہے اور حد سے زیادہ فراق محبت کو قتل کر دیتا ہے۔

ہنڈن برگ ــ محبت کی قدر اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کی تمام بہترین اور مسرت انگیز چیزوں کا لطف اس کے طفیل دوبالا ہو جاتا ہے۔

رابرٹ براؤننگ۔ خدا کی ذلیل سے ذلیل مخلوق فخر کر سکتی ہے کہ اس کی روح کے دو رُخ ہیں ایک رُخ سے وہ دنیا کا سامنا کرتا ہے اور دوسرا رُخ وہ عورت کو دکھاتا ہے جب وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

پیش لفظ

انسانی فکر و عمل سے یہ بعید نہیں کہ وہ تمام دنیا فتح کرلے، پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے، سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غواصی کرے۔ انسان کے لیے یہ بھی مشکل نہیں کہ وہ ہواؤں کو تسخیر کرلے اور ان کے دوش پر سواری کرے، سورج، سیاروں اور ستاروں کے سربستہ رازوں کا سراغ نکال لے۔ غرض کائنات کی کوئی شے اور کوئی بھید اس کی جسمانی یا ذہنی دسترس سے باہر نہیں ——— سکندر اور نپولین نے دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا، ہلیری اور تن سنگھ نے دنیا کی بلند ترین اور ناقابلِ تسخیر چوٹی کو سر کرکے رکھ دیا۔ اُولو العزم انسانوں نے مصنوعی سیاروں کی تخلیق سے مافوق الفطرت قوتوں کے وجود اور عدم وجود کے متعلق پھر سے غور کرنے کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ افلاطون، ارسطو، اقلیدس، سقراط، فیثا غورث اور سولن جیسے قدیم فاتحین علم کے کارنامے دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ انھیں عظیم ہستیوں کے فکر و نظر کے طفیل دورِ حاضر کے انسان نے نسلِ انسانی کی مزید فتح و کامرانی کی راہیں استوار کیں اور غور و فکر کے لیے ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ اس کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

انسانی جسم اور ذہن کی فتح مندیوں کی یہ داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنا انسان۔ آدمی میں کام کرنے کا رجحان فطری ہے اور ہر شخص کی جبلت میں داخل ہے۔ جذبات اس جبلت کو عمل پیرا کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ یہی جذبات ہماری زندگی کے مختلف شعبوں پر مسلّط ہیں۔ اُٹھے دن کی لڑائیوں، حادثوں، انقلابات، انکشافات اور ایجادات میں ہمارے جذبات کو بڑا دخل ہے۔ یہی جذبات ملکوں کی تسخیر عمل میں لاتے ہیں اور انھیں سے دلوں کی فتح ظہور میں آتی ہے۔

محبت بھی انسان کے اندر ایک شریف جذبے[1] کا نام ہے جو ہر شخص کی جبلت میں داخل ہے۔ اس میں ادنیٰ و اعلیٰ یا بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں۔ بادشاہ، غلام، ملکہ، کنیز، جرنیل،

---

[1] گلیڈسٹون کے قول کے مطابق "اگر اس جذبے کو نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہیں رہتا۔"

سیاست دان، مفکر، عالم، شاعر، صوفی، فلسفی، پیغمبر، دانا یا نادان غرض کوئی بھی ہو، جبلّی طور پر سب ایک ہیں۔ محبت کے جذبات ہر دل میں ودیعت کیے گئے ہیں اور کسی خارجی چیز یا واقعہ سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ ان جذبات کی شدت ہماری جملہ سرگرمیوں پر بھی اثر ڈالتی ہے، ہماری سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں یہاں تک کہ ٹالسٹائی کے الفاظ میں "ہماری ذہانت پر تصور فتح پالیتا ہے" ——— تاہم ہر انسان اپنی طاقت کے مطابق ان اثرات سے عہدہ برآ ہوتا ہے، ہر شخص اپنے وقوف، اپنی ذہنی استعداد، اپنے ماحول، اپنے تدبر اور اپنے اختیار کے بموجب اس جبلّت کو عمل پیرا ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور اپنا کردار وضع کر سکتا ہے۔

اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے اور دنیا کی مختلف قوموں میں مرد عورت کے معاشقوں کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔ ایسے رومانوں کی بھی کمی نہیں جو دنیا کی نامور ہستیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اور یہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ ان ہستیوں میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ، فاتح، جرنیل، بیگمات، سیاستدان، فلاسفر، مفکر اور ایسے لوگ شامل ہیں جن سے پوری قوم یا پورے ملک کی قسمت وابستہ تھی، جن پر ملک اور قوم کی اچھائی اور برائی کا دارومدار تھا، جن پر نسل انسانی کی فلاح و بہبود اور تہذیبی و تمدنی ترقی کی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، جنھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے باوصف دنیا کو نت نئی ایجادوں، دریافتوں، علوم و فنون یا فلسفوں سے آگاہی بخشی تھی۔ تحقیق کے بعد ان عظیم انسانوں میں بہت کم ایسے نظر آئیں گے جنھیں محبت کے دیوتا کی سحر انگیزیوں سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اور اپنی عظمت اور مصروفیت کے باوصف رومان پرورو ادیوں سے آنکھیں بند کیے گزر گئے ہوں۔ اس لیے کہ وہ بھی حساس دل رکھتے تھے اور تمام دوسرے انسانوں کی طرح ان کے دل بھی قدرت کے ودیعت کردہ جذبات محبت سے معمور تھے۔ ان کی یہ محبت اپنے ملک یا اپنی قوم کے لیے تھی۔ ساری دنیا یا جملہ بنی نوع انسان کے لیے تھی۔ علم و فضل اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لیے تھی۔ ذہنی یا جسمانی فتح و کامرانی کے لیے تھی یا انفرادی طور پر ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان کے لیے تھی۔

یہ تسلیم کر لینے میں کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جب کوئی فرد کسی رومانی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے تو

اس کی تمام دوسری سرگرمیوں پر اس کا اثر پڑنے لگ جاتا ہے۔ اس حادثے کی ناکامی یا کامیابی آسے کارگاہِ دنیا میں اپنے اصل مسلک سے ہٹا بھی سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اور زیادہ گرمِ عمل ہو جائے۔ چنانچہ بڑے لوگوں کی زندگی میں جہاں کہیں ایسے حادثات رونما ہوئے وہاں اکثر ایسے ہی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ رومانی واقعات نے جہاں انفرادی طور پر فرد کی زندگی کو متاثر کیا وہاں اس فرد کا حلقہ اثر و اختیار بھی اس کی زد میں آ گیا۔

مشاہیر کے حالات پر کتابوں کی کمی نہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ سوانح نگاروں نے شاید کی نجی، ازدواجی یا رومانی زندگی کی تفصیلات میں جانے سے پہلوتہی کی ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ مان لینا چاہیے کہ کسی شخص کی زندگی اور اس کے کردار کا صحیح اور واضح نقشہ اسی صورت میں سامنے آسکتا ہے کہ اس کے ان نجی واقعات کو ڈھکا چھپا نہ رکھا جائے جو ذاتی سہی مگر وہ اجتماعی مصالح پر اثر انداز ہوتے ہوں۔

مشاہیر کی تاریخی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کے رومانی کردار سے بھی باخبر رہنا اس لیے ضروری ہے کہ بعض رومانوں کو قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال میں بھی بڑا دخل رہا ہے پھر یہ کہ ان کی رومانی زندگی کے پس منظر میں ہم ان کی سیرت اور کردار کے اچھے بُرے پہلوؤں کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح تاریخ کا مطالعہ زیادہ بہتر انداز سے کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً مارک انٹنی جیسا بہادر اور جابر رومن جرنیل جس کی مٹھی میں نصف دنیا تھی، دنیا کی حسین ترین ملکہ کلوپیٹرا کی محبّت میں گرفتار ہونے پر اپنے مسلک سے ایسا غافل ہوا کہ اہلِ ملک کے جھنجھوڑنے پر بھی غفلت سے بیدار نہ ہوا۔ نتیجہ میں اگسٹس نے روما کی کایا ہی پلٹ دی۔ اس نے جمہوریت کی بنیادیں اکھاڑ دیں اور خود شہنشاہ بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ انٹنی کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا ——— روما کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ایک عام قاری، طالب علم، مؤرخ اور محقق کے لیے انٹنی اور کلوپیٹرا کے اس رومان سے پوری آگاہی بہت ضروری ہے اس لیے کہ یہی رومان سلطنت روما کی تاریخ کا نیا باب اُلٹنے کا موجب تھا۔

اسی کے برعکس کمال اتاترک کی محبوبہ لطیفہ خانم نے انھیں سمرنا میں بلا کر شادی کے لیے کہا تو انتہائی عشق کے باوجود کمال نے اُسے ملکی اور سیاسی مصلحت کے خلاف قرار دیا اور کہا کہ ملک کو

مکمل طور پر آزاد کرانے کے بعد ہی وہ اس طرف توجہ کر سکیں گے۔ حریت کا جذبہ محبت پر غالب رہا۔ ــــــ اگلے ہی دن ترکی کا ہیرو بروسہ کے میدانِ جنگ میں کھڑا تھا۔ کامل ایک ماہ کے بعد جب ترکی مکمل طور پر آزاد ہو گیا تو اتاترک سمرنا آئے اور شادی کا وعدہ پورا کیا۔

طیطوس رومی جیسا ظالم اور جابر شہنشاہ جس نے ظلم و ستم میں نیرو کو بھی مات کر دیا تھا، اس کے رومان کا مطالعہ کرنے پر اس کے گھناؤنے اور تاریک کردار میں اونچے اخلاق کی ایک اعلیٰ اور تابندہ مثال بھی درخشاں نظر آتی ہے۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اپنی اس محبوبہ کو جسے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرتا تھا، ان الفاظ کے ساتھ ملک سے رخصت کیا کہ "اگر میں محبت کے سامنے اسی طرح سرِ تسلیم خم کرتا رہا تو ملکی فرائض سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا"۔ محبوبہ کے جانے کے بعد وہ عمر بھر اس کے فراق میں روتا رہا، مگر اُسے واپس نہ بلایا۔ سیاسی حالات کی مجبوری کے علاوہ وہ اپنی بیوی کی دل آزاری بھی نہ کرنا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ "یہ اچھے حکمرانوں کا کام نہیں"۔

مشہور اشتراکی لیڈر لینن نے اپنی محبوبہ لیولا سے صاف صاف کہہ دیا میں انقلابی آدمی ہوں تم میرے لیے اپنی زندگی خراب نہ کرو اور وطن جا کر کسی سے شادی کر لو۔ چنانچہ خود اسے گاڑی میں سوار کرا کے روس سے رخصت کیا۔ لینن کے دل سے اس کی یاد کبھی نہ گئی مگر وہ محبت کو سیاست پر قربان کر دینے کا قائل تھا۔

ایوبراؤن ہٹلر کی سیکرٹری تھی اور زیادہ خوبصورت نہ تھی مگر ہٹلر کے لیے اس میں یہ کشش تھی کہ وہ انتھک کام کرنے والی تھی۔ بہادری اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ جب روسیوں نے برلن کا محاصرہ کر لیا تو اس نے ہٹلر کو بھاگنے کی بجائے خودکشی کا مشورہ دیا، اور خود اس سے پہلے یہ کہتے ہوئے خودکشی کر لی کہ ذلت کی موت سے اس طرح مرنا بہتر ہے۔

حمیدہ بیگم کی جرأت، دلیری اور بہادری ہی نے تیمور کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

غرض ان لوگوں کے رومانی واقعات کو اگر ذہنی تلذذ سے ہٹ کر تاریخی اور اخلاقی عینک سے دیکھا جائے تو ان رومانوں کی مجلسی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی اہمیت اور قدر معلوم ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پیش کی جا رہی ہے جس میں موضوع

کے اعتبار اور قارئین کی دلچسپی کے خیال سے ادبی اور رومانی چاشنی بھی ملے گی اور تاریخی حقائق کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد دنیا کی مختلف تحریکات، سیاسی انقلابات، حکومتوں کے عروج و زوال، جنگوں کے اسباب، انسانی کمزوریوں، اخلاقی اور روحانی عظمتوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ہر واقعہ سے کوئی نہ کوئی ایسا سبق آموز اور اخلاقی نتیجہ سامنے آجاتا ہے جو ہر تعمیری فکر و نظر رکھنے والے قاری کے لیے علمی اور اخلاقی استفادے کا سامان مہیا کرتا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں مجھے کئی کتابیں کھنگالنی پڑیں۔ پھر بھی یہ دقت باقی رہی کہ جن مستند واقعات کی تلاش تھی ان کی تفصیلات بہت کم مل سکیں، چنانچہ زیادہ مختصر رومانوں کو "تاریخ کے مختصر رومان" کے عنوان سے کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے اور صرف اسی قدر واقعات بیان کیے ہیں جن کی شہادت تاریخوں میں ملتی ہے۔

جن کتابوں نے مواد کی فراہمی میں مجھے مدد دی ان کے ناموں کی فہرست بھی کتاب میں دے دی گئی ہے اور جن کتابوں میں سے اقتباس کیا گیا ہے ان کتابوں کے نام یا مصنف کے نام سے وہیں حوالے دے دیے گئے ہیں۔

قارئین کو شاید یہ بات کھٹکے کہ جن مشاہیر کی رومانی داستانوں پر ہمارے ہاں ضخیم ناول موجود ہیں ان کا ذکر اس کتاب میں نہیں یا اس طرح کے واقعات درج نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دُور از حقائق باتیں لکھ کر قارئین کا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

[signature]

لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۵۹ء

(پہلا باب)

ڈکٹیٹر — جمہوری صدر اور حاکم

۱۔ ہٹلر کے رومان

۲۔ مسولینی کے رومان

۳۔ سٹالن کے رومان

۴۔ کمال اتاترک اور لطیفہ خانم

۵۔ وارن ہیسٹنگز کا رومان

۶۔ نیلسن کا رومان

۷۔ رابرٹ کلایو کا رومان

ہٹلر کے رومان

ہٹلر کی محبوبہ ایوابراؤن کا سادہ لباس اور ہٹلر کی وردی جل چکی تھی اگر ان کی لاشیں اب بھی پہچانی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ انھیں ٹھکانے لگادیا گیا تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگیں

ناقابلِ فراموش جرمنی کے مشہور شہر میونخ میں ایک خوبصورت مکان کے آراستہ کمرے میں ایک چالیس سالہ مرد آرام کرسی پر دراز تھا۔ صحت مند اور گٹھیلا جسم، آنکھوں اور چہرے میں ایک مخصوص کشش تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی گہرے فکر میں مبتلا ہے۔ اچانک آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ کمرے میں دو چار چکر لگانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کردیا، پھر آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بدستور بہہ رہے تھے جو اس کے کسی اندرونی غم کی نشاندہی کرتے تھے۔ وہ پھر اٹھا اور سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر پر نظریں جمائے دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جیب سے رومال نکالا اور اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ دیوار سے تصویر اُتاری، اور سامنے میز پر رکھ کر خاصی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اب اسے دوبارہ آنسو پونچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ رومال کی بجائے ہاتھوں سے انھیں صاف کرنے لگا ——— یہ جرمنی کا مشہور و معروف ڈکٹیٹر تھا ——— ہٹلر ——— جس نے اپنے زمانہ میں ساری دنیا سے جرمنی کا لوہا منوایا اور گنتی کے چند سالوں میں کئی بڑی سلطنتوں کو تاراج کرکے رکھ دیا۔ آج وہ اپنی محبوبہ کے غم میں خون کے آنسو رو رہا تھا اور اس کی تصویر آج اس کی نظروں کے سامنے تھی۔

ہٹلر کی محبوبہ دلنواز کا نام گریٹ رابل تھا، جو رشتہ میں اس کی بھانجی تھی وہ اُسے پیار سے گیلی کہا کرتا تھا۔ گیلی پہلی لڑکی ہے جس نے ہٹلر کے دل کو اپنی محبت کی آماجگاہ بنایا اور اس کی صبح جوانی کو منور کیا۔ گیلی بھی ہٹلر کو دل و جان سے چاہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنا ناممکن خیال کرتے تھے۔ مگر آج طویل مدت کے بعد میونخ آنے پر ہٹلر کو پتہ چلا

کہ گیلی اسے چھوڑ کر دوسری دنیا میں جا چکی ہے۔

یادِ ایام ہٹلر کو وہ دن یاد آ گئے، جب وہ اپنے باپ کی وفات پر کفالت کا کوئی سہارا نہ ملنے کے باعث ویانا[1] چلا آیا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہاں غریب اور نادار طالب علموں کو وظیفہ ملتا ہے، مگر کوششوں کے باوجود ہٹلر کو نہ وظیفہ ملا اور نہ ہی اُسے یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ اس مایوسی کے بعد ہٹلر کے لیے اس شہر میں کوئی کشش باقی نہ رہی، تاہم وہ پیٹ بھرنے کے لیے محنت مزدوری کرنے لگا۔ ایک معمار نے اس پر ترس کھا کر اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ اب دیواروں پر پالش کرنا، فرش بنانا اور چھتوں کی مرمت کرنا اس کا کام تھا۔ دس بارہ سال اس طرح گزرے بالآخر تنگ آکر یہ شہر چھوڑا اور میونخ[2] چلا آیا۔ آخر ۱۹۱۴ء کا وہ دن آیا جو دنیا کے لیے تباہی اور بربادی کا دن تھا۔ ہٹلر بویریا کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اعلیٰ جنگی کارناموں کی بدولت کارپورل بنا دیا گیا۔ جنگ کے خاتمہ پر فوج سے برخاست کر دیا گیا اور پریشانی کے دن بسر ہونے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں قومی اشتراکی جماعت کا ممبر بنا۔ اس کے بعد ملک کے سیاسی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔

انجامِ جفا یہی زمانہ تھا جس میں ہٹلر نے محبت کا کھیل کھیلا۔ جب کبھی سیاسی معاملات سے فرصت پاتا۔ وہ گیلی کو ساتھ لے کر ندی پر چلا جاتا۔ وہ پہروں وہاں سیر کرتے، حسن و عشق کی نئی دنیا آباد کرتے، اور کیف و مستی میں ڈوب کر محبت کے راگ الاپتے۔ ایک عرصہ تک یہ رنگین صحبتیں قائم رہیں۔ گیلی ہٹلر سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کے بغیر اداس رہتی تھی۔

اس دوران میں ہٹلر کو وی آنا جانا پڑا اور وہ وہاں سیاسی معاملات میں ایسا الجھ گیا کہ گیلی کا خیال تک نہ رہا۔ گیلی سے یہ طویل جدائی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے ایک روز ندی میں کود کر جان دے دی ——— آج میونخ واپس آنے پر ہٹلر اسی کا سوگ منا رہا

---

[1] آسٹریا کا مشہور شہر جو دریائے ڈینیوب کی شاخ کے کنارے واقع ہے۔ یہاں مشہور یونیورسٹی ہے۔ آبادی ۱۸ لاکھ کے قریب ہے۔

[2] جنوبی جرمنی میں دریائے اسر (ISAR) کے کنارے مشہور تجارتی شہر۔ سائنسی سامان اور مشینری کے لیے مشہور ہے۔ یہاں ایک اہم یونیورسٹی بھی ہے۔ آبادی ساڑھے سات لاکھ سے زائد ہے۔

تھا۔ اُسے اپنی پارٹی کے اجلاس میں شریک ہونا تھا مگر اُس نے اپنے ساتھیوں کو کہلا بھیجا کہ وہ نہیں آسکتا ــــــ

گیلی کی موت سے ہٹلر کو زبردست صدمہ پہنچا اور اس کا اثر اس کے دل پر کئی دن تک رہا، چنانچہ اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی مدھم پڑ گئیں۔ گیلی کے غم نے اس کے مزاج اور طبیعت کو بھی بدل دیا، وہ ذرا ذرا سی بات پر غصہ میں آجاتا۔ اس کے کلام میں سختی اور درشتی پیدا ہوگئی تھی

گیلی کی موت سے چار سال قبل ہٹلر جیل سے[1] رہا ہوکر آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نازی جماعت کی حالت بہت کمزور ہوچکی تھی اور ہٹلر کو پارٹی کی کمزوری کی بنا پر ہی رہا کیا گیا تھا ــــ پارٹی کی حالت ۱۹۲۹ء تک نہایت کمزور رہی پھر عالمگیر کساد بازاری کے دور میں پارٹی کو دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ اب نازی تنظیم جرمنی میں سب سے برتر تھی۔ میونخ میں بہترین عمارت میں ان کا دفتر تھا اور نیم مسلح رضاکاروں کی فوج بھی پاس تھی۔ پارٹی کو روز بروز عوام کی تائید حاصل ہوتی جارہی تھی اور ہٹلر قوم کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

گیلی کی موت کا صدمہ ہٹلر کے دل سے محو ہوچکا تھا، وہ سیاسی معاملات میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ وہ اتنا وقت ہی نہ نکال سکتا تھا کہ گیلی کے سانحہ کی تجدید کرے۔ اگرچہ اس کی عمر پچاس کے قریب ہوچکی تھی مگر ابھی تک اس نے شادی نہ کی تھی اور ایسا کرنے کا خیال بھی نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ بعض مصنفوں نے اس کے متعلق لکھا کہ "وہ کسی فطری کمزوری کی وجہ سے غیر شادی شدہ نہیں بلکہ حب الوطنی نے اس کے دل میں کسی عورت کی محبت کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی، اور وہ عورتوں کے قرب سے گریز کرتا تھا"۔ یہ حقیقت ہے کہ ہٹلر کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی اور وہ ملک کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو محبت کے جھگڑوں میں اُلجھانا گوارا نہ کرسکتا تھا اور اسی بنا پر اس نے مستقل شادی کے متعلق بھی کبھی نہ سوچا مگر بالآخر انسان تھا۔ اس کے پہلو میں بھی دل تھا۔ وہ عورت سے نفرت

---

[1] جب نازیوں نے "فوجی مداخلے" کی تیاریاں شروع کیں تو حکومت کی فوج نے انھیں اقدام سے قبل ہی میونخ میں روک دیا۔ کچھ لیڈر گرفتار ہوئے کچھ بھاگ نکلے۔ ہٹلر کا وفادار رفیق گورنگ بری طرح زخمی ہوا مگر بھاگ نکلا۔ ہٹلر گرفتار ہوگیا اور اس پر مقدمہ چلا۔ پانچ سال کی سزا ہوئی مگر چند ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔

نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کے دل میں عورت کے لیے جگہ ضرور تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ دیتا تھا۔ اس کی نجی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے گیلی کے علاوہ کئی دوسری عورتوں میں بھی دلچسپی لی، مگر ایسے پُراسرار طریقے سے کہ دنیا والے اس کی ان سرگرمیوں سے پُوری طرح باخبر نہ ہو سکتے تھے۔

نیا رومان گیلی کے بعد اس نے ایک دوسرے رومان کی طرح ڈالی۔ اس رومان کی ہیروئن ایک تھیٹریکل کمپنی کی حسین اداکارہ رے نیٹ تھی۔ اگرچہ اس ضمن میں بظاہر ہٹلر کی کسی طویل اور رومانی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا، مگر رے نیٹ کو حاصل کرنے کے لیے ہٹلر نے جو پوشیدہ چال چلی اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہٹلر اس اداکارہ کو حاصل کرنے کے لیے کتنا بے تاب ہو گیا تھا، اور اس سلسلے میں وہ عوام تو کیا اپنے جرنیلوں تک سے کوئی بات سُننی پسند نہ کرتا تھا۔

حُسن کا جادو رے نیٹ جس تھیٹریکل کمپنی میں ملازم تھی وہ میونچ میں اپنے تماشے دکھا رہی تھی۔ ہٹلر اپنے چند جرنیلوں کے ہمراہ جن میں اس کا مشہور و معروف جرنیل اور دستِ راست جنرل گوئرنگ بھی شامل تھا۔ تماشا دیکھنے آیا ہوا تھا۔ کھیل کے دوران رے نیٹ سٹیج پر آئی۔ اس کا حُسن دیکھ کر سارے تماشائی دنگ رہ گئے۔ وہ نیم عُریاں لباس میں سٹیج پر آ کر ناچنے لگی۔ ہٹلر سٹیج کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ بھی اس حسینہ کے حُسن و شباب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور دل پکڑ کر رہ گیا۔ کھیل کے دوران میں آخر دم تک ہٹلر پر ایک بے خودی کا عالم طاری رہا۔ جنرل گوئرنگ اور دوسرے جرنیل بھی ہٹلر کی یہ کیفیت بھانپ گئے تھے ؂

بجا کہ میرا شبستاں دھواں دھواں ہے مگر
میں تیرے حُسنِ فروزاں کا خوشناس بھی ہوں!

کچھ دنوں بعد ہٹلر کے ایما پر جنرل گوئرنگ نے ضیافت کا اہتمام کیا اور رے نیٹ کو بھی اس میں مدعو کیا۔ رے نیٹ آئی۔ گوئرنگ نے ہٹلر سے اس کا تعارف کرایا، اور آئندہ ملاقات کے راستے کھل گئے۔ ہٹلر اور رے نیٹ آپس میں ملتے رہے۔ مگر ان ملاقات کے دوران میں کیا کچھ ہوا یہ کوئی نہیں جانتا۔

مزاجِ یار تھوڑے ہی دنوں بعد ہٹلر کے کانوں میں یہ خبر پہنچی کہ رے نیٹ کسی یہودی نوجوان

سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ تعلق قائم کر چکی ہے۔ ہٹلر کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ وہ جرمنی کا بڑا آدمی تھا، ملک کے سیاہ وسفید کا مالک بننے والا تھا۔ وہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا کہ جس عورت کو وہ اپنے تصرف میں لائے وہ کسی دوسرے شخص سے بھی مروت برتے۔ گورنگ کو بھی رے نیٹ کا یہ طرزِ عمل سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ اُس نے اُسے سمجھایا کہ وہ یہودی سے قطع تعلق کر لے۔ جب دیکھا کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں تو گورنگ نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اس نے یہودی کو نہ چھوڑا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

رے نیٹ اس دھمکی سے گھبرا گئی۔ وہ یہودی کو تو نہ چھوڑ سکی مگر جرمنی چھوڑ گئی اور کسی دوسری جگہ جا کر اپنی پسند کے نوجوان سے شادی کر لی۔

فراق کا صدمہ اگرچہ رے نیٹ کو ہٹلر سے کوئی قلبی محبت نہ تھی بلکہ وہ محض اس کے اقتدار کے سامنے جھکنے پر مجبور تھی مگر ہٹلر اس کے ساتھ دل سے محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنے ان تاثرات کا اظہار صرف جنرل گورنگ پر کیا۔ چنانچہ رے نیٹ کے چلے جانے کے بعد ہٹلر نے گورنگ سے مشورہ کیا کہ اب کیا ہونا چاہیے۔ گورنگ نے اُسے سمجھایا کہ وہ رے نیٹ کا خیال دل سے نکال دے، اس لیے کہ وہ ایک ادنیٰ درجہ کی عورت ہے اور ہٹلر کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے لوگوں میں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو مگر ہٹلر نہ مانا۔

گورنگ کی تدبیر بالآخر گورنگ نے یہ تدبیر نکالی کہ اُسی تھیٹریکل کمپنی کے ذریعہ رے نیٹ کو نوٹس بھجوایا کہ وہ جرمنی واپس آ کر اپنا معاہدہ پورا کرے ورنہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

رے نیٹ نے کمپنی کے ساتھ جو معاہدہ کر رکھا تھا اس کے تحت وہ جرمنی میں رہ کر کمپنی کا کام کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ یہ نوٹس ملتے ہی وہ میونخ پہنچی اور اپنے معاہدہ کے مطابق کمپنی میں دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا۔

بے گناہ قتل رے نیٹ نے ابتدا میں ہٹلر کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھی اور اگر وہ کچھ مدت تک اس کا ساتھ دیتی تو شاید یہ تعلقات مستقل صورت اختیار کر لیتے مگر یہودی کے ساتھ عشق کرنے اور

جرمنی سے فرار ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہٹلر کے دل میں اس کے خلاف کدورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اب جبکہ بہلانے سے اُسے واپس میونخ بلایا گیا تھا اُسے اپنی اس حرکت کی سزا بھگتنا تھی۔ ہٹلر کے دل میں انتقام کی آگ سلگ اٹھی۔ نہیں کہا جا سکتا ہٹلر نے اس کے ساتھ کیا کچھ کیا اس لیے کہ جو کچھ ہوا وہ سب ابھی تک پردۂ راز میں ہے۔ البتہ کچھ دنوں بعد سننے میں آیا کہ رسے نیٹ نے میونخ میں خودکشی کر لی ہے۔ اس طرح ہٹلر کا یہ دوسرا رومان بھی پہلے رومان کی طرح محبوبہ کی خودکشی پر منتج ہوا ؎

جلاؤ خونِ شہیداں سے ارتقاء کے چراغ
یہ رسم چلتی رہی ہے، یہ رسم اب بھی چلے! (عارف)

یہودیوں سے نفرت

ایک وہ زمانہ تھا جب ہٹلر وی آنا کی سڑکوں پر محنت مزدوری کی تلاش میں پھرا کرتا تھا۔ پھر بویریا کی فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد کارپورل بنا۔ پھر وہ وقت آیا جب ساری جرمنی کی راگ ڈور ہاتھ میں آ گئی ۔۔۔ ۱۹۳۵ء میں ملک کا صدر بنا یا گیا اور جرمنی کا اقتدارِ اعلیٰ اس کے ہاتھ میں آگیا اور اس نے اپنی ڈکٹیٹر شاہی کا اعلان کر دیا۔ پھر ملک کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے اس نے جو اقدامات کیے ان میں اقتصادی حالت کی بحالی کے سلسلہ میں یہودی قوم پر کلہاڑا چلایا۔

جرمنی میں ناجائز نفع اندوزی اور بے دریغ سرمایہ جمع کرنے والوں میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سامی نسل سے تعلق رکھنے کے باعث یہودیوں میں حبّ الوطنی کے جذبات بھی کم ہوتے ہیں، اس لیے جرمنی کے لوگوں نے سب سے پہلے یہودیوں ہی کے خلاف آواز اٹھائی۔ پھر تواریخی اور مذہبی روایات کی بنا پر بھی یہودیوں اور عیسائیوں میں مدت سے مخالفت چلی آتی ہے اس لیے ملکی مفادات کے علاوہ مذہبی اختلاف کو بھی یہودیوں کے خلاف بنیاد بنا لیا گیا۔ دونوں قوموں کے درمیان یہ مناقشات عرصہ سے چلے آتے تھے۔ ہٹلر نے برسرِ اقتدار آنے پر انھیں ابھاری اور یہودیوں کو جرمن قوم کی آتشِ انتقام کا ایندھن بنا دیا اور جرمنوں نے یہودیوں کا مسئلہ کھڑا کر کے اپنا غصہ اُتارنا شروع کر دیا۔ یہودیوں کی مخالفت قومی تحریک کا لازمی جزو بن گئی اور یہودیوں سے نفرت کرنا جرمنی سے محبت کرنے کے ثبوت میں پیش کیا

جانے لگا۔ جب ملک کی باگ ڈور پوری طرح ہٹلر کے ہاتھ میں آگئی اور وہ جرمنی کا ڈکٹیٹر بن گیا تو اس نے اس مخالفت کو اور بھڑکایا جس نے بعد ازاں جرمنی سے یہودیوں کے اخراج کی صورت اختیار کر لی۔

یہودی لڑکی سے محبت

ان حالات میں جبکہ یہودیوں سے نفرت کرنا جرمنی سے محبت کرنے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا تھا، ظاہر ہے یہودیوں سے محبت کرنے والے کو ملک دشمن سمجھا جاتا تھا۔ اور اس وجہ سے کسی یہودی مرد یا عورت کے معاملے میں کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار مستحسن خیال نہ کیا جاتا تھا مگر اتفاق دیکھیے کہ اس مخالفت کا علمبردار یعنی خود ہٹلر ایک یہودی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا اور اس کی محبت میں سب کچھ کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

تشہیر محبت

"لینی" ایک یہودی لڑکی تھی، حُسن و جمال میں بے مثل اور یگانہ۔ وہ بوریا[1] کی رہنے والی تھی۔ کسی موقعہ پر ہٹلر کی نظر اس پر پڑی۔ پہلی نگاہ میں ہی وہ اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ پھر تعلقات قائم ہوئے اور اتنے بڑھے کہ "لینی" گمنامی سے نکل کر شہرت کی دنیا میں جا پہنچی۔ یہودیوں کے خلاف دشمنی کی عام وبا میں ہٹلر کا ایک یہودی لڑکی سے عشق کرنا ایسا ادنیٰ مسئلہ نہ تھا جسے لوگ آسانی سے نظر انداز کر دیتے۔ انگلیاں اٹھیں، لب ہلے، ملک کے طول و عرض میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہٹلر کی قوت اور ہر دلعزیزی کے سامنے کسی کو کھل کر بات کہنے کی جرأت نہ تھی مگر ہر شخص ہٹلر کے اس فعل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔

محبت اور سیاست

ہٹلر اور لینی کی ابتدائی ملاقاتیں اور تعلقات لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے وہ چھپ کر ملا کرتے تھے مگر یہ طریق کار زیادہ مدت تک اختیار نہ کیا جا سکا اور دونوں کھلم کھلا ملنے لگے۔ یہودیوں نے جرمنی کے ڈکٹیٹر اور یہودی لڑکی کے اس باہمی تعلق سے بعض سیاسی فائدے اٹھانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ مگر اہل جرمنی اور ہٹلر کے خاص رفقاء کو بھی اس امر کا پورا احساس تھا کہ اس کی آڑ میں یہودی فائدہ اٹھا سکتے ہیں چنانچہ جنرل گوئرنگ نے پہل کی اور اس مسئلے پر ہٹلر کو ٹوکا:

---

[1] جرمنی کی سرزمین کا ایک علاقہ۔ میونچ اسی علاقے کا صدر مقام ہے۔ بوریا کا رقبہ ۲۷،۱۱۲ مربع میل اور آبادی ۴۳ ۹ لاکھ کے قریب ہے۔

"فیوہرر! اس لڑکی کا مسئلہ لوگوں میں موضوعِ بحث بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے آپ اس سے قطع تعلق ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔" گوئرنگ نے کہا

ہٹلر کے ماتھے پر بل پڑ گئے وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ "جنرل! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا محض تعلقات ہیں۔ انھیں لوگ خواہ مخواہ موضوع بناتے ہیں"۔

"فیوہرر! ہم نے خود ہی یہودیوں کے خلاف تحریک کو فروغ دیا ہے۔ پھر جرمنی کے مالک کا کسی یہودی لڑکی پر مہربان ہونا عام لوگوں کے لیے باعثِ تعجب نہ ہو تو کیا ہو؟" گوئرنگ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

ہٹلر نے گردن اٹھائی، اور کڑک کر بولا "گوئرنگ! لوگوں کو ہمارے ذاتی اور نجی معاملات میں مخل ہونے کا کوئی حق نہیں ہم طے کر چکے ہیں کہ اس لڑکی سے شادی نہیں کریں گے، مگر ہماری محبت پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے!!" ہٹلر نے استفسارانہ نگاہیں گوئرنگ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"نہیں فیوہرر! آپ کے اعلان کا سوال ہی نہیں۔ جب آپ اس سے شادی نہیں کر رہے اور محض دلی لگاؤ ہے تو میرے خیال میں اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مگر خیال ہے کہ وہ لڑکی جرمنی کے دشمنوں (یہودیوں) کا آلہ کار بن کر کوئی غلط کام نہ کر بیٹھے۔" گوئرنگ نے تحمل سے جواب دیا۔

"ہماری محبت سے ملکی معاملات کو کوئی سروکار نہیں۔ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں، اور اسے چھوڑ نہیں سکتا۔" ہٹلر نے دھیمی آواز میں کہا اور ٹہلنے لگا۔ پھر رک کر دوبارہ گوئرنگ سے مخاطب ہوا:

"گوئرنگ! تم جانتے ہو کہ یہودی مجھ سے سخت نفرت کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بھی ان سے نفرت کرتا ہوں اور انھیں جرمنی کا دشمن سمجھتا ہوں۔ میری نفرت اپنی جگہ اٹل ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آ سکتا خواہ میں للیتی کے علاوہ اس جیسی ہزار دوسری یہودی عورتوں سے محبت کرنے لگوں۔ مگر کیا میری اور للیتی کی محبت سے یہ فائدہ نہ پہنچے گا کہ یہودیوں کے دل سے میری نفرت کم ہو جائے گی اور وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جائیں گے"

ہٹلر مسکرانے لگا۔

گورنگ بھی ہٹلر کا یہ عجیب فلسفہ سُن کر مُسکرا دیا، پھر بولا "آپ ٹھیک فرماتے ہیں لیکن میرا خیال ہے لوگوں کے دل سے یہ خیال نکل جانا چاہیئے کہ آپ یہودیوں سے محبت کرتے ہیں ورنہ وہ طرح طرح کے خدشات اور توہمات کا شکار رہیں گے۔"

ہٹلر غصہ سے جھنجھلا کر بولا: "گورنگ! میں نے تمہارے تمام مشورے سُن لیے، میں اس معاملہ میں آئندہ تمہاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔"

گورنگ نے جرمنی کے حاکمِ اعلیٰ کو سلام کیا اور چلا گیا۔

محبت اور نصیحت ادھر ہٹلر سے گورنگ نے یہ باتیں کہیں اُدھر لینی کو بھی ہٹلر کے ساتھ محبت کرنے سے روکا جانے لگا۔ لینی کے بعض عزیزوں کا خیال تھا کہ اس محبت کے نتیجہ میں کسی وقت بھی کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعض رشتہ دار اُسے ہٹلر کے پاس آنے جانے سے روکتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی لینی کو ترکِ تعلق کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ مگر لینی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اگرچہ اس کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ جرمنی کے ڈکٹیٹر نے اسے اپنی محبت کے لیے انتخاب کیا ہے اور وہ اس اعزاز سے از خود دستبردار ہونے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ ہٹلر کو دل سے چاہتی تھی اور اُس سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح ہٹلر اس سے محبت کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے عزیزوں یا دوسرے لوگوں کی غوغا آرائی اسے اس راہ سے نہ ہٹا سکی۔

مزاجِ دیر میں مدت سے برہمی سی ہے ، مگر یہ بات حرم کے لیے نئی سی ہے

گورنگ کا وعظ جنرل گورنگ اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ ملازم نے لینی کے آنے کی اطلاع دی۔ گورنگ نے اُسے اندر طلب کر لیا:

"آپ نے مجھے بلایا ہے" لینی نے گورنگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں! میں نے تم سے کوئی ضروری باتیں کرنی تھیں" گورنگ نے کہا۔

"فرمائیے" لینی بولی۔

گورنگ: میں نے تمہیں اس لیے یہاں آنے کی تکلیف دی ہے کہ جیسا کہ تم خود بھی جانتی ہو

فیوہرر اور تمھارے متعلق لوگوں میں عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں جس سے تمھارے نقصان کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ نقصان کیا ہو سکتا ہے؟ تم خود اچھی طرح جانتی ہو لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم فیوہرر سے ملنا جلنا چھوڑ دو۔"

لینی : "کیا فیوہرر نے خود آپ سے یہ بات کی ہے یا آپ اپنے طور پر مجھ سے کہہ رہے ہیں؟"

گوئرنگ : "میں فیوہرر اور جرمنی کے تمام افراد کے مفادات کی حفاظت کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں اس لیے اس ضمن میں کوئی قباحت پیدا ہو تو میں اپنا حق سمجھتا ہوں کہ اُسے دُور کرنے کی کوشش کروں۔"

لینی : "اگر ایسا ہی ہے تو فیوہرر خود مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے یا آپ فیوہرر سے اس معاملے پر گفتگو کریں۔ جہاں تک ہمارے میل جول کا تعلق ہے اسے ملکی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں پھر لوگ اس پر چہ میگوئیاں کرتے ہیں تو ہمیں کیا یا آپ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

گوئرنگ : (غضبناک چہرہ بناتے ہوئے) "لینی ، تم جانتی ہو ، جس فرقے سے تمھارا تعلق ہے وہ ملک کا بہی خواہ نہیں سمجھا جاتا ۔ پھر جرمن لوگ یہ کیسے پسند کر سکتے ہیں کہ اس فرقے کی عورت جرمنی کے فیوہرر سے رابطہ جوڑے۔"

لینی : "مگر میں فیوہرر کی عظمت کے سامنے جھک چکی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں ، اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کیسے گوارا کر سکیں گے کہ میں انھیں ترک کر دوں۔"

گوئرنگ : "میں تم سے لمبی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ یہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ ساری جرمن قوم کا مطالبہ ہے کہ تم فیوہرر کو گمراہ کرنے سے باز آجاؤ۔"

گوئرنگ کا آخری فقرہ سُن کر لینی غصّہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی ، "جنرل ! میں یہ باتیں سننا پسند نہیں کرتی"

محبوبہ کی گھبراہٹ | لینی چلی گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھائے گھر کی طرف روانہ ہو گئی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جس شخص نے اُسے ترکِ محبت کا وعظ سنایا تھا ـــــ وعظ نہیں بلکہ حکم دیا تھا ـــــ وہ کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ وہ جرمن فوجوں کا جرنیل ، ہٹلر کا دستِ راست اور

اس کا مشیر خاص تھا۔ لینی اس کی باتوں کا جواب تو دے آئی مگر اس میں اس کی منشا کے خلاف چلنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے گورنگ کے حکم کے مطابق عمل نہ کیا تو وہ اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں وہ گھر پہنچی جب دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو ہٹلر کو ٹیلیفون پر سارے معاملہ کی اطلاع دی اور کہا کہ گورنگ نے اُسے دھمکی دی ہے۔

ہٹلر کی دوڑ لینی ٹیلیفون پر ہٹلر سے باتیں کرتے وقت بھی رو رہی تھی چنانچہ ہٹلر اپنی محبوبہ کے غم واندوہ کی تاب نہ لا سکا اور اسی وقت اس کے مکان کا رخ کیا۔ اندر قدم رکھا لینی سامنے بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ پاؤں کی آہٹ سن کر چونکی، جونہی ہٹلر کو دیکھا بے تحاشا اُٹھ کر دوڑی اور سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اونچی آواز سے رونے لگی "نیوہرر! مَیں نے کونسا ایسا قصور کیا کہ سب میرے پیچھے پڑ گئے ہیں ......"

ہٹلر نے جھک کر اسے اوپر اٹھایا اور گلے سے لگاتے ہوئے تسلی دی۔ "لینی! تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئیں۔ گھبرانے کی ایسی کوئی بات نہیں۔ گورنگ بے وقوف ہے۔ تم سے ایسی باتیں کہہ کر اس نے سخت نادانی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے تمہارا دل دُکھا ہے مگر اس نے اپنے خیال کے مطابق نیک ارادے سے یہ باتیں کی ہیں۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ گورنگ کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی اشارتاً یہ بات مجھ سے کر چکے ہیں کہ تمہاری محبت کے باعث لوگ اس بات کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ میں یہودیوں کو ناجائز مراعات دے دوں گا اور ان کا یہ خیال کسی حد تک درست ہے۔ گورنگ نے تمہارے بارے میں مجھ سے جو باتیں کی تھیں ان کے پس پشت یہی جذبہ کار فرما تھا اور تمہیں بھی اس نے اسی خیال کے تحت روکا ہے۔ مگر میں اُسے سمجھا دوں گا کہ وہ لوگوں کی باتوں کا خیال نہ کرے اور آئندہ سے تمہارے راستے میں حائل نہ ہو۔"

لینی بدستور رو رہی تھی، ہٹلر نے اس کے لبوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "بہت رو چکیں اب میری طرف دیکھ کر ذرا مسکراؤ تو۔" ہٹلر نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کر دیا۔ لینی اشکبار آنکھوں سے مسکرا دی۔ دونوں کے لب ملے۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں سکوت طاری رہا۔ پھر اچانک ساتھ والے کمرے سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔

—— لینی نے اپنا لباس درست کیا —— ہٹلر جا چکا تھا ؎

ہم تری بزم کے آداب سے آگاہ تو ہیں!
اپنا ادراک مگر ان کا گنہگار نہیں!

ہٹلر کی مصروفیتیں لینی سے رخصت ہونے کے بعد ہٹلر نے طے کیا کہ وہ گوئرنگ کو لینی کے معاملات میں دخل دینے سے سختی کے ساتھ روک دے گا مگر اس کی سیاسی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ اُسے گوئرنگ کے ساتھ اس بات چیت کے لیے وقت ہی نہ مل سکا۔ دن گزرتے گئے، اچانک ایک روز اُسے خبر ملی کہ لینی جرمنی میں نہیں۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ اس کا سراغ لگائے مگر لینی کا پتہ نہ چلا۔ ہٹلر کو شبہ ہو گیا تھا کہ لینی کے گم ہونے میں گوئرنگ کا ہاتھ ہے مگر اس کی تمام تر توجہ ملکی معاملات کی طرف منعطف ہو گئی تھی، اس لیے اس نے لینی کے لیے کوئی تگ و دو نہ کی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اسے پتہ چلا کہ جاپان نے چین پر حملہ کر کے نانکنگ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور پیکنگ میں شمالی چین کے لیے نئی جمہوری حکومت قائم کر دی گئی ہے۔ ادھر میونخ کے ہسپتال میں جنرل لوڈنڈارف کا انتقال ہو گیا۔ پھر ارجنٹائن ہوائی بیڑے کا افسر اعلیٰ جرمنی کے کارخانوں کے معائنہ کے لیے آگیا۔ ان حالات میں ہٹلر بہت مصروف رہا۔ پھر یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو سالِ نو کی ایک تقریب پر اس نے ایک اہم تقریر کی۔ اسی ماہ جرمنی اور اٹلی کے مابین معاہدہ ہوا، اسی ماہ یوگوسلاویہ کا وزیر اعظم برلن آگیا۔ برطانیہ کا ایک وزیر بھی وہاں آ دھمکا۔ اگلے ماہ ہٹلر نے جرمنی کے نظامِ حکومت میں نہایت اہم تبدیلیاں کیں غرض مسلسل کئی ماہ تک ہٹلر اتنا مصروف رہا کہ لینی کا سُراغ لگانے کی بجائے اُسے دل سے بالکل محو کر دیا۔

ہٹلر کی تیاریاں کئی مہینے گزر گئے۔ اس اثنا میں ہٹلر کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جرمن قوم کا ہر فرد ہٹلر کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہو چکا تھا۔ جرمن قوم اپنے عہد کی سب سے مضبوط اور طاقت ور قوم سمجھی جانے لگی۔ یورپ کے سارے ملک جرمنی کے نام سے لرزہ براندام ہونے لگے تھے۔ نت نئی جنگی ایجادوں نے ساری دنیا کو جرمنی سے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ہٹلر جرمنی کے لیے سہانے خواب دیکھنے لگ گیا تھا۔ یورپ کے تمام تاجدار ہٹلر کے بڑھتے ہوئے

اقتدار اور جرمنی کی برق رفتار ترقی سے ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے تھے۔ لینی سے آخری ملاقات کو تین سال سے زائد مدت گزر چکی تھی، مگر موجودہ حالات میں لینی کی داستان محبت ہٹلر کے دل سے یک قلم منسوخ ہو چکی تھی۔

۱۶ اگست ۱۹۳۶ء کا دن جرمنی کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس دن جرمنی میں پہلی بار عظیم الشان فوجی مظاہرہ ہوا جس میں ۲½ لاکھ فوجیوں نے حصّہ لیا۔ جرمنی کے اس مظاہرے سے یورپ کی تمام حکومتیں خوفزدہ ہوگئیں۔ چنانچہ اس کے خلاف اگلے ماہ فرانس نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور رفتہ رفتہ ساری یورپی طاقتوں میں جنگی رجحان زور پکڑ گیا۔

دوسرا نیا رومان | دوپہر کا وقت تھا، برلن کی ایک عالی شان عمارت کے ایک کمرے میں دو نوجوان عورتیں بالمقابل بیٹھی تھیں۔ درمیان میں میز پہ کاغذوں، اخباروں اور فائلوں کے انبار رکھے تھے۔ ایک کونے میں میز پر فون رکھا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ایک عورت نے فون اٹھایا کوئی کہہ رہا تھا:

"میرا خیال تھا تم جا چکی ہو گی۔ اچھا بہرحال تم شام سے قبل میرے ہاں پہنچ جاؤ۔"

"بہت بہتر فیوہرر" عورت نے جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

ٹیلیفون کرنے والا ہٹلر تھا اور جس عورت سے اس نے بات کی وہ اس کی پرائیویٹ سیکرٹری ایوا براؤن تھی۔

ایوا براؤن کی عمر ۲۳ سال سے زائد نہ تھی جب وہ ہٹلر کے پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدہ پر ملازم رکھی گئی۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور اور دُبلی پتلی عورت تھی مگر اس کے خدوخال میں کمال کی جاذبیت تھی۔ گفتگو ایسی تھی کہ مخاطب کا دل موہ لیتی تھی۔ اس کے عادات و اطوار بھی بہت پسندیدہ تھے۔ جسمانی لحاظ سے جتنی کمزور تھی اتنا ہی اس کا دل مضبوط اور ارادہ میں بلا کا استحکام تھا۔ محنت مشقت کی عادی تھی۔ کئی کئی گھنٹے مسلسل کام کرنے سے نہ گھبراتی تھی۔ انھیں اوصاف کے باعث وہ ہٹلر کو مرغوب تھی۔ ابتدا میں ہٹلر اسے محض پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا مگر جوں جوں عرصہ گزرتا گیا ہٹلر اس کی طرف زیادہ کھنچنے لگا یہاں تک کہ بالآخر اس سے محبت کرنے لگا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ محبت کی ابتدا کس طرف سے ہوئی۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے سے

پیار کرتے تھے۔ ہٹلر کو تمام دوسرے افراد کی نسبت ایوا براؤن پر زیادہ اعتماد تھا چنانچہ وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اُسے ایک قابلِ اعتماد سیکرٹری مل گئی ہے۔ جو اس کی خفیہ خط و کتابت بھی بااحسن طریق انجام دیتی ہے۔ ایوا براؤن کی یہ خصوصیت ہٹلر کے لیے اور زیادہ کشش کا باعث تھی۔ چنانچہ آج ہٹلر نے ایک نہایت خفیہ کام کے سلسلے میں ایوا براؤن کو اپنے مکان پر طلب کیا تھا۔

شام ہونے سے قبل ایوا براؤن ہٹلر کے مکان پر پہنچ گئی۔ وہ اس وقت بند کمرے میں بیٹھا ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ ہٹلر کی ہدایت کے مطابق ایوا براؤن انتظار کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ نصف گھنٹہ کے بعد ہٹلر کمرے سے باہر آیا اور ایوا براؤن کو ساتھ لے کر پھر اسی کمرے میں چلا گیا۔ نصف رات تک دونوں سرکاری کاغذات دیکھنے میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں تین چار مرتبہ ہٹلر کے ذاتی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی مگر اس نے اس طرف توجہ نہ دی اور بدستور کام میں لگا رہا۔ ایوا براؤن کے چہرے پر کثرتِ کار کے باعث تھکن کے آثار ظاہر تھے مگر وہ بھی بدستور کام میں مصروف رہی۔

کام ختم کرنے پر دونوں استراحت کے کمرے میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد ایوا براؤن اپنے گھر چلی گئی اور ہٹلر کھانا کھائے بغیر سو گیا۔

وحشتناک دَور ۱۹۳۶ء کا سال دنیا کے لیے تباہی اور بربادی کا پیغام لے کر آیا۔ اچانک دنیا نے یہ خبر سُنی کہ اٹلی نے حبشہ[1] (ایبے سینیا) کے مسئلہ میں لیگ کی ثالثی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور بین الاقوامی معاہدوں کو یک قلم منسوخ قرار دیتے ہوئے حبشہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے یہ بھی اعلان کیا کہ کسی قوم نے ہمارے ہاتھ ہتھیار بیچنے کے خلاف بات کی تو اس کے خلاف بھی کھلی جنگ ہو گی۔ غرض حبشہ پر چڑھائی کر دی گئی۔ اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا اور شہنشاہ حبشہ نے بھاگ کر لندن میں پناہ لی۔

کچھ مدت بعد دنیا نے دوسری ہولناک خبر سُنی۔ ہٹلر نے لیگ آف نیشنز کو ٹھکرا کر

---

[1] شمالی افریقہ کا ایک ملک۔ رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل اور آبادی چھہتر لاکھ کے قریب ہے۔ اس کا قدیم نام ایتھی اوپیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بلقیس ملکہ سبا کے زمانے میں یہ ملک اور قدیم مصر و فلسطین اس کی سلطنت میں شامل تھے چوتھی صدی میں یہاں عیسائیت پھیلی۔ اور اس کے چار سو برس بعد مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں کسائی عرف تھیوڈور نے یہاں آزاد حکومت قائم کر لی۔ ۱۸۸۹ء میں ایک معاہدہ کے رو سے ملکی نظم و نسق کے اختیارات اٹلی کے ہاتھ آ گئے لیکن ۱۸۹۵ء میں ایبے سینیا نے اٹلی سے جنگ کر کے اسے شکست دی اور ایبے سینیا آزاد ہو گیا۔

دریائے رائن کے مغربی ساحل کے علاقے پر قبضہ جمالیا۔ پھر ہٹلر کی نگاہیں وسطِ یورپ کے ان علاقوں پر مرکوز ہوئیں جو ۱۹۱۹ء کے صلحنامہ درسیلز کے رو سے جرمنی سے کاٹ دیے گئے تھے۔ چنانچہ ان علاقوں میں نازی پارٹیاں قائم کردی گئیں۔

پھر ۱۹۳۸ء کا وہ بھیانک وقت آیا جب جرمن فوجیں آسٹریا میں داخل ہوگئیں پھر چیکوسلوکیہ کے جرمن علاقے سوڈیٹین لینڈ پر حملہ کر دیا گیا۔ اور سارا چیکوسلوکیہ سنبھال لیا گیا۔ ڈینزگ اور میمل لینڈ بھی قبضہ میں لے لیے گئے۔ پولینڈ کو مغلوب کرلیا گیا۔ فرانس اور برطانیہ نے چونک کر جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

۱۹۳۹ میں روس اور جرمنی نے اچانک باہم اشتراک عمل کا معاہدہ کرلیا پھر ۱۹۴۱ میں یکایک ہٹلر نے روس پر دھاوا بول دیا۔ دوسرے لفظوں میں ہٹلر نے ساری دنیا سے جنگ چھیڑ دی۔

ابتدا میں جرمن فوجیں دُور تک روس کی سرزمین میں چلی گئیں پھر جلد ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ روس نے جرمنوں کو نہ صرف اپنے ملک سے نکال دیا بلکہ یوکرین، بلغاریہ اور فن لینڈ کو بھی جرمنوں سے صاف کر دیا اور روس کی فوجیں شمال مغربی جرمنی تک پہنچ گئیں۔ ادھر یونان میں برطانوی فوجوں نے نیا حملہ کر دیا۔

جون ۱۹۴۴ء میں امریکہ اور برطانیہ نے بھی جنگ کا نیا محاذ کھول دیا اور اگست کے وسط میں فرانس کے جنوبی ساحل سے اتحادی فوجیں پیرس کی طرف بڑھنے لگیں۔ جرمنی کے خلاف عام بغاوت ہوگئی جسے دبانا ناممکن ہوگیا۔

دو دلوں کی اسیری

دشمن کی فوجیں برلن پر دو طرف سے پیشقدمی کر چکی تھیں۔ مشرق میں روسی فوجیں یلغار کرتی چلی آرہی تھیں اور مغرب میں برطانوی اور امریکی فوجیں جن کے ساتھ جنرل ڈیگال کے آزاد فرانس کی مسلح تنظیم بھی شامل تھی۔ ہٹلر اپنی محبوبہ کے ہمراہ برلن کی چانسلری میں تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اب اس کا بچ نکلنا ناممکن ہے اور شکست اور موت دونوں یقینی ہیں مگر وہ ذلت کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی اُسے یہ گوارا تھا کہ وہ زندہ یا مردہ حالت میں دشمنوں کے ہاتھ آئے۔ تاہم اس نے جی نہ چھوڑا۔ اس کے چہرے پر

پریشانی اور ہراس کا نشان تک نہ تھا۔ ایوا براؤن اگرچہ بہادر اور ہٹلر ہی کی طرح باحمیت اور دلیر عورت تھی تاہم وہ کسی قدر پریشان ہو رہی تھی۔ ہٹلر نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنی فوجوں کو آخر دم تک لڑنے کی تلقین کرتا رہا۔

موت کا جشن چانسلری کے تہ خانے میں برقی قمقمے روشن تھے۔ پچاس سے زائد خوش پوش فوجی افسر دعوت اڑانے میں مصروف تھے۔ اگرچہ برلن پر دشمن کی بمباری برابر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اور گولوں کی گھن گرج کی آواز دعوت اڑانے والے افسروں کے کانوں تک برابر پہنچ رہی تھی مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آوازوں سے بے نیاز ہو کر مزے اڑانے میں مصروف ہیں۔ اس دعوت کا اہتمام ہٹلر نے کیا تھا۔ ہٹلر بھی اس دعوت میں شریک تھا۔ وہ چائے پر چائے پی رہا تھا۔ ایوا براؤن اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور ٹوسٹ کاٹ کاٹ کر اسے دے رہی تھی۔ شاید یہ لوگ اپنی موت کا جشن منا رہے تھے۔

ہٹلر کا ذاتی ملازم لنج بھی اس موقع پر موجود تھا وہ لکھتا ہے کہ یہ تقریب ہٹلر کی موت سے دس دن پہلے ہوئی۔ یہ دراصل ہٹلر نے اپنی سالگرہ کی خوشی میں کی اور اس دن وہ خلاف معمول بہت خوش نظر آتا تھا۔ اس دن گورنگ، ربن ٹراپ اور کئی دوسرے فوجی افسر بھی تقریب میں شامل تھے اور انھوں نے آخر دم تک وفادار رہنے کا عزم کر رکھا تھا۔

دو دلوں کی آگ تہ خانے میں زیادہ عرصہ تک رہنے کے باعث ہٹلر کی محبوبہ کی صحت میں فرق آگیا تھا چنانچہ وہ اس کے متعلق بہت پریشان تھا۔ ایوا براؤن کو اپنے ہمراہ کھلی ہوا میں سیر کرانے کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ لنج کہتا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ برلن کے کھنڈروں میں گھوم آیا کرتا تھا۔ مرنے سے کچھ مدت پہلے ایوا براؤن نے مجھ سے کہا "اگر ہمارے بچ جانے کا معجزہ ظہور میں نہیں آ سکتا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہٹلر کے ساتھ مروں اور اس کی جائز بیوی کی حیثیت سے مروں"۔

یہ کہتے کہتے ایوا براؤن کی آواز بیٹھ گئی اور وہ جذبات کے طوفان میں گم سم ہو کر رہ گئی۔ چونکہ میرے دل میں ایوا براؤن کی بہت قدر تھی اور میں اس سے دلی ہمدردی رکھتا تھا اس لیے

لہ ہٹلر کی موت اور برلن کی فتح کے بعد روسیوں نے لنج کو گرفتار کر لیا تھا مگر کچھ مدت بعد اسے رہائی مل گئی تھی۔

اُس کی زبان سے یہ بات سُن کر میں بہت متاثر ہوا۔ چاہتا تو تھا کہ اس معاملے میں اس کی راہنمائی کروں مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

جوش و حشت: ادھر ہٹلر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ہر وقت جوش و خروش سے بھرا رہتا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بپھرا ہوا شیر اپنے شکار کی تلاش میں ہے ایک دن اس نے غضبناک ہو کر کہا "اگر روسیوں نے مجھے زندہ یا مردہ حاصل کر لیا تو مجھے ماسکو لے جائیں گے اور وہاں میری کھلی نمائش کریں گے" ہٹلر کی آواز بلند ہوتی گئی، اس کی بھویں تن گئیں، وہ غصہ سے بولا "مگر میں تمہیں بتا دوں کہ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ دشمنوں کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی، وہ ہٹلر کو زندہ حاصل کر سکیں گے نہ مرا" ؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے

نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی!

وادیٔ مرگ اور نغمۂ شادی: لنج لکھتا ہے کہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء کی صبح کو ہٹلر نے مجھے بلایا۔ میں گیا۔ ہٹلر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور اشارے سے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا میں اس کے ساتھ تہ خانہ کے اس کمرے میں چلا گیا جہاں کئی بڑی اہم جنگی کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں۔ وہاں پہنچ کر اس نے مجھے بتایا کہ وہ آج ایوا براؤن سے شادی کرے گا لہذا اس کمرے کو ضروری سامان سے آراستہ کر دیا جائے۔ پھر ضروری ہدایات دینے کے بعد ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اور شادی کے گواہ بورمین اور گوبلز اس میز پر بیٹھیں گے۔ پھر بتایا کہ شادی کی رسم ادا کرنے کے لیے میں نے والٹر وگنر کو بلا بھیجا ہے جس نے ڈاکٹر اور فراگوبلز کی شادی کی رسم ادا کی تھی۔ یہ ہدایات دینے کے بعد وہ ایک دم چپ سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سہاگ کی پہلی اور آخری رات: پروگرام کے مطابق شادی کی رسم دوپہر سے قبل انجام پانی تھی مگر وگنر کو تلاش کرنے میں خاصی دیر ہو گئی اور دوپہر کا وقت جاتا رہا۔ چنانچہ آدھی رات کو شادی کی رسم ادا ہوئی اور ہٹلر اور ایوا براؤن شوہر اور زوجہ کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔ اس موقعہ پر زبردست جشن منایا گیا۔ ہٹلر کے قریبی دوست اور بڑے بڑے فوجی افسر

سبھی موجود تھے۔ شراب کے خم لنڈھائے گئے۔ ہٹلر نے شراب نہ پی بلکہ اپنے لیے چائے کا انتخاب کیا۔ اس لیے کہ چائے اسے بہت مرغوب تھی۔ وہ بے تحاشا چائے پی رہا تھا اور برلن کے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا تھا، آج تھوڑی دیر کے لیے یہ سب لوگ اس سے بالکل بے فکر ہو گئے تھے۔ اور سب نہایت خوش و خرم نظر آتے تھے۔

میں ایوابراؤن کو عرصے سے جانتا تھا۔ میں نے اُسے کبھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا جتنا وہ آج نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوشی اتنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ مجھے اس میں مصنوعی پن نظر آنے لگا۔ ہٹلر اور دوسرے تمام افراد کا بھی یہی حال تھا۔ شاید اس لیے کہ انھیں یہ گمان تک نہ تھا کہ آج ان کی زندگی کا آخری دن ہے۔

رُوح فرسا انجام اگلے دن جب سورج طلوع ہوا، ہٹلر تہ خانے سے باہر نکل کر اوپر کے کمرے میں آیا۔ کھڑکی سے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف نظر دوڑائی۔ دُور فضا میں بمبار طیارے اُڑتے نظر آئے، اس نے کھڑکی بند کر دی اور واپس تہ خانے میں چلا آیا۔ ایوابراؤن اپنے پریشان بالوں کو باندھ رہی تھی۔ ہٹلر کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہٹلر بھی مسکرا دیا۔ اتنے میں زوردار دھماکہ ہوا جس نے دونوں کو لحظہ بھر کے لیے چونکا دیا۔ ایوابراؤن اٹھ کر ہٹلر سے لپٹ گئی اور ہٹلر اس کے نرم اور گداز بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دونوں ایکدوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر نہ جانے ان کی زبان کیوں بند تھی۔ وہ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے مگر نہ ہٹلر بولا اور نہ ایوابراؤن کی زبان سے کوئی لفظ نکلا۔ اُڑتے ہوئے طیاروں اور دھماکوں کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ روسی، امریکی اور برطانوی بمبار طیارے برلن شہر کو اپنی زد میں لے چکے تھے۔ چانسلری کی عمارت بھی تباہی کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ کھڑکیاں ٹوٹ رہی تھیں، دروازے ہل رہے تھے۔ طیارہ شکن توپوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی ——— ہٹلر اور ایوابراؤن کی موت کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ مگر ہٹلر کو زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ "اگر روسیوں نے مجھے زندہ یا مردہ حاصل کر لیا تو مجھے ماسکو لے جائیں گے وہاں میری کھلی نمائش کریں گے۔ میری سخت ذلّت ہو گی مگر ——— میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"میرے پیارے فیوہرر" (ایوا براؤن نے زہر کی چھوٹی سی شیشی ہٹلر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا) "جرمنی کے قائد کے لیے عزت کی موت ـــــــ"

ہٹلر نے شیشی ہاتھ میں لی اور اپنے حلق میں انڈیل دی۔

"میں مر بھی جاؤں تو میری لاش ان کتوں کے ہاتھ نہ لگے گی۔" اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

ایوا براؤن کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اس نے ایک دوسری شیشی نکالی اور اپنے حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا "فیوہرر! عزت کی موت ـــــــ دونوں کے لیے ـــــــ"

اِدھر ہٹلر لڑکھڑایا، اُدھر ایوا براؤن کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ بے خودی کے عالم میں ہٹلر نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیے مگر زہر دونوں طرف اپنا کام کر رہا تھا۔ ہٹلر اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔ بہ مشکل اس کی زبان سے نکلا "ہماری نعشیں ان کے ہاتھوں ذلیل نہ ہوں گی ـــــــ"

ایوا براؤن کی عظمت ہٹلر کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں مگر ایوا براؤن نے بھی ہٹلر کے ساتھ رہ کر جس وابستگی، خلوص، مردانگی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا، اس کے پیش نظر کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی بہت بلند شخصیت کی مالک تھی۔ ہٹلر کے ساتھ اس کی محبت محض محبت ہی نہ تھی بلکہ وہ شروع سے آخر تک تمام ملکی اور جنگی کاروبار میں بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ میدانِ جنگ میں ہر خطرے کے موقع پر ہٹلر کے ساتھ رہی۔ چنانچہ ہٹلر کے آخری ایام میں جب دشمن کے ہوائی جہاز برلن کے مرکزی دفتر اور چانسلری پر بمباری کر رہے تھے۔ ایوا براؤن ہر وقت اس کے ساتھ رہی۔ پھر ہٹلر کے ساتھ اس نے بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہٹلر نے خودکشی کرتے وقت بھی اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دینا چاہتی ہے تو اُسے اس بات کی اجازت ہے مگر اس کی وفاداری نے اسے گوارا نہ کیا اور ہٹلر کے ساتھ مر مٹنے کو ترجیح دی۔

بے گور و کفن لاشیں لنج لکھتا ہے کہ میں نے ہٹلر اور اس کی محبوبہ کی لاشیں چادروں میں لپیٹیں، تاکہ کوئی بھی انھیں نہ دیکھ سکے۔ پھر پوشیدہ طور پر انھیں تہ خانے سے باہر لایا۔ ہٹلر کی لاش میں نے اور ایک دوسرے افسر نے اٹھا رکھی تھی اور ایوا براؤن کی لاش ہٹلر کے ذاتی عملے کے ایک

ٹیجر نے اٹھائی۔ ایوا براؤن نے گہرے نیلے رنگ کا دانے دار چست لباس پہن رکھا تھا۔ اٹلی کے جوتے اور نیلن کی جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ اس کی کلائی پر پلیٹنیم کی نہایت خوبصورت اور قیمتی گھڑی بندھی تھی جس پر ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ گھڑی کئی سال پیشتر ہٹلر نے اُسے تحفہ کے طور پر دی تھی اور وہ ہمیشہ اسے پہنے رکھتی تھی۔

میں نے پیٹرول منگایا، چند افسر میرے ساتھ تھے۔ ہم نے دونوں لاشوں پر یکے بعد دیگرے کئی ڈبے انڈیلے۔ اس دوران میں توپوں کی آواز بدستور بڑھتی جا رہی تھی بلکہ اب مشین گنوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ مشین گنوں کی آواز اس بات کی مظہر تھی کہ دشمن ہمارے بہت قریب آگئے ہیں چنانچہ میں نے جان لیا کہ وقت بہت کم ہے۔ ہمیں ان لاشوں کو جلد جلا دینا چاہیے۔

لاشیں راکھ ہوگئیں میں نے پیٹرول سے بھیگی ہوئی لاشوں کو آگ دکھائی۔ زبردست شعلہ ہوا میں بلند ہوا، جس کی تیز روشنی سے میری اور پاس کھڑے دوسرے افسروں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، مگر جتنی جلدی یہ آگ بھڑکی تھی اتنی ہی جلد ٹھنڈی بھی ہوگئی۔ ہم نے دیکھا کہ چادریں جل کر راکھ ہوگئی ہیں مگر مُردوں کی لاشیں صرف جھلسی ہیں اور پہچانی جا سکتی ہیں۔

میں بہت گھبرایا، وقت کم تھا دشمن قریب سے قریب تر ہو رہے تھے اور لاشیں اُسی طرح رکھی تھیں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آہستہ آہستہ جلنے والا بارود کیوں نہ استعمال کیا۔ یہ بارود پیٹرول سے ہر حالت میں اچھا رہتا۔ مگر اب دیر ہوتی جا رہی تھی مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میں ان لاشوں کو راکھ میں تبدیل نہ کر سکوں گا اور اس طرح اپنے آقا کی وصیت پوری نہ کر کے بے وفائی کا مرتکب ہوں گا۔

اس موقع پر ایک دوسرے فوجی افسر نے یہ کام سنبھالا۔ اُسے ہٹلر نے خفیہ احکام دے رکھے تھے جن کا مجھے علم نہ تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں ہٹلر کے کمرے میں جا کر اس کی ذاتی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر نیست و نابود کر دوں۔ چنانچہ میں چلا گیا اور اس کام میں مصروف ہو گیا۔ اس اثنا میں دونوں لاشوں کو جلا کر نابود کر دیا گیا۔

یہ سیرِ چمن بھی مسرت کے چہرے پہ غم کی خراشوں کا باعث بنی ہے!
مجھے ہنستے پھولوں کے دیکھنے سے یاد آ رہے ہیں وہ گُل جو یہاں سے سدھائے

مزید انکشافات لنج کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں نے ہٹلر اور ایوا براؤن کے آخری ایام اور ان کی خودکشی کے متعلق مختلف دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ذمہ دار لوگوں کے بیانات کی روشنی میں جو کوائف سامنے آتے ہیں انھیں عبدالقدیر رشک نے اپنی کتاب "سنگم اور سایے" میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو اڑھائی بجے دوپہر کے بعد ہٹلر اور اس کی بیوی چانسلری کے باغیچہ میں تعمیر ہونے والے کنکریٹ کے تہ خانہ میں چلے گئے۔ ہٹلر نے ایوا براؤن کو ایک ٹکیہ زہر کی دی۔ اس نے اسے نگل لیا، اور جب ہٹلر نے دیکھا کہ وہ مر رہی ہے تو ہٹلر نے ایک آٹومیٹک پستول کی نالی اپنے منہ میں ڈالی اور گھوڑا دبا دیا۔ ہٹلر کا دماغ پاش پاش ہوگیا۔ چند منٹ بعد ہٹلر کے ساتھیوں گوئبلز، مارٹن بورمین اور سرجن ڈاکٹر لڈوک سٹمپ فیگر نے دونوں کی لاشوں کو اٹھایا اور تہ خانے کے دروازے پر لا کر ان پر کئی گیلن گیسولین چھڑک دی۔ اسی لمحہ روسی توپوں کے گولے چانسلری کے باغیچہ میں گرنے لگے۔ گوئبلز اور بورمین پیچھے ہٹ کر تہ خانہ کی آڑ میں کھڑے ہوگئے۔ وہاں انھوں نے ایک کپڑے کو گیسولین سے تر کیا اور آگ لگا کر لاشوں پر پھینک دیا۔

دوپہر اور رات کو متعدد بار ہٹلر اور ایوا براؤن کی لاشوں پر گیسولین چھڑکی گئی حتیٰ کہ دونوں کا نام و نشان نہ رہا۔ صرف چند ایک جلی ہوئی ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے۔ تب ہڈیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیئے گئے۔ راکھ پھینک دی گئی اور ان کا پھر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ روسیوں نے اس باغیچہ کو کھود ڈالا، وہاں سے ڈیڑھ سو لاشیں برآمد ہوئیں، لیکن ہٹلر کی لاش کا کوئی پتہ نہ چلا۔

۹ مئی کو جب جرمنی نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالے تو اس وقت چانسلری کے وسیع و عریض ہال اور بڑے بڑے کمرے مٹی سے بھرے پڑے تھے اور بم گرنے سے گہرے شگاف پیدا ہوگئے تھے۔

اگر آپ چانسلری کے باغیچہ میں قدم رکھیں، یہاں آج بھی تباہی کے منظر نظر آتے ہیں اور انھیں دیکھ کر جنگ کے اس ناقابل یقین آخری ایکٹ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کیونکہ یہی ہے وہ جگہ جہاں ہٹلر کا خاتمہ ہوا تھا۔

یہ باغیچہ ایک المناک منظر پیش کرتا ہے۔ تمام درخت ٹوٹے ہوئے ہیں اور پتوں کا نام و نشان

تک نہیں۔ تاحدِ نگاہ تمام عمارتیں کھنڈر بن چکی ہیں۔ یہاں ہٹلر کے باڈی گارڈوں کی قبریں ہیں علاوہ ازیں ہر طرف ملبے کے ڈھیر ہیں۔ وہ منظر آنکھوں کے سامنے لائیے جب روسی چانسلری تک پہنچنے کے لیے انچ انچ زمین کے لیے لڑ رہے تھے جب ہٹلر کے وفادار ساتھی اسے چانسلری خالی کر دینے کی استدعا کر رہے تھے اور روسیوں کے بیان کے مطابق بیس ہزار روسی توپیں سٹی برلن میں گولہ باری کر رہی تھیں۔

پچاس گز چل کر آپ کنکریٹ کے بنے ہوئے تہ خانہ تک پہنچ جائیں گے۔ تنگ سیڑھیاں نیچے اتر کر آپ اس کمرہ میں پہنچ جائیں گے جہاں ہٹلر اور ان کے گھرے ساتھیوں نے آخری چند دن گزارے تھے۔ ان زیرِ زمین انتہائی سادہ کمروں کا مقابلہ چند گز کے فاصلہ پر واقع چانسلری کی شاندار عمارت سے کیجیے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں گوئبلز، اس کی بیوی اور بچوں نے زہر کھا کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ یہ ہے وہ چھوٹا سا فلیٹ جس میں ہٹلر اور ایوا براؤن رہتے تھے۔ یہ سونے کے دو کمروں، دو غسل خانوں اور ایک بیٹھک پر مشتمل ہے۔ ایوا براؤن کے کمرہ میں صوفہ پڑا ہے، جہاں وہ مرے تھے اب بھی خون کے دھبے موجود ہیں۔

برطانوی دستاویزوں میں کہا گیا کہ ہٹلر کی اصل پلان یہ تھی کہ وہ ۲۰۔ اپریل کو بذریعہ ہوائی جہاز برگس گارڈن جائے گا اور وہاں سے جدوجہد جاری رکھے گا۔ لیکن جب مقررہ دن آیا تو اس نے روانگی ملتوی کر دی۔ ۲۴۔ اپریل کو اس نے اپنے سٹاف کی ایک کانفرنس بلائی اور صاف کہہ دیا کہ اس کے خیال میں وہ جنگ ہار گئے ہیں اور اعلان کیا کہ وہ آخر دم تک برلن میں موجود رہنے کا عزم کر چکا ہے۔

ہٹلر نے برگس گارڈن میں آخری مورچہ لگانے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نے برلن میں مر مٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ گوئبلز نے ہٹلر کا ساتھ دینے اور اس کے ساتھ ہی زندہ رہنے اور مرنے کا فیصلہ کیا۔

درحقیقت ایوا براؤن نے ہٹلر کو بھاگ کر برگس گارڈن چلے جانے کے بجائے برلن میں مرنے کے لیے رضامند کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں برگس گارڈن میں آخری مورچہ قائم کرنے کا خیال فضول تھا۔ ایوا براؤن نے متعدد بار کہا "میرے فیوہرر! میرا آخری وقت آن پہنچا ہے یہیں برلن میں شان کے ساتھ موت کو لبیک کہو۔ مجھے اپنے بازوؤں میں تھام لینا تاکہ میں سکھ

کی موت مر سکوں۔

ایوا براؤن جرمن نازی عورتوں کی ایک روشن مثال تھی اور ہٹلر نے اس پر جادو ڈال رکھا تھا۔ چھ سال تک وہ ہٹلر کے ساتھ رہی اور اس کے قریب تر ہوتی گئی۔ اگرچہ ہٹلر عورت کی بجائے اپنے کارناموں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا تاہم اُسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جسے وہ اپنے تمام راز بتا سکے۔ ایک ایسی عورت جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دے۔ ایک بار اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا ایوا مجھ پر کامل یقین رکھتی ہے۔ وہ فتح اور شکست سے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ ایک عینی شاہد کے نام کا انکشاف کیا جا سکتا ہے وہ ہٹلر کے شعبہ تعمیرات کا افسرِ اعلیٰ البرٹ سپیر تھا۔

سپیر کا بیان ہے جب میں ۲۳ اپریل کی رات کو تہ خانہ میں ہٹلر کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ خودکشی کرنے اور اپنی لاش کو جلا دینے کی پلان مکمل کر لی ہے۔ میں نے ان سے استدعا کی کہ وہ برلن سے نکل جائیں۔ ہٹلر نے جواب دیا "میرے دوست! یہ خاتمہ ہے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں"۔

ریش ایک نازی ہوا باز لڑکی ہے اور وہ بھی عینی شاہد ہے۔ ریش ہوائی جہاز کے ذریعے ہٹلر اور بارھویں فوج کے ہیڈ کوارٹرز کے درمیان رابطہ رکھتی تھی۔ اس نے ہٹلر سے استدعا کی کہ اسے برلن میں رہنے اور وہیں موت کو لبیک کہنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن ہٹلر نے اسے برلن سے باہر بھیج دیا۔

اسی دن روسی ٹینک چانسلری کے نزدیک واقع پاٹس ڈیمر پلازہ میں داخل ہو گئے، اور روسی گولے چانسلری کے باغ اور تہ خانہ پر پڑنے لگے۔ وینک کی فوج سے امداد ملنے کے امکانات ختم ہو گئے۔ ۲۹ اپریل کی صبح کو ہٹلر نے گوبلز سے کہا "موت کا وقت آن پہنچا ہے" اور اُسی رات ہٹلر نے ایوا براؤن سے شادی کر لی۔

انگریز مبصر نے بتایا وہ ایک عجیب عورت تھی۔ اُس نے آخری دن کا زیادہ تر حصہ اپنے ناخن پالش کرنے اور اپنا لباس تبدیل کرنے میں گزارا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوا براؤن کی محبت ہٹلر کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اور ایوا براؤن نے اس کی بہت مدد کی۔ ایوا براؤن

نے ہی ہٹلر کو برلن میں موجود رہنے کے لیے رضا مند کیا اور مرنے سے پہلے ہٹلر کو اپنے ساتھ شادی کرنے کے لیے رضامند کر لیا۔

کیا اس سے بھی عجیب شادی ہو سکتی ہے۔ شادی کی رسم محکمہ پراپیگنڈا کے ایک چھوٹے سے افسر نے ادا کی۔ تہ خانہ کے کانفرنس روم میں گوئبلز، بورمین پانچ دیگر اشخاص موجود تھے۔

باقی کہانی ہٹلر کی ایک سیکرٹری نے بیان کی۔ اس لڑکی کے نام کا انکشاف نہیں جا سکتا۔ اس لڑکی کا بیان ہے کہ جونہی شادی کی رسم ادا ہوئی۔ ہٹلر اور ایوا براؤن نے گوئبلز اور باقی سب سے ہاتھ ملائے۔ اور پھر ضیافت کے لیے اس کی بیٹھک میں چلے گئے۔ آخری وقت انھوں نے مجھے بھی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ سارا وقت وہ متوقع خودکشی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں یہ برداشت نہ کر سکی اور اجازت لے کر کمرہ سے باہر چلی آئی۔ اس وقت آدھی رات ہو چکی تھی۔

اس رات ہم میں سے کوئی بھی نہ سو سکا۔ اڑھائی بجے صبح ہٹلر اپنے کمرہ سے باہر آیا اور تہ خانہ میں موجود سب لوگوں کو خدا حافظ کہا۔ اس وقت وہاں دس مرد اور دس عورتیں موجود تھیں۔ ہم سب نے ہٹلر کو سلامی دی اور ہٹلر نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اسے اپنے آپ پر قابو تھا۔ پھر ہٹلر اپنے کمرہ میں ایوا کے ساتھ واپس چلا گیا۔

۳۰۔ اپریل کی دوپہر کو ہٹلر نے گوئبلز کو اپنے کمرہ میں بلایا۔ گوئبلز چند منٹ کے لیے باہر آیا اور ہٹلر کے باڈی گارڈوں کو حکم دیا کہ چانسلری کے نیچے واقع ٹرانسپورٹ دفتر سے گیسولین لے آئیں۔ وہاں سے صرف چالیس گیلن گیسولین ملی۔ گیسولین تہ خانے کے دروازہ کے پاس رکھ دی گئی۔

ڈھائی بجے بعد دوپہر ہٹلر اور ایوا براون آخری مرتبہ زندہ باہر نکلے۔ انھوں نے گوئبلز اور بورمین سے ہاتھ ملائے۔ ہٹلر اور ایوا براؤن آخری بار اپنے کمرہ میں گئے۔ گوئبلز، بورمین اور ڈاکٹر سٹمپ فیکر کانفرنس روم میں کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ بیس منٹ کے بعد انھوں نے پستول کی آواز سنی اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہٹلر نے گولی مار کر اپنا دماغ اڑا لیا تھا۔ اور اس سے پہلے ہی ایوا براؤن زہر کھا کر ختم ہو چکی تھی۔

ایک عینی شاہد نے لاشوں کو جلانے کے متعلق عجیب کہانی بیان کی ہے۔ اس کا بیان ہے

"جب گولے باغ میں گرجنے لگے تو میں تہ خانہ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں چھپتا چھپاتا تہ خانے کے دروازہ کی طرف آیا۔ وہاں دو لاشیں پڑی تھیں اور ان کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اچانک لاشیں جل اٹھیں۔ ہوا یہ کہ گوئبلز اور بورمین روسی گولوں سے ڈر کر تہ خانہ کے دروازہ کی آڑ میں ہو گئے اور انھوں نے وہیں سے ایک جلتا ہوا کپڑا لاشوں پر پھینکا۔"

اتحادیوں کی ناکام حسرت

ہٹلر کی خودکشی کے تین دن بعد برلن نے ہتھیار ڈال دیے۔ کچھ پانچ دنوں کے بعد ساری جرمن افواج نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی۔ اتحادیوں کی تمنا تھی کہ ہٹلر کو زندہ گرفتار کر کے ساری دنیا میں اس کی نمائش کریں گے مگر وہ اپنی مسرت کا اظہار اس کی لاش پر بھی نہ کر سکے۔

جو مصائب میں سے ہنس ہنس کے گزر جاتے ہیں
منزلیں ساتھ ہی رہتی ہیں جدھر جاتے ہیں ——— پیامؔ

مسولینی کے رومان

غضبناک ہجوم مسولینی پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی محبوبہ نے آگے بڑھ کر اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اپنی حفاظت میں لے لیا مگر بدلم لتی بندوقوں نے شعلے اگلے۔ بیسیوں گولیاں مسولینی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ جینی زرد پڑ گئی۔ مگر جمہوریت پسند سپاہیوں نے اس کا سینہ بھی چھلنی کر دیا اور وہ مسولینی کی لاش پر دو آنسو بھی نہ بہا سکی۔

حُسنِ معصوم کڑکتی دھوپ میں دریا کے کنارے ایک نوجوان لڑکی منہ دھو رہی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی تھی۔ پنڈلیاں گھٹنوں تک برہنہ تھیں۔ اس نے اپنے پاؤں پانی میں لٹکا رکھے تھے اور منہ پر چھینٹے دے رہی تھی۔ کبھی کبھی متجسس نظروں سے ادھر ادھر بھی دیکھ لیتی۔ جب اسے کوئی انسان دکھائی نہ دیتا تو گنگنانے لگتی۔ خاصی دیر تک اسی طرح مصروف رہی۔ اچانک نہ جانے اُسے کیا خیال آیا کہ قمیص بھی اتار دی۔ اب صرف ایک باریک ریشمی بنیان اس کے بدن پر باقی رہ گئی تھی۔ شاید دھوپ کی تمازت دُور کرنے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پانی سے تر کیے اور پیٹھ پر پھیرنے لگی۔ پھر بالوں کو تر کیا، پاؤں ملے اُٹھ کر دوبارہ قمیص پہن لی۔ اور قریب مٹی کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر دھیمی سروں میں گانے لگی۔ اسے یہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دھوپ نے وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا اور وہ دو فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں سامنے پتھروں پر جمی ہوئی تھیں جن پر چھوٹے چھوٹے گیلے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے اس لڑکی نے دھوئے تھے اور انہیں خشک کرنے کے لیے دھوپ میں بچھا رکھا تھا۔

وہ خاصی دیر تک بیٹھی رہی۔ دوپہر کا سورج ڈھل چکا تھا اور شام ہونے کے قریب تھی مگر وہ بدستور بیٹھی رہی۔ اس لیے کہ وہ کپڑوں کے خشک ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ کپڑے اس نے ساتھ لے جانے تھے وہ اٹھی ایک ایک کپڑے کو الٹ کر پھر اسی جگہ ڈال دیا۔ ان

مسولینی

میں کچھ نمی باقی تھی۔ وہ درخت کے نیچے مزید کچھ دیر کے لیے بیٹھی رہی یہاں تک کہ کپڑے بالکل خشک ہو گئے اور وہ انھیں سمیٹ کر پھر اُسی درخت کے قریب آئی اور کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر سرہانے رکھ کر دراز ہو گئی ——— معلوم ہوتا تھا وہ کسی کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک طلب | " تم یہاں کیسے بیٹھی ہو؟" ایک اُنیس سالہ نوجوان اُس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے پوچھنے لگا۔

لڑکی ایکدم اٹھ بیٹھی " تم کون ہو اور کیوں پوچھتے ہو؟"

" میں ایک اجنبی مسافر ہوں یونہی پوچھ رہا ہوں"

" میں اپنی ماں کا انتظار کر رہی ہوں ہمیں سامنے گاؤں میں جانا ہے"

لڑکا مسکراتا ہوا اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ " کیا میں تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں ؟

" میرا نام ڈونار اشیل ہے"۔

" کیا تم کپڑے دھونے کا کام کرتی ہو؟" نوجوان نے گٹھری کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ لڑکی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ نوجوان اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ لڑکی نے گٹھڑی اٹھائی اور چلنے لگی۔ نوجوان کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اُس نے اخبار تہ کیا جیب میں ڈالا اور اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

" تم میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو؟"

" میں تو چاہتا تھا کہ تمھارے ساتھ کچھ باتیں کرتا مگر تم تو جانے لگیں"۔

لڑکی رُک گئی " کیا باتیں ؟"

" تم تھوڑی دیر بیٹھو - تو کچھ کہہ سکیں"۔

لڑکی کچھ جھینپ سی گئی پھر بے پرواہی سے منہ موڑ کر تیزی سے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ نوجوان اپنی جگہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی، شاید وہ اپنی ماں کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے اُس درخت کے نیچے آنا تھا اور اسی لیے وہ وہاں بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر نو وارد شخص کی باتوں نے اُسے وہاں سے

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نووارد کا نام بنٹو مسولینی تھا۔

ڈونا راشیل ڈونا راشیل لوزان[1] کے ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ دریا کے کنارے کپڑے دھونے آیا کرتی تھی۔ ۱۶ سال کی عمر، نیلی آنکھیں، مضبوط جسم، سفید رنگ، لمبے سنہری بال۔ اُس کا حُسن چاند کو شرماتا تھا۔ پتلے اور سادہ ریشمی لباس میں وہ حُسن کی ملکہ دکھائی دیتی تھی۔ اُس کی آواز میں بلا کی کشش اور مٹھاس تھی۔ اس عمر میں اُسے گانے کا بہت شوق تھا۔ وہ عموماً کپڑے دھوتے وقت گنگناتی رہتی تھی۔ حُسن و رعنائی کے ساتھ ساتھ اُس کے دلکش اور شیریں نغموں نے اُسے اپنے گاؤں اور آس پاس کے تمام علاقے میں مشہور کر رکھا تھا۔

دیارِ غیر بنٹو مسولینی کا باپ لوہار کا کام کرتا تھا۔ وہ ۱۸۸۳ء میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ باپ کی خواہش تھی کہ اُسے اِس پیشے میں لگائے۔ مگر مسولینی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ غربت کے باعث وہ باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اپنی محنت سے چند ایک کتابیں پڑھیں ساتھ ہی باپ کا ہاتھ بھی بٹاتا رہا۔ اُنیس برس کی عمر میں وہ ایک معمولی لوہار بھی بن گیا اور کسی حد تک بچّوں کو پڑھانے کے قابل بھی ہو گیا۔ چونکہ لوہار کے پیشے سے اُسے نفرت تھی۔ اس لیے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہا، مگر کم عمری کے باعث نہ ہی کوئی مناسب کام ملا اور نہ ہی ذریعہ معاش کے سدھرنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں قسمت آزمائی کے لیے سوئٹزرلینڈ چلا آیا۔ چونکہ بیکار تھا اور زندگی گزارنے کے لیے کوئی اثاثہ بھی پاس نہ تھا اس لیے مجبوراً محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا رہا۔ ساتھ ہی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ حالت بہرحال خستہ رہی۔ ملک کے سیاسی معاملات کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ اس لیے اخبار کے مطالعہ کا بھی شروع ہی سے شوق رہا۔ وہ دن بھر لوسرین[2] کے گلی کوچوں میں کام کی تلاش میں پھرتا۔ کوئی کام

---

[1] سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر جو جھیل جنیوا کے قریب واقع ہے مشہور ریلوے جنکشن۔ آبادی ایک لاکھ سے اوپر ہے

[2] سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر جس کی لمبائی ۲۳ میل کے قریب ہے۔ اس کے جنوب میں جھیل لوسین واقع ہے۔ کوہ ایلپس کے سلسلے اس کے جنوب میں واقع ہیں۔

مل جاتا تو کر لیتا اور اس دن کے لیے روٹی کی سبیل پیدا ہو جاتی اور جہاں جگہ ملتی سو جاتا۔

دیارِ حسن | لوسرین میں کئی ماہ گزارنے کے بعد بھی مسولینی کی قسمت نہ بدلی۔ خستہ حالی نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔ چنانچہ ایک دن تنگ آ کر وہ گاڑی پر سوار ہوا اور لوزان چلا آیا۔ ڈونا راشیل سے مسولینی کے معاشقے کی داستان یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ لوسرین کی طرح لوزان میں بھی وہ ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا جب مایوس ہو کر شہر کے ماحول سے گھبرانے لگتا تو طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے شہر کے مضافات میں نکل جاتا اور قدرتی مناظر سے اپنا جی بہلاتا۔ جب پہلے دن اس نے ڈونا راشیل کو گھاٹ پر کپڑے دھوتا دیکھا، تو وہ اس کے حسن اور اس کی الھڑ جوانی سے اتنا متاثر ہوا کہ دیر تک ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر اس کی تمام حرکات کو دیکھتا اور ان سے لطف اندوز ہوتا رہا چنانچہ جب وہ کپڑے اکٹھے کر کے درخت کے نیچے لیٹ گئی تو مسولینی نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اس سے تعلق قائم کرنے کے لیے وہاں آ گیا۔

مفلس عاشق | پہلے دن کی ملاقات میں دونوں کا مختصر تعارف تو ہو گیا مگر راشیل نے اس سے زیادہ باتیں نہ کی تھیں اور اس سے پہلو بچا کر چلی گئی تھی۔ چنانچہ مسولینی مایوس ہو کر لوٹ گیا مگر دوسرے دن پھر اسی وقت وہاں پہنچ گیا جہاں پہلے دن اس نے راشیل کو دیکھا تھا۔ راشیل حسب معمول پھر وہاں کپڑے دھونے آئی ہوئی تھی۔ آج دوبارہ مسولینی نے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ راشیل کے لیے وہ اپنے دل میں محبت کے جذبات محسوس کرنے لگ گیا تھا مگر راشیل اس کی بھونڈی صورت سے غیر متاثر نظر آتی تھی۔ تاہم مسولینی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ملازمت کی تلاش میں مصروف رہنے کے باوجود وہ روزانہ مخصوص وقت پر وہاں آ جاتا اور کچھ دیر کے لیے راشیل سے گفتگو ہو جاتی۔ کئی دنوں کی مسلسل ملاقات اور گفتگو سے راشیل بھی مسولینی کے متعلق کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ چکی تھی۔ وہ مسولینی کے بھدے اور کرخت چہرے میں کچھ نہ کچھ کشش محسوس کرنے لگی تھی اور وہ اس کی دلچسپی کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

ملاقات کا یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ اب راشیل کا رویہ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ مسولینی کی خستہ حالی پر اسے ترس آنے لگا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے دل میں مسولینی کی قدر بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوپہر راشیل اور مسولینی نے جھاڑیوں کے ایک جھرمٹ

میں پیار و محبت کی طویل گھڑیاں گزاریں۔ دِل مل چکے تھے اب لب بھی ملنے لگے اور رفتہ رفتہ مفلسی کی محبت پروان چڑھنے لگی ؎

کس خرابے میں زیست آ پہنچی !
میں تہی دست، تُو تہی دامن !

اونچی اڑان راشیل کی محبت نے مسولینی کی ہمت بندھائی اور وہ معاشی میدان میں پہلے سے بڑھ چڑھ کر تگ و دو کرنے لگا۔ سال بھر تک اس نے معلمی کا پیشہ اختیار کیے رکھا۔ مگر طبیعت کا رجحان زیادہ تر سیاست کی طرف تھا۔ مضمون نویسی سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی اس لیے زیادہ وقت اخبارات و رسائل کے مطالعہ میں گزارتا۔ اب اس نے جرنلزم کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس نے فرانسیسی زبان بھی سیکھ رکھی تھی۔ اطالوی اور فرانسیسی زبان میں زبردست سیاسی مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ یہ مضامین اخباروں میں چھپے اور مسولینی کے نام سے لوگ روشناس ہونے لگے۔

اب کیفیت یہ تھی کہ وہ ملک کی سیاسی انجمنوں میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے مضامین اتنے دلچسپ ہوتے کہ اخبارات خود اس سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان کے لیے کچھ لکھے۔ علاوہ ازیں اب وہ مزدوروں کی انجمنوں میں تقریریں بھی کرنے لگ گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی لیڈر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنے لگا۔

اب مسولینی پہلے کی طرح مفلس اور آوارہ نہ رہا تھا۔ معاشی لحاظ سے اس کی حالت سدھر رہی تھی اور وہ شہرت بھی حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب اس کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں، تاہم راشیل سے اس کے تعلقات بدستور بڑھتے گئے اور کسی نہ کسی طرح اس سے ملاقات کا وقت ضرور نکال لیتا۔ راشیل بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ راشیل نے وہ وقت بھی دیکھا تھا جب اس کا چاہنے والا ایک مفلس اور کنگال مسافر کی حیثیت سے اس سے ملا تھا، اور اب یہ کیفیت تھی کہ وہ نہ صرف معاشی لحاظ سے ترقی کر چکا تھا بلکہ ملک میں اس کی شہرت پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

پہلی افتاد مسولینی نے فرانسیسی زبان میں سیاسی و معاشی مصنفوں کی کئی کتابیں پڑھی تھیں

جن سے متاثر ہو کر وہ سوشلزم کو پسند کرنے لگ گیا تھا۔ چنانچہ وہ سخت قسم کا سوشلسٹ لیڈر بن گیا۔ اس کی دھواں دھار تقریروں نے مزدوروں اور ملک کے عام لوگوں میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ اخبارات میں اس کی تعریف و توصیف میں مضامین نکلنے لگے۔ پھر جب اس نے مزدوروں سے ہڑتالیں کرانی شروع کر دیں تو حکومت کی نظریں اس کی طرف اٹھیں، اور اسے سوئٹزرلینڈ سے نکال دیا گیا ——— وہ اٹلی واپس آ گیا۔

۵ ان کی محفل کی گرمیوں کے طفیل
پھول سے اُٹے اور شرر سے گئے

دردِ فراق مسولینی لوزان چھوڑ کر چلا گیا۔ راشیل کے دل کی دنیا ویران ہو گئی چونکہ مسولینی کو اچانک دیس نکالا ملا، وہ راشیل کو اس کی اطلاع بھی نہ دے سکا کہ وہ جا رہا ہے۔ تاہم راشیل کو اس کی خبر مل گئی۔ راہ و رسم کے اس طویل عرصے میں مسولینی اُس کے دل و دماغ پر چھا چکا تھا وہ ہمیشہ اُس کی یاد میں مستغرق رہتی۔ مسولینی سے اُس کی ملاقوں کا عرصہ بہت دلچسپ رہا۔ اس لیے کہ اگرچہ مسولینی کی شکل و شباہت اور اُس کا جسم دلکشی سے محروم تھا

مگر اُس کی گفتگو میں راشیل کے لیے بلا کی کشش تھی۔ مسولینی گھنٹوں اُس سے باتیں کرتا رہتا اور وہ کبھی نہ اُکتاتی۔ اگرچہ گھاٹ پر عشق و محبت کے افسانے اور کپڑے دھونے کا مشغلہ دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتے تاہم راشیل کے لیے کپڑے دھونے میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ اُس کی توجہ کا اصل مرکز مسولینی تھا۔ مسولینی کے ملک بدر ہو جانے کے بعد راشیل کے لیے دریا پر جانے میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی، مگر وہ مجبور تھی۔ کیونکہ کپڑے دھونا ہی اُس کا پیشہ تھا اور اسی پیشے کے طفیل وہ اور اُس کی ماں زندگی کے دن گزارتے تھے۔

وہ اب بھی حسبِ معمول کپڑے دھونے جاتی مگر اپنے کام کے دوران اس کے لبوں سے گنگناہٹ کی جو آواز نکلا کرتی تھی وہ اب بند ہو چکی تھی اُس کے چہرے کی رعنائی اور بدن کی تروتازگی میں بھی فرق آ گیا۔ وہ تھکے جسم کے ساتھ اپنا کام کرتی اور لوٹ آتی۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن اُس کے بجھے دل میں ضرور فروزاں رہی۔ اُسے یقین تھا کہ مسولینی پھر بھی آئے گا۔ دن گزرتے گئے، مہینے اور پھر سال گزر گئے نہ مسولینی لوٹ کر آیا اور نہ اس کا کوئی نامہ و پیام ملا۔

ع جشنِ فردا کے وہ امکاں نہ فنا ہو جائیں!

تحریر اٹلی پہنچ کر مسولینی نے ایک اخبار نکالا۔ اُسے سوشلزم سے والہانہ عشق تھا۔ قدرت نے اسے فطری ذہانت اور صلاحیت سے بھی بہرہ ور کر رکھا تھا۔ اُس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اہلِ اٹلی کے سامنے اس اخبار کے ذریعے سے نمایاں کر کے رکھ دیں۔ اُس نے مضامین لکھے مکالے لکھے، ملکی حالات پر تبصرے کیے۔ نظامِ حکومت اور ملکی سیاست پر شدید تنقیدیں کیں۔ مزدوروں کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اُس کی تحریروں اور تقریروں کی شدت سے ملک میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ آخر ایک مضمون کی پاداش میں حکومت اٹلی نے سزا دی۔

سزا ختم ہونے پر اُس نے از سرِ نو اپنی سرگرمیاں کا آغاز کر دیا۔ اگرچہ اُس کے ذہنی ماحول میں رومانی تصورات کی گنجائش نظر نہ آتی تھی تاہم وہ فرقت کی اِس طویل مدت میں بھی راشیل کو فراموش نہ کر سکا۔ ایک عرصے کے بعد وہ پھر راشیل کے گاؤں گیا۔ راشیل کی ماں سے کوئی بات مخفی نہ تھی۔ مسولینی کے لیے اُس کے دل میں بھی قدر موجود تھی۔ وہ مسولینی کے کاموں اور اس کی شہرت کے زیرِ اثر اُسے اپنا داماد بنانے میں فخر محسوس کرتی تھی۔ ادھر راشیل کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اتفاق سے مسولینی کی اس آمد کا مقصد بھی یہی تھا۔ چنانچہ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ مسولینی اور راشیل اٹلی میں رہنے لگے۔ ع

تیرے گلشن میں بہار آئی اگر آ تو گئی

عروجِ کمال اب مسولینی اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر بن چکا تھا۔ اُس نے دوبارہ اخبار جاری کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد اُس کا نام ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا اور وہ اٹلی کے بڑے لیڈروں کی صف میں شمار ہونے لگا۔ ایک سخت مضمون کی پاداش میں دوبارہ سزا ہوئی اور جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر اُس کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو اُس نے اٹلی کو غیر جانبدار رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں اس نے بڑے زوردار مضامین لکھے، پُرجوش تقریریں کیں اور ملک کا بہت بڑا طبقہ اس کا ہمنوا بن گیا۔ جنگِ عظیم کے دوران مسولینی نے فوجی حملے کی مدد سے حکومت میں اچانک انقلاب لانے کی کوشش کی۔ ۲۷۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو اٹلی کے پایۂ تخت روم پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اُس دن دو لاکھ مسلح رضاکار روم

میں داخل ہوئے۔ بادشاہ گھبرا گیا۔ مسولینی کے ساتھیوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے موجودہ وزارت کو برخاست کر کے مسندِ وزارت مسولینی کی جماعت (فسطائیوں[1]) کو سونپ دی جائے۔ بادشاہ نے جان کے خوف سے ایسا ہی کیا اور مسولینی کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ مسولینی نے نہایت خاموشی کے ساتھ وزارت بنائی جس میں ۳۰ وزیر تھے۔ وزیرِ اعظم کی حیثیت سے سارے اختیارات مسولینی نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ وہ اٹلی کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ اِس وقت اُس کی عمر ۳۹ سال تھی۔

وادیٔ عیش مسولینی اپنی محبوبہ کے ہمراہ عالیشان محل میں رہتا تھا۔ اٹلی کا ملک اُس کے آہنی پنجوں کی گرفت میں آچکا تھا اور ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ کسی کو اُس کے سامنے چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ راشیل کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ مسولینی کی عظمت کے سامنے راشیل اس طرح سرنگوں رہتی تھی، جس طرح پُجارن کسی دیوتا کے حضور میں۔ مسولینی بھی اُس سے بیحد خوش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیاسی ہنگاموں کی دنیا میں راشیل کی محبت ہی وہ پُرسکون وادی ہے جس میں وہ دو گھڑی کے لیے قلبی سکون حاصل کر کے اپنے دل و دماغ کو تروتازہ کر سکتا ہے۔ مگر نہ اُسے معلوم تھا اور نہ راشیل یہ جانتی تھی کہ ان کی پُرمسرت زندگی میں اچانک ایک نیا شگوفہ پھوٹ کر اُن کی مملکت محبت کو تاراج کرنے والا ہے۔ ؎

سُنا ہے شاخِ نشیمن کو چھونے والی ہے
جو آگ ابھی گل تریں دبی دبی سی ہے!

نیا شگوفہ روم کے ایک عظیم الشان ناچ گھر میں خلافِ معمول ہنگامہ نظر آتا تھا۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے، جن کی چکا چوند سے

---

[1] یہ ایک تحریک تھی جو ۱۹۱۸ء میں مسولینی کے زیرِ قیادت اٹلی میں چلائی گئی۔ اس کا مقصد سوشلسٹوں کو دبانا تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں یہ جماعت اٹلی میں برسرِ اقتدار آئی اور انھوں نے روم پر چڑھائی کر دی۔ جرمنی میں یہ جماعت اگست ۱۹۳۴ء میں اس وقت برسرِ اقتدار آئی جب ہنڈن برگ کی موت کے بعد ہٹلر نے طاقت پکڑ لی۔ فسطائیت کے اصول کے مطابق ملک کا اقتدار اعلیٰ فردِ واحد کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔

آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اسٹیج کو خوشنما پردوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اسٹیج کے قریب شاہی گیلری میں اٹلی کا مختارِ کل مسولینی اپنے دوستوں اور فوجی افسروں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ اسٹیج خالی تھا اس لیے تماشائیوں کی نظریں اپنے ملک کے ڈکٹیٹر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں آج یہاں ہالی وڈ کی حسین وجمیل اور مشہور رقاصہ میسلے میرانڈا کا ناچ ہونے والا تھا۔ یہ رقاصہ اٹلی ہی کی رہنے والی تھی۔ مگر اوائل عمر ہی میں ہالی وڈ چلی گئی تھی جہاں اُس نے کئی مشہور فلموں میں کام کرنے کے بعد بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کی شہرت کی دھوم سارے یورپ میں مچی ہوئی تھی۔ رقص میں اور کوئی اداکارہ اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ وہ روم میں پہلی بار اپنے حسن کا جلوہ، اداکاری اور رقص کے جوہر دکھانے آرہی تھی۔

دفعتہً پردہ اُٹھا ایک ہلکے ساز کی آواز فضا میں بکھری۔ اُس کے ساتھ ہی ایک نوجوان مجسمۂ حسن وجمال نیم عریاں لباس میں کولہے مٹکاتی برقِ نظر گراتی اور شعلۂ حُسن سے تماشائیوں کے خرمنِ دل میں آگ لگاتی اسٹیج پر آئی۔ ہال میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ ہزاروں نظریں اٹھیں، ہزاروں دل پھڑکے۔ رقاصہ ساز سے ہم آہنگ ناچ دکھانے لگی۔ اس کی ایک ایک ادا پر سینکڑوں دل نثار ہو رہے تھے، اچانک گہری خاموشی میں تالیوں اور تحسین و آفرین کی آوازیں گونج اٹھیں۔ رقاصہ مسکرا رہی تھی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اُس کے مرمریں جسم کا انعکاس تماشائیوں کی آنکھوں کو بے نور کر رہا تھا۔ مگر ہر آنکھ غرقِ جلوہ تھی۔ مسولینی بھی اپنے آپ میں نہ رہا وہ اپنی کرسی پر آگے کو جھک گیا۔ اُس کا پُرسکوت اور متحیر چہرہ اُس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ رقاصہ نے مختلف انداز سے کئی ناچ دکھائے۔ مسولینی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج وہ زندگی کے کسی نئے موڑ پر آپہنچا ہے۔ کبھی آگے جھکتا کبھی پیچھے ہٹتا وہ اپنا دل ہار چکا تھا۔ مگر حاکمانہ ثقاہت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دلی تاثر کو ہر حالت میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس کے دوست اور ساتھی جو اس کے قریب بیٹھے تھے اُس کے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے۔

رقاصہ اپنی اداکاری اور کمالات کے جوہر دکھا کر اسٹیج سے غائب ہو گئی۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ شور وغل کے ماحول میں مختلف کونوں سے رقاصہ کے لیے پھر فرمائش

ہو رہی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر گزری تھی کہ رقاصہ پہلے سے بھی زیادہ عریاں حالت میں ایک بالکل نئے انداز سے اسٹیج پر آئی۔ اس بار اس نے خالص اطالوی ناچ کا نمونہ دکھایا۔ ہال کی روشنیاں گل کر دی گئیں، صرف اسٹیج پر مدھم سی روشنی چھوڑ دی گئی۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ـــــ ـــــ کوئی بھی اس برہنگی کی تاب نہ لا سکتا۔

اچانک یہ مدھم روشنی بھی گل ہو گئی اور سارے ہال میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا ـــــ لمحہ بھر کے بعد ہال پھر جگمگا اُٹھا ـــــ اسٹیج خالی تھا ـــــ

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مسولینی کا دل نئے تاثرات اور خوفناک عزائم کی جولانگاہ بن چکا تھا۔

حسنِ مغموم مسولینی کے محل کے ایک کمرے میں میرانڈا صوفے پر مغموم لیٹی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اخبار اٹھا کر کچھ پڑھ لیتی اور پھر میز پر رکھ دیتی۔ معلوم ہوتا تھا وہ آج بڑی بے چین ہے۔ اچانک ایک فوجی افسر کمرے میں داخل ہوا اور کچھ خطوط پیش کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی ڈاک ہے۔" اور باہر نکل گیا۔

میرانڈا نے لیٹے لیٹے باری باری سے خطوط پڑھے۔ پھر کروٹ بدل کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اس حالت میں نصف گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ مسولینی اندر داخل ہوا۔ میرانڈا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میری باتوں کا بُرا منایا تم نے۔" مسولینی نے اُس کے غمگین چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر اُس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرانڈا نے گردن اٹھائی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے مسولینی کی طرف دیکھا پھر صوفے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ مسولینی کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولتی کیوں نہیں میرانڈا؟" مسولینی اٹھ کر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اتنی جلد بدل جائیں گے۔ میں آپ کی خواہش پر آپ کی مہمان بنی۔ پھر آپ ہی کی خواہش پر اپنا پیشہ چھوڑ کر آپ کی خدمت میں رہنا قبول کیا۔ مگر ـــــ ـــــ دو ہی مہینے تو گزرنے پائے ہیں اور آپ کا جی مجھ سے بھر چکا ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے نفرت ہو چکی ہے تو اپنی راہ لیتی ہوں۔ مگر ـــــ میری ـــــ رہائی؟"

وہ رونے لگی۔

مسولینی اٹھ کھڑا ہوا۔" میرانڈا۔ تم نے مجھے غلط سمجھا۔ میں تمھارے لیے اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک معقول رقم تمھیں دیتا رہوں۔ میرا جب جی چاہے تمھیں ملوں۔ میں ہر وقت تمھاری صحبت میں نہیں رہ سکتا، میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ بس تمھاری ہی دلجوئی میں لگا رہوں ———— مگر یاد رہے تم یہیں میرے محل میں رہو گی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ مسولینی کی محبوبہ لوگوں کو محظوظ کرے۔ میں تمھیں وہ درجہ نہیں دے سکتا جو راشیل کو دے چکا ہوں اور جو باتیں تم نے راشیل سے کہی ہیں وہ اب نہ کہنا"

" مگر . . . . "میرانڈا یہی لفظ کہنے پائی تھی کہ مسولینی غضبناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

" مگر وگر کچھ نہیں۔ یہ مسولینی کی عزت اور عظمت کا مسئلہ ہے۔ تمھارے لیے یہی فخر کافی ہے کہ تم میرے محل میں رہ رہی ہو اور میری نگاہِ کرم کی مستحق سمجھی گئی ہو"

مسولینی یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور میرانڈا اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے کے لیے باقی رہ گئی۔

ترا وصال شکستِ جمال ہی تو نہیں ! جنوں نڈھال ہے کیوں آرزو ہے کیوں مدہوش

بدنام کُن فوجی کارنامہ

اگرچہ مسولینی کا فسطائی فلسفہ اور اس کی فوجی تنظیم ایک عرصہ سے دنیا کی نظروں میں کھٹک رہی تھی اور دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں اس کے سخت خلاف ہو چکی تھیں۔ مجلس اقوام میں بھی مسولینی کے خلاف بہت کچھ کہا سنا جا رہا تھا تاہم اٹلی کا نام مجلس کے اراکین میں شامل تھا۔ اور کامل یقین نہ تھا کہ وہ دنیا کے امن میں خلل ڈالے گا مگر ۱۹۳۶ء میں اچانک اس نے حبشہ کے خلاف جارحانہ اقدام کر دیا۔ لیگ نے اس مسئلہ میں ثالث بننا چاہا مگر مسولینی نے اسے نامنظور کر دیا اور تمام بین الاقوامی معاہدوں کو توڑ کر حبشہ پر دھاوا بول دیا۔ دنیا کے قریباً تمام ملکوں نے مسولینی کے اس طرزِ عمل کے خلاف واویلا کیا اور حبشہ کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی، مگر مسولینی نے کسی کی بھی پروا نہ کی، بلکہ دنیا کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر کسی ملک نے اٹلی کے ہاتھ ہتھیار بیچنے کو ممنوع قرار دیا تو اٹلی اس کے خلاف بھی نبرد آزما ہو جائیگا۔

اس دھمکی نے سب کو خاموش کر دیا۔ اگرچہ فرانس جرأت سے کام لے کر آخر دم تک یہی کہتا رہا کہ حبشہ کی مدد کرنی چاہیے، مگر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اتنا ہوا کہ مجلس اقوام کی صرف ان دفعات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا جن میں کوئلے، لوہے اور تیل وغیرہ پر پابندی لگائی جا سکتی تھی۔ یہ اقدام اٹلی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا اور نہ ہی اٹلی کے راستے میں رکاوٹ بن سکا۔ چنانچہ حبشہ اٹلی کے تصرف میں آگیا۔ بعد ازاں لیگ نے بھی عائد کردہ پابندیاں اٹھا لیں البتہ حبشہ کی اطالوی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔[1]

دو مظلوم ۱۹۳۶ء کے بعد تین چار سال تک مسولینی کی جنگی مصروفیات اتنی زیادہ رہیں کہ اُسے نہ اپنی بیوی راشیل کے ساتھ زیادہ مدت تک رہنے کا موقع مل سکا اور نہ ہی میرانڈا کے ساتھ ملنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔ راشیل بہت نیک دل اور باوفا عورت تھی۔ مسولینی کی طبیعت نہایت درشت اور اس کے مزاج میں غصہ بہت زیادہ تھا۔ راشیل اس کی ان کیفیات سے پوری طرح واقف تھی اور چونکہ بہت سمجھدار عورت تھی اس لیے مسولینی کو کبھی موقعہ نہ دیا کہ وہ کسی بات پر اس سے برہم ہو۔ تاہم مسولینی عادتاً بے پروا واقع ہوا تھا۔ راشیل سے اُسے بے حد محبت ضرور تھی، مگر مصروفیات کے ہجوم میں اس کی توجہ اس سے بھی ہٹتی جا رہی تھی اور میرانڈا کو تو

---

[1] اگر ۱۹۴۰ء میں اٹلی جرمنی کی حمایت میں اعلانِ جنگ نہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ مجلس اقوام حبشہ کے اس علاقہ پر اٹلی کے قبضہ کو جائز تسلیم کر لیتی۔ مگر اٹلی کا یہ اعلان حبشہ کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں جب اتحادیوں نے حبشہ کے پایۂ تخت ادیس ابابا پر قبضہ کیا اور چونکہ اس وقت جنگ پورے زوروں پر تھی، اس لیے دنیا کی نظروں میں نیک نامی حاصل کرنے کے لیے اتحادیوں نے یہ طریق کار اختیار کیا کہ شاہ حبشہ کو اس کا ملک واپس دے دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اٹلی کے حملہ کے وقت شاہ حبشہ بھاگ کر لندن میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۳۶ء سے وہیں رہ رہا تھا۔ اتحادیوں نے اسے دوبارہ اپنے تخت پر بحال کر دیا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی پہنچا کہ اہل حبشہ کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ ہو گئیں اور حبشہ کی طاقت کو جنگ میں استعمال کرنے کی راہ نکل آئی۔ ۵ مئی ۱۹۴۱ء کو شاہ حبشہ اپنے تخت پر بحال کیا گیا۔ حبشہ کے دوسرے علاقوں میں جہاں کہیں اٹلی کی فوجیں پڑی تھیں انھیں نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ یہ کام کئی ماہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اہل حبشہ نے بھی اس میں اتحادیوں کا ہاتھ بٹایا۔ پھر ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء کو اتحادی اقوام نے حبشہ کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

یقین ہو چکا تھا کہ مسولینی اُس کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ مگر مسولینی کی گرفت سے نکلنا دونوں کے لیے ناممکن تھا۔

نیا عشق ۱۹۳۹ء میں جبکہ اٹلی کی فوجیں البانیہ میں مصروفِ جنگ تھیں، مسولینی کو ایک نہایت خوبصورت اور نازک اندام دوشیزہ سے واسطہ پڑا، جس کا نام جینی تھا۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں جبکہ مسولینی البانیہ پر اپنا قبضہ جما چکا تھا، جینی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ مسولینی پہلی ملاقات ہی میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اگرچہ جینی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر مسولینی نے کچھ ایسا طریق کار اختیار کیا کہ جینی نے اپنا سر مسولینی کے قدموں میں رکھ دیا۔ وہ اٹلی کے مختلف علاقوں میں اُسے لیے پھرتا۔ مسولینی کی عمر اس وقت چھپن سال کی ہوگی اور جینی بمشکل اکیس برس کی تھی۔ میرانڈا کو تو مسولینی مدت سے فراموش کر چکا تھا۔ مگر جینی کی محبت میں اب اس نے اپنی وفا شعار بیوی راشیل کو بھی بھلا دیا۔ وہ روم میں رہتے ہوئے کئی کئی دن تک راشیل سے نہ ملتا۔ راشیل سے مسولینی کے پانچ بچے تھے مگر مسولینی نے بچوں کی طرف بھی کبھی توجہ نہ دی۔ یہ صورتِ حال راشیل کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

مسولینی کا رومانی مزاج مسولینی کی رومانی زندگی کے متعلق کئی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ اوائل عمر ہی سے عورتوں کا دلدادہ تھا اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں اس نے کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ مختلف مصنفوں نے ایسی کئی عورتوں کے نام گنائے ہیں جن سے مسولینی کا تعلق رہا۔ اور ان تعلقات کے متعلق مختلف داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں مسولینی سکول میں مدرس تھا اس زمانے میں بھی اس نے کئی لڑکیوں سے تعلقات قائم کیے۔

خوشتر گرامی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "مسولینی کو گوالٹیری نامی گاؤں کے دیہاتی سکول میں مدرس کی جگہ مل گئی جہاں اُسے مکان اور خوراک کے علاوہ چالیس لیرا ماہوار ملتے تھے اور ساڑھے آٹھ بجے صبح سے ایک بجے بعد دوپہر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ باقی وقت وہ بڑے بڑے آدمیوں کے حالات پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ اسے میکیاولی[1] کا یہ اصول بہت پسند آیا کہ

[1] میکیاولی (MACHIAVILLI) اٹلی کا ایک مشہور فلاسفر تھا۔ فسطائیت کے فلسفہ سیاست کی بنیاد

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس طرح بھی ہو اپنا مقصد حاصل کر لینا چاہیے۔

ہیلن سے دوستی گوالٹیری بڑی پُر فضا جگہ تھی اور خوبصورت لڑکیوں کی بھی کمی نہ تھی یہاں پہنچتے ہی ایک خوبصورت دوشیزہ سے اس کا تعارف ہوا اور مسولینی نے اسے جال میں پھنسانے کی ٹھان لی۔

اس وقت مسولینی کے لیے دن عید اور رات شب برات تھی۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی، وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا جو اس کا محبوب شغل تھا اور جب مزے میں آجاتا تو ستارے کر محبت کے ترانے گایا کرتا تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے دیوانی ہوئی تھیں لیکن جب ان کی ملاقاتوں کے چرچے ہونے لگے تو ان کے والدین نے انھیں مسولینی کے ساتھ ارتباط بڑھانے اور چاندنی راتوں کی سیر سے منع کر دیا۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسولینی اپنی بے کاری کے دنوں میں نجومی بن کر پیسے کمایا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بتایا کرتا تھا۔ اور اس طرح خاصا روپیہ کمالیا۔ اس فن میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۲) اسی نے رکھی تھی۔ وہ سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی کی بہت بڑی شخصیت مانا جاتا تھا۔ حکومت اور سیاست کے فلسفے پر اس نے جو معرکہ آرا کتاب لکھی وہ سیاسی دنیا کی بہترین تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمران اپنی قومیت اور برتری کو برقرار رکھنے کے لیے جو چاہے کر سکتا ہے خواہ اس کا فعل عام اخلاقی اصول کے مطابق ہو یا اس سے ہٹ کر۔ حکومت یا حکمران کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے دنیا کا کوئی کام اس کے لیے غیر اخلاقی نہیں۔ حکومت کو اخلاقی اصول پر عمل کرنے کا مطلق خیال نہ کرنا چاہیے بلکہ اس سلسلہ میں جس بات کی ضرورت ہو بلا تامل کر دینی چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر مکر و دغا، فریب، حیلہ اور جعل سازی سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان امور سے بڑھ کر بھی کچھ کرنا پڑے تو گریز نہ کرنا چاہیے۔ فرمانروا حکومت کے اخلاق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کی اپنی برتری اور عظمت قائم رہنی چاہیے۔ اس کے اخلاق کی بنیاد اس برتری اور عظمت کو قائم رکھنے کی ضرورت پر ہے۔ جب جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق عمل کر لیا جائے میکیاولی ۱۵۲۶ء میں مرگیا مگر اس کا یہ اصول سیاست آج تک زندہ ہے۔ اٹلی میں فسطائیت بالکل اسی اصول پر عامل رہی۔ روس میں بالشویک حکومت اسی پر عمل پیرا تھی۔

وہ ایسا ماہر تھا کہ بہت سی عورتیں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں پھنس کر اُس سے قسمت کے حالات پوچھنے آتیں اور وہ بہت مشہور ہو گیا۔

"اب مسولینی کی شہرت خوب پھیلی بڑے بڑے آدمیوں کی عورتیں اس سے اپنی قسمت کے حالات پوچھنے کے لیے آنے لگیں اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کے پاس کافی رقم جمع ہو گئی۔ فرانسیسی عورتوں اور نوجوان لڑکیوں میں اُسے ہر لحاظ سے اور ہر قسم کی کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس کا دل یہاں نہ لگتا تھا اُسے اپنی حسین اور طرار ہیلن یاد آ رہی تھی اور وہ سوئٹزر لینڈ جانے کے لیے بے قرار تھا۔ جہاں اس کی محبوبہ ہیلن رہتی تھی، اور جہاں پولیس بھی اس کی تلاش میں تھی۔

چونکہ اس راستے سے گرفتار ہو کر جیل میں ٹھونس دیے جانے کا خطرہ تھا، اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ رات کو پیدل سفر کیا جائے اور دن کو بھی ریل گاڑی میں سوار نہ ہو۔ ہیلن کے گھر پہنچا رات کا وقت تھا۔ مسولینی نے کھڑکی پر چند پتھر پھینکے۔ ہیلن کے ساتھ اس کی ایک سہیلی بھی گھر پر موجود تھی۔ دونوں باہر آ کر کسی نہ کسی طرح مسولینی کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ لیکن ہیلن مسولینی سے بخوبی واقف تھی اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اور اس کی سہیلی کسی اور کمرے میں جا سوئیں۔ مسولینی کو اس حرکت سے غصہ تو آیا لیکن کیا کر سکتا تھا مجبوراً ہیلن کے بستر پر لیٹ کر رات بسر کر دی۔

بے باک محبوبہ مسولینی کے اقتدار کے ابتدائی دنوں کے متعلق لکھا ہے کہ اس زمانے میں ایک خوش جمال اور دولت مند لڑکی مسولینی سے والہانہ محبت کرنے لگ گئی تھی اگر مسولینی اُس کی طرف زیادہ مائل نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ ان دنوں وہ بے حد مصروف رہتا۔ مصنف کا بیان ہے کہ "ایک نازک اندام اور خوبصورت امیر زادی کئی ہفتے پلازو ویمنال کے چکر کاٹتی دیکھی گئی، جہاں وزارت خارجہ کے سوا تمام وزارتوں کے دفاتر واقع تھے۔ یہ مسولینی کے عروج کے آغاز کا ذکر ہے جبکہ ملک کو ابھی ابھی اشتراکیت کی افراتفری اور خون خرابہ سے نجات ملی تھی۔

---

[1] مسولینی ان دنوں فرانس کے ایک گاؤں میں رہ رہا

مسولینی نے ان ہی دنوں ایک انگریز درزی سے نہایت چست اور نفیس کپڑے تیار کرائے تھے، ایک گھوڑا بھی خرید لیا تھا اور سنگِ مرمر کے خوش نما ایوانوں میں اس طرح پھرا کرتا تھا جیسے کوئی امیر، جس کا خاندان کئی پشتوں سے شاندار محلوں میں رہتا چلا آیا ہو۔ یہ ہیرزادی ہر روز مسولینی سے ملتی تھی اور مسولینی بھی محبت اور کامرانی کے نشہ میں سرشار اس کی جائے رہائش پر لوگوں سے خراجِ عقیدت وصول کیا کرتا تھا۔

یہ عورت بڑی حساس واقع ہوئی تھی۔ وہ مسولینی کے ساتھیوں کو اس کے گرد دیکھ کر حسد سے جل جاتی تھی۔ جب وہ اپنے محبوب کو ہر وقت سلطنت کی الجھنوں میں پھنسا ہوا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ارادوں کی تکمیل میں مصروف دیکھتی تو اس کے غصے کا پارہ کھولاؤ کے درجے تک پہنچ جاتا۔ وہ مسولینی کے ساتھ عیش و مسرت کے لمحے گزارنے کی خواہش مند تھی لیکن اٹلی کے مختارِ مطلق کو چند لمحوں کی فرصت بھی نہ ہوتی تھی۔

ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ کھٹ سے مسولینی کے کمرے میں جا داخل ہوئی اور فرش پر پاؤں مار کر بولی "کیا میں آپ سے تنہائی میں نہ مل سکوں گی؟ بالکل تنہائی میں ...... سیکرٹریوں اور ملازموں سے الگ . . . . آہ بالکل تنہا اور الگ !"

مسولینی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "اگر آپ ایک پہر کے تڑکے تشریف لائیں تو مجھے بالکل اکیلا پائیں گی۔ اس وقت بھی میں سلطنت کے کاموں میں بے حد مصروف ہونگا"

کلر تیا کی داستان

کلر تیا نام ایک اور اطالوی لڑکی سے بھی مسولینی کے رومان کی داستان بیان کی جاتی ہے۔ یہ لڑکی اطالوی فضائیہ کے ایک افسر ریکارڈو کی منگیتر تھی، مگر اسے اپنے منگیتر سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور مسولینی کی محبّت کا دم بھرتی تھی۔ عبدالقدیر رشک[1] نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "ریکارڈو اگرچہ اس کا منگیتر تھا لیکن وہ اس کو اپنے دل میں جگہ نہ دے سکی۔ وہ خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ لیکن کلر تیا کو جس سے محبت تھی اس نے کبھی کلر تیا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے انسان نہیں دیوتا نظر آتا تھا جسے پا لینے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا

---

[1] "سنگم اور سائے" مطبوعہ کتاب منزل لاہور

وہ بدقسمتی سے اپنے دل میں ایک ایسے مرد کو جگہ دے بیٹھی تھی جو پورے اطالیہ کی قسمت کا مالک تھا۔ سکول میں جب وہ کسی کتاب میں مسولینی کا نام پڑھتی تو اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی۔

اکثر تقریبات میں اس نے دُور کھڑے ہو کر مسولینی کو پیار بھری نظروں سے گھُورا۔ جب وہ شاہانہ ٹھاٹھ سے اپنی کار میں سوار ہونے لگتا، تو کلریتا مجمع کو ہٹاتی ہوئی آگے بڑھتی اور اپنی محبت کے دیوتا کو ایک نظر دیکھ لیتی۔

اس نے مسولینی کی تقریریں زبانی یاد کرلی تھیں۔ مسولینی کی جتنی تصویریں اُسے مل سکیں، اُس نے اکٹھی کرلیں۔ اس نے ان تصویروں کو سرہانے کے نیچے رکھ چھوڑا تھا۔ جب خدا کی ساری خدائی سو جاتی تو کلریتا چپکے سے اٹھتی، تصویریں نکالتی اور بڑی محویت سے انھیں گھورنے لگتی۔

اس نے لڑکپن کی سرحدیں پھاند کر جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو یہ احساسات اور بھی گہرے ہو گئے اور عقیدت نے آہستہ آہستہ محبت کا روپ دھار لیا۔

اطالیہ کے بعض دوسرے خاندانوں کی طرح پٹاکس کا خاندان بھی فاشزم[۱] کا حامی تھا۔ کلریتا، اس کا بھائی مارسلو اور اس کی بہن مریم پر بھی فاشزم کا رنگ بڑا گہرا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کلریتا بیسویں سال میں قدم رکھتے ہی مسولینی کو پوجنے لگی۔

---

[۱] اسی باب کے ایک فٹ نوٹ میں میکیاولی کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے فاشزم یا فسطائیت کے فلسفہ کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے۔ فاشزم جس اطالوی لفظ سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں گٹھا یا بنڈل۔ ۱۹۱۴ء کے بعد اٹلی کی سیاسی و معاشی حالت کو سدھارنے کے لیے جہاں اور جماعتیں بنیں وہاں ایک گروہ نے اپنی جماعت کا نام فاشسٹ رکھا جس سے مطلب صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم میں ویسا ہی اتحاد و استحکام ہے جیسا کہ بنڈل یا گٹھے میں ہوتا ہے اور ہم سب کے دل ایک گٹھے کی طرح ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں اس جماعت کا اصول سیاست اشتراکی جمہوریت یا جمہوری اشتراکیت تھا یعنی ایسی جمہوریت جس میں معاشی مسائل کا حل اشتراکی اصولوں کے مطابق ہو لیکن جب ملک میں کمیونزم کی آندھیاں تیزی سے چلنی شروع ہوئیں اور ادھر روس میں بالشویکوں نے سرمایہ داروں سے خونی انتقام لینا شروع کیا تو اٹلی کو روس سے خطرہ پیدا ہو گیا اس خطرے نے فاشسٹوں کا اصول سیاست بدل دیا اور اب وہ کمیونزم کی مخالفت کرنے لگے۔ پھر شاہیت پسند بن گئے۔ اور جب انھیں حق اقتدار ملی

۱۹۳۲ کی ایک گہری شام کا واقعہ ہے. کلریتا کا بھائی چھٹیاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے وقت تجویز پیش کی گئی کہ شام کو کار پر سیر کی جائے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے سفید بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑک صاف اور کشادہ تھی۔ مارسلو کو کار تیز چلانے میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ وہ کار چلاتے چلاتے میٹر پر جھک جاتا اور کار زیادہ تیزی سے فراٹے بھرنے لگتی۔ والدین کے منع کرنے کے باوجود کار کی رفتار تیز کیے جا رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے آنے والی کار کا عکس شیشے پر پڑا۔ کلریتا نے باہر جھانک کر دیکھا۔ خوبصورت سیلون ان کی کار سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر چلی آ رہی تھی۔ یہ مسولینی کی سرکاری کار تھی۔ اس نے چلا کر کہا:

"مارسلو! مسولینی کی سیلون کو گزر جانے دو۔"

کلریتا نے شیشے سے جھانک کر دیکھا مسولینی فوجی وردی پہنے اطمینان کے ساتھ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کلریتا نے محسوس کیا کہ وہ کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہے لیکن جونہی چمکیلے سیاہ رنگ کی کار ان کے برابر آئی وہ کھڑکی پر جھکی اور "ہیلو! ہیلو!" پکارنے لگی۔ سیلون کی رفتار اچانک مدھم پڑ گئی اور اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب کار آگے بڑھ کر رک گئی اور مارسلو کو بھی اپنی کار مجبوراً روکنی پڑی۔

خوف کے مارے کلریتا کے رخساروں پر زردی چھا گئی۔ سیلون کا ڈرائیور بھاگ کر پیچھے آیا۔ سلام کے لیے جھکا اور جھک کر سیلون کا دروازہ کھول دیا۔ ایک تنومند شخص سفید وردی پہنے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۶) تو وہ کسی ڈکٹیٹرشپ کے قائل ہو گئے اٹلی کی سیاست میں جو انتشار و پراگندگی پھیلی ہوئی تھی اس کے ہوتے ہوئے کسی اصلاحی کام کی گنجائش نہ تھی۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی تھی اور ہر ایک کا نعرۂ سیاست ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ان حالات میں فاشسٹوں نے اپنے وطن کی بھلائی اسی میں دیکھی کہ پہلے پورے اٹلی کو ایک سیاسی مرکز پر مجتمع کیا جائے اور تمام بکھری ہوئی طاقتوں کو ایک نقطے پر لا کر اکٹھا کیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی ایک "مجلس اعلیٰ" یا "فاشسٹ گرانڈ کونسل" کے چند افراد ہی جمہوریت کے پردے میں اٹلی کے واحد حکمران بن گئے۔ بظاہر پارلیمنٹ بھی تھی اور اس میں ہر خیال کے ممبر بھی منتخب ہو کر آتے تھے لیکن مسئلہ پہلے اسی گرانڈ کونسل ہی میں طے ہوتا تھا اور پارلیمنٹ اس فیصلے کی اتباع کرنے پر عملاً مجبور تھی۔

(تاریخ انقلابات عالم از ابوسعید بزمی)

سڑک پر آکھڑا ہوا۔ یہ مسولینی تھا۔

مسولینی کی پہلی نظر کار کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ کلریتا کا باپ پٹاکس، پوپ کا ڈاکٹر تھا۔ جس کا نشان اس کی کار پر لہرا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کار کی طرف بڑھا اور کار کے پاس آکر رک گیا۔

کلریتا شرمیلے انداز میں مسولینی کے سلام کے لیے جھکی۔ اس نے نظریں زمین پر گاڑ کر ان خطوں اور نظموں کا تذکرہ کیا جو اس نے وقتاً فوقتاً مسولینی کو بھیجی تھیں۔ مسولینی کو ایک لمحہ کے لیے احساس ہوا کہ وہ ایک حسین وجمیل لڑکی سے ہمکلام ہے۔ اس نے دیکھا کہ کلریتا موزوں قدوقامت رکھتی ہے اور اس کے چہرے پر رعنائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔

کلریتا نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے تھی، لیکن اس کی سادگی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ مسولینی اس وقت سے بے حد خوش تھا۔ وہ مسکراتا ہوا کلریتا کی داستان سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ کلریتا کے خاندان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ڈاکٹر پٹاس کو اس کی اعلیٰ حیثیت پر مبارک باد دی، لیکن اس کی دلچسپی زیادہ تر کلریتا تک ہی محدود رہی اور جب وہ اپنی کار کی طرف مڑا تو اس کی مسکراہٹوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کلریتا کے حسنِ جہاں سوز سے بے حد متاثر تھا۔

مسولینی نے ہیڈ کوارٹر پہنچتے ہی اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ کلریتا کے خطوط اور نظمیں پیش کی جائیں۔ مسولینی نے کلریتا کے خطوں اور نظموں کو ایک خوبصورت ربن میں باندھا، اور ان میں پھول رکھ کر انھیں واپس لوٹا دیا۔ کلریتا اس خدا ساز ملاقات کو ایک سپنا سمجھی تھی وہ سوچتی تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسولینی نے اس کے لیے اپنی کار روک لی ہو، لیکن جب اُسے ارغوانی پھولوں کا تحفہ ملا تو اسے اپنی آنکھوں پر کچھ کچھ اعتبار آگیا۔

ایک روز کلریتا کے باپ کو مسولینی کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا جس میں ڈاکٹر پٹاس کے تمام کنبہ کو مدعو کیا گیا تھا۔

مقررہ تاریخ پر کلریتا نے اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسا لیا۔ اگرچہ اس کا لباس بھڑکیلا نہیں تھا لیکن اسے پہننے میں ایک خاص سلیقہ برتا گیا تھا۔

وہ عمارت میں داخل ہوئے تو مسولینی ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جہاں مسالے کی بنی ہوئی ایک میز کے گرد نیلے رنگ کی کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ مسولینی کا پرائیویٹ کمرہ تھا جسے "ڈیڈک روم" کہا جاتا تھا۔ اس نے کلریتا کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنیں۔ وہ موسیقی اور مصوری کے متعلق اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتا رہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کلریتا موسیقی اور مصوری بڑے اچھے فن ہیں۔ ہو سکے تو ان میں کمال حاصل کرو۔"

مسولینی جانتا تھا کہ ڈاکٹر پٹاس اونچی حیثیت کا مالک ہے۔ اس نے پٹاس سے التجا کی کہ وہ اس کا بھی طبی مشیر بن جائے۔ جب ڈاکٹر پٹاس نے حامی بھرلی تو کلریتا کا چہرہ خوشی کے مارے دمک اٹھا۔ اس طرح مسولینی کو کلریتا سے اکثر مل سکنے کی توقع تھی۔ رخصت ہوتے وقت مسولینی کلریتا کی طرف دیکھ کر صرف مسکرایا۔

یہ عجیب و غریب قسم کی محبت تھی کیونکہ مسولینی کی بیوی موجود تھی اور چاہنے والی حسین عورتیں بھی۔ اس کی بیوی ریچلی نے پانچ بیٹوں کو جنم دیا تھا، لیکن مسولینی کی طبیعت میں عورتوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی......

کمسن کلریتا کے سامنے مسولینی کی زندگی کا کوئی تاریک پہلو نہیں تھا، وہ جوان تھی۔ شباب کی رعنائیاں اس کے رگ و ریشہ سے پھوٹتی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس "دیوتا" کی محبت کی وہ پجارن ہے وہ محبت کا جھوٹا دیوتا ہے، لیکن جب اسے مسولینی کی سیاہ کاری کا علم ہوا تو عشق کے میدان میں وہ بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اور اب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مسولینی کلریتا کے جذبات کا بڑا احترام کرتا تھا۔ پہلے پہل ان کی دوستی رسمی تھی۔ مسولینی کبھی کبھی اسے ملاقات کے لیے بلا لیتا۔ وہ دونوں سنگ مرمر کے چبوترے پر بیٹھ جاتے اور کنواری گھاس پر سورج کی رقص کرتی ہوئی کرنوں کا گھنٹوں نظارہ کرتے۔ کبھی کبھی جذباتی انداز میں مسولینی شاعری اور موسیقی پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتا۔

مسولینی کئی مہینوں تک کلریتا کے لطیف جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اسے کلریتا سے سچی محبت ہو گئی ہے۔ اس سے پیشتر اس کی زندگی میں جتنی عورتیں آئیں ان سے جوانی کی بہاریں لوٹنا مقصود تھا، لیکن ان میں سے کوئی عورت بھی اس کے دل میں محبت کی

آگ روشن نہ کر سکی۔

جب کلریتا کے منگیتر کو مسولینی اور کلریتا کے تعلقات کا علم ہوا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی لیکن کلریتا کے گھر والے اس رومان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے رہے۔ مسولینی سے تعلق پیدا کر لینے سے وہ کافی بارسوخ ہو گئے تھے۔ ریکارڈو مسولینی کی محبت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ کلریتا کے ساتھ اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ کلریتا کی ماں نے جل کر کہا "کلریتا کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو اس کی خدمت میں عرش کے تارے پیش کیے جاتے۔"

شادی کے بعد ریکارڈو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرنے لگا۔ لیکن شادی کے چار مہینے بعد کلریتا کی ماں نے ریکارڈو کو اعلیٰ سفارتی عہدے پر ٹوکیو بھجوا دیا اور کلریتا نے خاوند کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ محبت کی نئی راہیں تلاش کر چکی تھی۔ اور آنکھیں بند کیے ان پر رواں دواں تھی۔ ریکارڈو سے بچھڑ کر پہلے پہل تو وہ بے حد پریشان ہوئی اسے تنہا رہنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا لیکن مسولینی کی ملاقاتیں اس کا غم غلط کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ وہ پھر چہکنے لگی۔

ایک روز ایک حسین لڑکا کلریتا کے بھائی کے ساتھ کھانا کھانے آیا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور پرکشش تھیں اور جسم ملائم۔ وہ کنواری لڑکیوں کی طرح شرمیلا تھا۔ کلریتا اس لڑکے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے مسکراتی نظروں سے کلریتا کی طرف دیکھا اور گردن جھکا کر کہنے لگا "کلریتا میں پھر آؤں گا۔ دونوں مل کر پیانو پر پرسوز گیتوں کی دھنیں بجائیں گے۔"

اس نوجوان کا نام لیانو تھا۔ اس نے آہستہ سے کلریتا کا ہاتھ دبایا اور چل دیا۔

مسولینی اکثر سوچتا تھا کہ "ہیرو" ہونے کے علاوہ کیا وہ کلریتا پر ایک مرد کے روپ میں بھی ظاہر ہو جائے۔ لیکن کلریتا کو کھو دینے کے ڈر سے اس سے اظہار محبت سے گریز کرتا تھا مگر کلریتا کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ مسولینی اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لے اور اس کے گلابی ہونٹوں پر جلتے ہوئے ہونٹ رکھ کر کہے "تم میری ہو کلریتا ———

کلریتا تم میری ہو۔"

ملاقات کے چند دن بعد لیانو نے ٹیلیفون پر محبت بھری آواز میں کلریتا کو کار میں سیر کرنے کی دعوت دی، وہ تنہا تھی۔ لیانو سے ملنے کی آرزو مند تھی۔ اس نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ جاتی دفعہ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لے گئے۔ مسلسل کئی گھنٹے کار چلانے کے بعد وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچے۔ انھوں نے جھکے ہوئے درختوں میں دوپہر کاٹنے کا پروگرام بنایا۔ وہ کھاتے رہے، ہنستے رہے، اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہے۔ کلریتا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ لیانو اس پر آہستہ سے جھکا اور وفورِ جذبات میں کلریتا کے ہونٹ چوم لیے۔

کلریتا نے اُسے اپنے سینے سے لگانا چاہا، لیکن وہ اچانک پیچھے ہٹ گیا اور بڑی افسردہ آواز میں کہنے لگا "کلریتا جب سے تمھیں دیکھا ہے میں کھویا کھویا سا رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں۔"

کلریتا نے کہا "تم مجھ سے خوش ہو اور میں تم سے خوش ہوں۔ پھر پریشان ہونے سے مطلب؟"

"یہ بات نہیں کلریتا! مسولینی نے ہماری محبت کو ناممکن بنا دیا ہے۔" اس کی نیلگوں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے جیسے جھیل کی نیلگوں پانی کی سطح پر شبنم کے قطرے لرز رہے ہوں۔ کلریتا افسردہ لہجے میں کہنے لگی "تم ٹھیک کہتے ہو لیانو! میں اپنی جوانی کی قربانی ایسے انسان کے لیے کر رہی ہوں جو چاہتا ہے کہ دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتی رہوں، لیکن مجھے ایک دیوتا کی نہیں محبت کے جذبے سے سرشار مرد کی ضرورت ہے۔"

آنسو کلریتا کی دراز پلکوں پر لرزنے لگے اور روتے روتے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا، لیکن محبت کے یہ متوالے نہیں جانتے تھے کہ دو پُراسرار آنکھیں انھیں دیکھ رہی ہیں۔

پکنک کے چند دن بعد ملاقات کے لیے اُسے مسولینی کا پیغام ملا، جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسولینی کی آنکھوں میں بجلیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا "بیٹھ جاؤ۔" جب وہ بیٹھ چکی تو وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "لڑکی میں تمھارا احترام کرتا چلا آیا

ہوں لیکن اب تمھاری وفاداری مشکوک ہے۔ لیانو پہلا شخص ہے جس کی کشش نے تمھیں اپنی طرف کھینچا ہے۔"

"سُنیے تو" کلریتا نے احتجاج کرنا چاہا۔

"چُپ رہو آوارہ لڑکی"۔ وہ پوری طاقت سے گرجا۔

"تم گلیوں میں بھٹکنے والی بے ہودہ عورت ہو، آوارہ لڑکی!" اس نے اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تم میری ہو اور میں اپنی محبت میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتا۔"

کلریتا اگرچہ خوف سے کانپ رہی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ تین سال سے مسولینی کے سینے میں بھی وہی جوالامکھی دھک رہا تھا جس نے کلریتا کے سینہ کو جلا کر راکھ کر دیا تھا اور آج وہ دیوتا نہیں ایک مرد تھا۔ وہ جس زندگی کے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی آج وہ زندگی ہنستی مسکراتی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اطالیہ کی عظیم سلطنت کا مالک سچے عاشق کی طرح کلریتا کے چرنوں پر جھکا۔ کلریتا نے محسوس کیا کہ ریکارڈو، لیانو اور مسولینی میں اب کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک جوان مرد تھا جس کی آرزو ہے کہ اپنی محبوبہ کے ہونٹ چومے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رازونیاز کی باتیں کرے۔

کلریتا پر اگرچہ اضطراری کیفیت طاری تھی لیکن وہ ایک انجانے جذبے کے تحت مسولینی کی آغوش میں جا گری اور مسولینی نے لڑکھڑاتی ہوئی کلریتا کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

ملاقاتیں زیادہ طویل ہوتی گئیں۔ یہ دیوی یا دیوتا کی ملاقاتیں نہیں تھیں بلکہ دو دھڑکتے دلوں کا ملاپ تھا۔ سرِشام وہ اپنے گھنگھریالے اور سنہرے بالوں کو پھولوں سے سجاتی۔ مسولینی کو فطرتاً پیازی رنگ پسند تھا جس روز اسے مسولینی کے ساتھ زیادہ دیر رہنا ہوتا وہ پیازی رنگ کی فراک پہنتی۔ چہرے پر سوسن اور گلاب کی سی تازگی لیے وہ مسولینی کے محل میں جا پہنچتی۔ اس کے بالوں میں ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں کی جھلملاہٹ تھی اور ہونٹوں پر طلوعِ صبح کا تبسّم۔ اس کے انوکھے روپ نے مسولینی کے دل کو موہ لیا تھا۔

ایک شام جب وہ مسولینی کے محل میں داخل ہوئی تو مسولینی اپنے کمرے میں بیٹھا اس کی

یاد میں شراب کے خم لنڈھا رہا تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ محل کے پاسبان اس کی کڑی نگرانی کر رہے ہیں۔ پاسبانوں کی روش سے وہ بے حد پریشان ہوئی محل میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اُسے محل کے اونچے اونچے گنبدوں سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہاں گنبدوں سے بھاگ کر دُور چلی جائے۔ مسولینی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نیلگوں آنکھیں موتی برسانے لگیں۔ مسولینی نے اُسے بازوؤں کا سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور رومال سے دیر تک اس کے آنسو پونچھتا رہا۔ کلریتا سسکیاں لے لیکر روتی رہی، اس نے روتے ہوئے کہا

"محل کے پاسبانوں سے مجھے بے عزت کرانا تھا تو مجھ سے محبت کیوں کی تھی؟" مسولینی احمقوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے کلریتا کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔

"وہ سب تیرے غلام ہیں"۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "آج سے یہ محل ملکہ کا اپنا محل ہے"۔

"میرا محل؟" کلریتا نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"ہاں ہاں، ملکہ کلریتا کا محل" مسولینی کے چہرے پر شوخیاں رقص کرنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ قدرت کو مسولینی کے لیے اشیاء کی آزمائش مقصود ہے۔ اس پابندی سے اگرچہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے لیکن اس نے ایک جرأت مند عورت کی طرح آنسو پی ڈالے۔

مسولینی کی متلون مزاجی عورتوں کے سلسلے میں مسولینی کی متلوّن مزاجی کے متعلق اسی کتاب میں مصنّف لکھتے ہیں "مسولینی کی زندگی میں کئی حسین عورتیں ہنستی ہنستی آئیں، اور روتی روتی چلی گئیں۔ مسولینی کو عشق کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب وہ صرف بیس سال کا تھا۔ یہ ایک نوجوان بیاہتا عورت کی محبت تھی۔ جس کے حسنِ ملیح نے کمسن مسولینی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ لیکن یہ محبت اسے راس نہ آئی اور ایک روز جب مسولینی پر جنونی کیفیت طاری تھی اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا خنجر عورت کی پسلیوں میں گھونپ دیا۔

محبت کی بھینٹ چڑھنے والی دوسری عورت بھی کوئی نوجوان لڑکی نہیں، سیانی عمر کی عورت تھی۔ اس کے پانچ بچے بھی تھے۔ لیکن مسولینی دیوانہ وار اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر جذبات کی جو آندھی شدت سے چڑھی تھی، آہستہ آہستہ اتر گئی اور مسولینی نے محسوس کیا کہ جسے وہ موتی سمجھتا

تھا وہ شبنم کا ایک قطرہ تھا۔

۱۹۰۸ء میں وہ ریچلی گائیڈے کے تیرِ نظر کا نشانہ بنا۔ ریچلی گائیڈے اٹھارہ سال کی شوخ وشنگ لڑکی تھی ——— وہ دراصل مسولینی کی ماں کی شاگرد تھی۔ مسولینی نے ریچلی کا معصوم بچپن بھی دیکھا تھا، لیکن جب اُسے بھرپور جوانی میں دیکھا تو ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اس نے ریچلی گائیڈے کو پانے کے لیے اپنا پورا اثر و رسوخ صرف کر ڈالا اور آخر اسے ایک روز پا لیا۔

ریچلی کو پا لینے کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک روز ریچلی اپنے والدین کے ساتھ کسی سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی، بہت لوگ کمرے میں بیٹھے غپ شپ کر رہے تھے۔ ریچلی کا باپ ریچلی کی ماں کو تازہ اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا اور ریچلی صوفے پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی، اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور مسولینی ہاتھ میں پستول تھامے اندر داخل ہوا۔ اس نے ماحول کا جائزہ لیا اور نہایت تحمل سے کہا

"اگر تم میری ریچلی کو میرے حوالے نہیں کرو گے تو اس پستول میں چھ گولیاں ہیں ایک ریچلی کے لیے اور پانچ میرے لیے۔"

ریچلی کے والدین پر ایک بجلی سی گری اور وہ پتھر کی مورتیوں کی طرح جامد نگاہوں سے اُسے گھورتے رہے۔ مسولینی نے ریچلی گائیڈے کا پیار سے ہاتھ پکڑا اور لے کر چلتا بنا۔

لیکن ایک عورت کی محبت پر قناعت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کلریتا سے محبت ہونے سے پہلے وہ ایک فرانسیسی لڑکی میگڈا دی فونٹی سے محبت کی پینگیں بڑھا چکا تھا وہ فرانس سے ایک پرچہ کی نامہ نگار بن کر آئی تھی۔ جب مسولینی کی ملاقات اس سے ہوئی تو وہ ایک ہی نظر میں اُس کے حسن کا متوالا بن گیا۔ فرانسیسی حسینہ نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا اور اس طرح مسولینی کی دنیائے محبت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ لیکن فرانسیسی لڑکی کی محبت کے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے اور ایک روز محبت نفرت میں بدل گئی اور پیرس پہنچ کر اُسے زہر کھانے کی کوشش کرنی پڑی۔

نحوست کے دن دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ ہٹلر اور مسولینی کے اغراض ایک سے

تھے لہٰذا دونوں میں اتحاد ہو چکا تھا اور یہ اتحاد روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر دھاوا بول کر دنیا کے خرمنِ امن میں آگ لگائی تو مسولینی کو بھی سہانے خواب آنے لگے۔ چنانچہ اس نے بھی ہٹلر کی ہاں میں ہاں ملا کر برطانیہ و فرانس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس کی فوجی طاقت خاصی مضبوط ہو چکی تھی اور اٹلی کے دستے یورپ میں دوڑتے پھرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں یونان کو بے دست و پا کر کے مطیع کر لیا گیا پھر یوگوسلاویہ سے بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس طرح اٹلی نے ساڑھے چار ہزار مربع میل پر اپنا تصرف جما لیا۔

۱۹۴۲ کے وسط تک جرمنی اور اٹلی کی فوجیں اس طرح بڑھتی جا رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ساری دنیا کو فتح کر لیں[1] گی۔ مگر اچانک جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔[2]

شمالی افریقہ میں اطالوی فوجیں قبضہ جما چکی تھیں اور پیشقدمی کرتی جا رہی تھیں۔ اب ان کی پیشقدمی رُک گئی۔ وہ مصر میں سیدی بارانی کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں جنرل رومیل کی قیادت میں جرمن فوجوں نے مصر پر قبضہ جمانے کی سر توڑ کوششیں کیں، اور بڑھتے بڑھتے سکندریہ سے صرف سترہ میل دُور رہ گئیں لیکن وہ بھی اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکیں العالمین کے مقام پر جنرل منٹگمری کی قیادت میں جرمنی اور اٹلی کی مشترکہ فوجوں کو پہلی بار اتنی زبردست شکست ہوئی کہ محوریوں کے پاؤں شمالی افریقہ سے اکھڑنے لگے اور ایک ایک کر کے سارے مقبوضات اٹلی کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مئی ۱۹۴۳ء میں محوریوں نے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ جنرل رومیل بچ کر نکل گیا۔

---

[1] اب جاپان اور امریکہ بھی جنگ میں کود پڑے تھے۔ جاپان آندھی مینہ کی طرح بڑھتا ہوا ملایا تک پہنچ گیا۔ پھر ہانگ کانگ کے برطانوی علاقے پر قبضہ جما لیا۔ فروری ۱۹۴۱ء میں سنگاپور لے لیا اور برطانیہ کی ستر ہزار فوج برباد کر دی گئی، جاپانی فوجیں ہندوستان کے مشرقی ساحل سے ٹکرانے لگیں جس سے آسٹریلیا کو بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔

[2] ۱۹۴۲ء کے بعد محوریوں کی پیشقدمی کی رفتار سست پڑ گئی اور اتحادیوں نے طاقت پکڑ لی۔ ان دنوں کلریتا اور مسولینی کی محبت کا چرچا عام تھا چنانچہ مسولینی کے ساتھ کلریتا کو بھی قید کر دیا گیا۔

مسولینی جیل میں محوریوں میں اٹلی سب سے کمزور تھا۔ اس لیے سب سے پہلے اس کی تباہی کا وقت آیا۔ شمالی افریقہ کی کے بعد اتحادیوں نے سب سے پہلے جزیرہ سسلی پر قبضہ کیا اور خاص اٹلی پر یلغار کر دی۔ اطالوی لوگوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ مسولینی کے خلاف عام بغاوت ہو گئی اور اُسے استعفا دینے پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۳ء میں اس نے استعفا دیدیا۔

اس جنگ میں اٹلی کو جو ہزیمت اٹھانی پڑی اہل اٹلی نے اس کی ذمہ داری مسولینی پر ڈالی اور اُسے گمراہ کن لیڈر قرار دیا چنانچہ جب اتحادیوں سے صلح کی گفت وشنید شروع ہوئی تو مسولینی کو جیل میں ڈال دیا گیا اور اتحادیوں نے فاتحانہ شرائط پر صلح کی درخواست قبول کر لی۔

ایک معجزہ اس دوران میں جرمنی ابھی تک سرگرم عمل تھا۔ اس نے ایک عجیب وغریب کرتب دکھایا جسے دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی۔ مسولینی کو گرفتار ہوئے ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک چند جرمن ہوائی جہازوں نے جیل خانے پر اڑان کی اور پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اُتر کر مسولینی کو اس طرح اٹھا لے گئے کہ اس سے پہلے ایسے واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کلریتا کو بھی جیل سے رہا کر دیا گیا۔

مسولینی کا آخری دَور جیل سے رہا ہونے کے بعد مسولینی نے شمالی اٹلی کی پہاڑیوں میں اپنا مرکز قائم کر لیا اور "آزاد فسطائی جمہوریت" کے نام سے ایک نئی حکومت بنائی۔ جرمنی نے مسولینی کی پوری پوری حمایت کی۔ مسولینی بڑی شدت سے اتحادیوں کے خلاف سرگرم عمل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روم نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس اعلان کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جرمنی نے مسولینی کی حمایت شروع کر رکھی تھی اور اہل اٹلی یہ سمجھنے پر مجبور تھے کہ ان پر ساری تباہی مسولینی ہی کی غلط قیادت کے باعث آئی ہے۔ اعلانِ جنگ کا باعث یہ بھی تھا کہ اتحادیوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اٹلی مسولینی کے پیچھے نہیں لگا۔ گویا مسولینی کے بُرے دن آ گئے تھے۔

اس دوران میں کلریتا بھی مسولینی کے پاس آ گئی تھی اور اس آخری رومانی دَور کی مدت دو سال سے تجاوز نہ کر سکی۔ ظاہر ہے کہ یہ دو سال مسولینی کی زندگی کے نہایت تلخ سال تھے۔ وہ ہر وقت الجھنوں میں کھویا رہتا تھا۔ اُسے اپنا افسوسناک انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم

وہ اپنی مصروفیات کے باوجود زندگی کے رومانی پہلوؤں سے اب بھی کنارہ کش نہ ہوا۔

ان ایام کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے عبدالقدیر رشک لکھتے ہیں "جب کلریتا نے ہیڈکوارٹر میں مسولینی کو دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے سامنے زرد رنگ کا ایک بوڑھا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے کھڑا تھا۔ چہرے سے ایک افسر کا دبدبہ نہیں بوڑھوں کی سی بے کسی ٹپکتی تھی۔ وہ کلریتا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن اس نے گرم جوشی سے اپنی محبوبہ کا استقبال کیا مگر اس کے رویہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اُسے ایک محبوبہ کی نہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ کلریتا نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماضی کی حسین یادوں کے سہارے زندہ رہے گی اور اپنے مصیبت زدہ آمر کا ساتھ کبھی نہ چھوڑے گی۔

مسولینی کا نیا ہیڈکوارٹر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کسی سے پوشیدہ مل سکنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ مسولینی کی بیوی ریچلی بھی اس کے ساتھ تھی۔ کلریتا ایک ایسے مکان میں سکونت پذیر تھی جو ہیڈکوارٹرز کے بہت قریب تھا۔ اگرچہ وہ خود خستہ حال اور پریشان تھی لیکن اس کی زندگی کا مقصد مسولینی کو خوش رکھنا تھا۔

چند دن میں مسولینی نے کلریتا سے ملاقاتوں کا ایک نیا طریقہ سوچ لیا۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنی قیامگاہ سے نکلتا کلریتا کو اپنی کار میں بٹھا لیتا اور پھر رات کے گھنگھور اندھیرے میں کار پہاڑی علاقے کی طرف چل دیتی۔ لیکن مسولینی کی سرکاری کار ہیڈکوارٹرز میں کھڑی رہتی۔

مگر راتوں کی یہ ملاقاتیں لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ لوگوں نے اکثر ٹوٹتی راتوں کو کلریتا اور مسولینی کو چٹانوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ جب ان ملاقاتوں کا علم مسولینی کی بیوی کو ہوا تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ ایک روز وہ کلریتا کے مکان میں جا داخل ہوئی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کلریتا کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"تم عورت نہیں ناگن ہو۔ تم نے میرے شوہر کو ڈس لیا ہے۔ تم نے روما میں بھی میری محبت کو لوٹا تھا مگر وہاں میں مجبور تھی اور یہاں مجبور نہیں۔ آوارہ لڑکی! تم میری اور مسولینی کی محبت میں حائل نہیں ہو سکتیں"۔ ریچلی کے ہونٹ غصے سے کانپ رہے تھے۔ کلریتا پتھر کے بت کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ جب ریچلی دل کا غبار نکال چکی تو کلریتا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"ریچلی! میں تمہارے خاوند سے محبت کرتی رہی ہوں۔ میں نے اس کے لیے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کی، لیکن میرے پاس ماضی کی چند یادوں کے سوا اور کچھ بھی تو نہیں۔ بچوں کی وجہ سے تمہاری زندگی باغ و بہار ہے، لیکن میں . . . . " کلریتا کی آواز لڑکھڑا گئی، اور آنسوؤں کے شفاف قطرے اس کی نیلگوں آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس نے آستین سے آنسو پونچھے اور آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ریچلی! مسولینی کو مصیبت کے دنوں میں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ میں اُسے خوش رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں تاکہ وہ مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر سکے۔"

ریچلی کے ہونٹ ایک لمحہ کے لیے کانپے اور وہ گردن جھکائے ہیڈ کوارٹرز کی طرف چل دی۔

ریچلی کے چلے جانے کے بعد کلریتا نے مسولینی کو ٹیلیفون کیا۔ مسولینی پہلے ہی پریشان تھا۔ رات اس نے کیمپ میں بسر کی اور صبح نمودار ہوتے ہی وہ میلان روانہ ہو گیا۔ میلان میں فاشسٹوں نے اُس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اس نے وہاں لمکہ تان کر ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ آخر فتح تمہاری ہوگی۔ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس آیا تو اس کے عزائم زیادہ جوان تھے لیکن اُسے شام کو خبر ملی کہ اتحادی فوجیں روم پر قبضہ کرنے کے لیے اور آگے بڑھ گئی ہیں۔

اس دوران میں کلریتا نے اپنا مکان تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ زیادہ آزادی سے مسولینی سے مل سکتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا گراموفون بھی خرید لیا تھا، جس پر تنہائی میں وہ مسولینی کی تقریریں بجایا کرتی تھی۔ جب سے مسولینی کو اتحادیوں کی فتح کی خبر ملی تھی وہ زیادہ پریشان نظر آتا تھا اس نے کلریتا کی رفاقت کو زیادہ شدت سے محسوس کیا۔ ملاقاتیں پہلے تاریک راتوں میں ہوا کرتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں روز روشن میں ہونے لگیں۔

ریچلی کو ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے غریب الوطن آمر کی زندگی حرام کر دی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کلریتا کو گولی مار دیگا اور خود بھی اُسی ریوالور سے خودکشی کر لے گا۔

ایک روز ریچلی نے ایسا طوفان بدتمیزی برپا کیا کہ مسولینی گھبرا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ غصے میں بھرا ہوا وہ کلریتا کے مکان پر پہنچا۔ کلریتا نے خندہ پیشانی سے اس کا

استقبال کیا، لیکن مسولینی چلا کر کہنے لگا۔

"میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ ریچلی نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو ختم کرنے کے لیے آیا ہوں اور تمہیں بھی موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

کلریتا کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیا" اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔" مسولینی پھر گرجا

"تم میری موت کے بعد کیسے زندہ رہ سکو گی؟ موت کے لیے تیار ہو جاؤ کلریتا! آج ہمارا یوم وفات ہے۔"

کلریتا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مسولینی کا ریوالور پکڑ لیا اور جوش میں آکر اپنا بلاؤز پھاڑ ڈالا۔ وہ دیوانوں کی طرح چلانے لگی۔

"مجھے گولی مار دو، مجھے گولی مار دو۔" کلریتا کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور اچانک زمین پر گر پڑا۔ مسولینی نے اس پر قہر آلود نظر ڈالی اور بڑبڑاتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔

۱۹۴۵ء کو مسولینی نے ہٹلر سے ایک خفیہ ملاقات کی اور جب وہ اپنے ہیڈ کوارٹرز میں واپس آیا تو وہ بدلا ہوا مسولینی تھا۔ اس کے جذبات زیادہ جوان تھے۔ ہٹلر نے اس پر ایک ایسے جنگی ہتھیار کا انکشاف کیا تھا جس سے چند روز میں جنگ ختم ہو جانے کا امکان تھا۔

برطانوی اور امریکی فوجیں بدستور ہر محاذ پر آگے بڑھ رہی تھیں۔ ۷ اپریل کو اس نے پھر میلان جانے کا فیصلہ کیا۔ کلریتا نے بھی تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور میلان جائے گی۔

مسولینی کا خیال تھا کہ میلان میں اس کا استقبال گرم جوشی سے کیا جائے گا، لیکن وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا لوگوں کے ولولے سرد پڑ چکے تھے اور وہ جنگ کیے بغیر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور تھے۔

کلریتا بھی میلان پہنچ چکی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں مسولینی سے ملی۔ وہ میلان کے گلی کوچوں میں گھوم کر لوگوں کی سرد مہری دیکھ چکی تھی۔ اس نے مسولینی کو مشورہ دیا کہ وہ اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے، لیکن مسولینی نے اس کے مشورے کو فوراً مسترد کر دیا۔

۲۵ اپریل کو اس نے حریت پسند جوانوں کی مجلس عاملہ میں شرکت کی۔ اُسے بتایا گیا کہ

جرمن برطانیہ کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے حق میں ہیں۔ یہ سن کر وہ جلال میں آگیا۔ اس نے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا۔

"ہٹلر نے دوست ہو کر مجھے دھوکہ دیا ہے"

واپس آ کر اس نے سوچا کہ اسے میلان سے فوراً نکل جانا چاہیے ورنہ اس کی گرفتاری یقینی ہے۔ اس نے اپنے سابق ڈائریکٹر نشر و اشاعت پاولینی کو بلا کر کہا مجھے پانچ ہزار سرفروشوں کی ضرورت ہے۔ میں ان کی امداد سے باواریا میں جرمنوں سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے پاولینی کو ہدایت کی کہ ان جانبازوں کو اس سے قومو کے مقام پر ملنا چاہیے۔

شام کے سات بجے وہ تیس کاروں کے کنوائے کے ساتھ قومو روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ اس کے دیرینہ فاشسٹ رفیق بھی تھے۔ لیکن اس کنوائے میں کلریتا نہیں تھی۔ چلتے وقت اس نے کلریتا کو اس پروگرام کے متعلق مطلع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

قومو پہنچ کر وہ پاولینی اور اس کے پانچ ہزار جانبازوں کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے بعد ۲۶ تاریخ کو کنوائے مینا گو یا روانہ ہوا۔ مینا گو یا کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کنوائے ایک پہاڑی راستے سے سوئٹزرلینڈ کی سرحد کی طرف چل دیا۔ گرانڈولا پہنچ کر ایک پارٹی یہ معلوم کرنے کے لیے بھیج دی گئی کہ آیا سرحدی راستہ کھلا ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد پارٹی کا ایک ممبر واپس آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا "سرحد کے محافظوں نے پارٹی کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے سرحد کے محافظ حریت پسندوں سے ملے ہوئے ہیں"

کلریتا اور پاولینی بھی مسولینی سے آ ملے، لیکن پاولینی اکیلا تھا۔ اس کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مسولینی نے سوچا کہ اب موسیکو کی طرف چلا جائے۔ بیس کے قریب جرمن کی مزید لاریاں بھی ان کے کنوائے سے آ ملیں۔ راستہ پہاڑی اور بے ڈھب تھا چند میل چلنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ راستہ آگے سے بند ہے۔ کنوائے کے جرمن افسر انچارج نے کہا کہ میں اتر کر محافظوں سے بات چیت کرتا ہوں۔

جرمن افسر کے چلے جانے کے بعد کنوائے کا ہر شخص فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سپاہی لاریوں سے اتر کر مسولینی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ مسولینی کا وجود ان کے لیے مینارۂ امید تھا۔ کئی گھنٹوں کے

انتظار کے بعد جرمن افسر واپس آیا۔ اس نے مسولینی کو بتایا کہ میں نے جرمن سپاہیوں کے گزرنے کی اجازت لے لی ہے۔ اگر تم بھی جرمن سپاہی بننا پسند کرو تو ہم تمھیں ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

کلریتا چلائی " آقا! میرے محبوب! اپنی جان بچاؤ۔ یہ جرمن ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" اُسے ایک جرمن سپاہی کا کوٹ پہنا دیا گیا۔ کلریتا نے اُسے اپنا آہنی خود دے دیا۔ مسولینی آہنی خود پہنتے ہوئے بڑبڑایا۔

" میں اطالویوں سے زیادہ جرمنوں پر اعتماد رکھتا ہوں "

ڈانگو پر جرمن لاریاں رک گئیں۔ حریت پسند سپاہیوں نے انھیں رُک جانے پر مجبور کیا تھا لاریوں کی تلاشی لیتے وقت انھوں نے ایک لاری پر کسی کو اوندھے لیٹے ہوئے پایا۔ کوئی شخص گہری نیند سو رہا تھا " سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے " جرمن سپاہی اپنا خود لہراتے ہوئے چلا رہے، لیکن حریت پسند جوانوں کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں نے اُسے دھکے مار کر لاری سے نیچے اتار دیا۔ لاری سے نیچے اُترتے ہی سب سپاہی ایک ساتھ چلائے

" یہ مسولینی ہے۔ آخر کار ہم نے اسے پکڑ لیا "

واحسرتا

مسولینی گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ ایک سپاہی نے جھٹکا مار کر مسولینی سے اس کی بندوق چھین لی۔

محافظ دستہ کی نگرانی میں اُسے قومو[1] روانہ کر دیا گیا۔ جونہی مسولینی قومو روانہ ہوا کلریتا کو تلاش کرنے کے لیے سپاہی ڈانگو روانہ ہو گئے۔ مسولینی کے سر کو رسیوں سے پیچھے کی طرف باندھ دیا گیا تاکہ راستہ میں کوئی اُسے شناخت نہ کر سکے اور راستے میں لوگ اسے ایک زخمی سپاہی سمجھتے رہے۔

محبوبہ کی گرفتاری

ڈانگو میں کلریتا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے بہانے تراشنے کی بجائے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ کلریتا ہے۔ اس کو ایک جیپ کار پر لاد لیا گیا۔ راتوں رات یہ کار اُسے لے کر نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے ایک چھوٹے سے گاؤں اذانو میں لے جایا گیا۔ اسی

---

[1] اٹلی کے شمال میں کوہ ایلپس کے دامن میں ایک چھوٹا سا شہر جو جھیل قومو کے کنارے واقع ہے آبادی ہمہ ہزار کے قریب ہے۔ جھیل قومو ۳۵ میل لمبی ہے۔

گاؤں میں مسولینی کو بھی رکھا گیا۔ کلریتا کے پہنچتے ہی دونوں قیدیوں کو ایک تنگ اور دشوار راستے پر چلنے کے لیے کہا گیا۔

اسیرانِ محبت غم کی وجہ سے مسولینی کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ پتھروں پر چلنے سے اس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے لیکن محافظ سپاہی دونوں قیدیوں کو رات کی تاریکی میں ہانکتے چلے جا رہے تھے آدھی رات کے وقت سپاہی ایک پہاڑی پر جا کر رکے۔ اس پہاڑی پر ایک بڑھیا میریا کا مکان تھا سپاہیوں نے دروازے پر دستک دی۔ میریا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے سپاہیوں کے افسر کو پہچان لیا۔ میریا نے دروازہ کھولا۔ لالٹین کی روشنی میں دو زرد زرد انسان گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ میریا کی بوڑھی آنکھوں نے لالٹین کی روشنی میں ان دونوں قیدیوں کو بھی پہچان لیا۔

وہ اُوپر کی منزل سے دو بستر اٹھا لائی۔ چارپائی پر بستر بچھاتے ہوئے اس نے کہا "رات بھیگ چکی ہے، مصیبت کے مارو سو جاؤ۔"

صبح نمودار ہوتے ہی میریا نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے دروازہ کھولا مسولینی کی داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اداسیاں اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھیں۔ سرہانوں پر زرد زرد نشان پڑے ہوئے تھے۔ میریا نے ان نشانوں کا سراغ ڈھونڈ لیا۔ یہ آنسوؤں کے نشان تھے جو تمام رات ان قیدیوں کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔

انھوں نے دوپہر میریا کے ہاں کاٹی۔ چار بجتے ہی دروازے کے پٹ زلزلانہ انداز میں بجے۔ اور ایک لمبا تڑنگا سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے خاکی وردیاں پہنے دو اور سپاہی کھڑے تھے۔ سپاہیوں کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ سپاہیوں کا لیڈر حریت پسندوں کی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مسولینی کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔

"جلدی کرو۔ میں تمھیں نجات دلانے کے لیے آپہنچا ہوں۔"

کلریتا اور مسولینی نے بادلِ ناخواستہ اپنے کپڑے سنبھالے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلنے لگے۔

موت کی ہچکیاں سپاہی سٹین گنیں سنبھالے دونوں قیدیوں کو نامعلوم سمت کی طرف گھسیٹ

رہے تھے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ایک ویرانے میں مسولینی کو پتھروں کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔

کلریتا نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی نظروں سے مسولینی کی طرف دیکھا اور سسکیاں لیتی ہوئی دیوانوں کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ سپاہیوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی سٹین گنوں کے ٹریگر دبائے۔ گولیوں کی گھن گرج سے فضاؤں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ کلریتا اور مسولینی ایک ساتھ زمین پر گرے۔ کلریتا نے نیم وا آنکھوں سے مسولینی کے مردہ جسم کو دیکھا اور ہونٹ آخری بار کانپے

"میرے آقا! میرے محبوب"

ے

خبر دی ہے زمانے کی ہوا سے
گراں ہے کوہ سے بھی غم ہمارا

سٹالن کے رومان

نجیدا کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ سٹالن اپنی محبوبہ کی لاش پر گم سم کھڑا تھا۔ دنیا نے پہلی مرتبہ روس کے آہنی انسان کی آنکھوں میں غم کے آنسو دیکھے۔ "نجیدا! تیرے دشمنوں کا بُرا ہو" سٹالن کی زبان سے نکلا اور وہ لاش پر جھک کر رونے لگا۔

یادِ ماضی ؎ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

میریا اپنے کمرے میں بیٹھی ماضی کے حادثات پر غور کر رہی تھی۔ وہ حادثات جنھوں نے اس کی زندگی کو چند سالوں کے لیے پُرمسرت فضا بخشی تھی پھر جلد ہی اُسے اپنی زندگی کا ماتم کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا، اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ زندگی کے ابتدائی سولہ سال اس نے اپنی شفیق چچی کے دامن عافیت و محبت میں گزارے۔ گاؤں کی زندگی اسے بے حد مرغوب تھی، اپنے بھائی بہنوں اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں اس نے بچپن کے ایام گزارے، اسے نہ حال کی فکر تھی نہ مستقبل کی۔ وہ دنیا کے تمام فکروں سے بے نیاز گاؤں کے پرسکون ماحول میں پروان چڑھی۔ اُسے وہ دن رہ رہ کر یاد آتے تھے جب وہ اپنی چچی اور ننھے بھائی کے ہمراہ کھیتوں میں کام کرنے جایا کرتی تھی۔ وہ علی الصبح اٹھتی، گائے دوہتی اور گھر والوں کے لیے ناشتے کا اہتمام کرتی۔ پھر سورج نکلنے سے قبل کھیتوں میں پہنچ جاتی۔ کچھ دیر بعد اس کی چچی بھی وہاں آجاتی وہ کھیتوں کو پانی دیتی۔ پودوں کو درست کرتی اور میریا بھی ان کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ یہ اس کا روزمرّہ کا معمول تھا۔

گاؤں کی دیرینہ زندگی کا خیال اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ پھر اچانک وہ اس ماحول سے نکل کر گرد و پیش کے موجودہ حالات کے متعلق سوچ بچار کرنے لگی۔ اب وہ عمر کی پچیسویں بہار دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا گاؤں چھوڑے نو برس ہو چکے تھے، اس مدت میں اس نے شہر کی زندگی میں رہ کر کئی حادثات دیکھے۔ جب پہلے پہل وہ ماسکو میں آئی تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی خیال کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ روس کے سب سے بڑے انسان کے دل کی ملکہ تھی۔

سٹالن

وہ سٹالن کے دل پر حکمرانی کرتی تھی۔ سٹالن اُسے دل وجان سے چاہتا تھا اور اس کے ادنیٰ اشارے پر جان تک دینے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ وہ خود بھی سٹالن سے والہانہ محبت کرتی تھی سٹالن نے اسے دیہاتی ماحول سے نکالا، غربت سے نجات دلائی اور ماسکو کی یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلائی۔ وہ سٹالن کے ساتھ آزادانہ گھوما کرتی تھی۔ اُسے اپنا گاؤں، اپنی چچی، اپنی سہیلیاں اور اپنے تمام عزیز بھول چکے تھے۔ وہ سٹالن کی محبت اور نئی شاہانہ زندگی کے نشہ میں دنیا کی ہر شے کو بھلا چکی تھی لیکن ——— آج سٹالن کی آنکھیں بدل چکی تھیں، میریا کی رومانی زندگی کا باب ختم کیا جا رہا تھا۔

منحوس گھڑی میریا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سٹالن کی بے مروتی اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی، پھر جب اُسے زرعی نمائش کا وہ دن یاد آیا جب پہلی دفعہ سٹالن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور سٹالن نے محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ کر اپنی پرخلوص محبت کا پیغام سنایا تھا تو وہ چونک اٹھی۔ وہ اس کی زندگی کا انقلابی دن تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ وہ ساعت اس کی زندگی کی بہترین ساعت تھی مگر آج اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا تھا، دراصل وہ نہایت ہی منحوس گھڑی تھی ——— یکایک آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ رنج و کرب کے عالم میں وہ صوفے پر دراز ہو گئی، رو رو کر دل کا بوجھ ہلکا کیا ——— اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی: ؎

مری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن ہوئی
یہ راہ آج پھر تیرہ و تار ہے غالباً چاند کو لگ گیا ہے گہن

انقلابی رو ۱۹۱۴ کا زمانہ تھا۔ روسی فوجیں جرمنی اور ترکی کے خلاف صف آرا تھیں۔ تین سال تک زبردست جنگ ہوتی رہی۔ جرمنوں کے مقابلہ میں روسیوں کو زبردست شکست ہوئی اور زارِ روس کی شہنشاہیت خس و خاشاک کی طرح اس طوفان میں بہہ گئی۔ ۱۹۱۷ میں فوج اور عوام نے زار کے خلاف بغاوت کر دی اور اُسے معزول کر کے جمہوریت کی بنا ڈالی مگر جب لینن[ل]

ل ۱۸۷۰ - ۱۹۲۴ ، روس کی انقلابی جماعت کا سرکردہ لیڈر تھا جو ۱۸۹۳ سے ۱۹۱۷ تک روس کے علاوہ سمندر پار ملکوں میں بھی کام کرتی رہی۔ اس عرصے میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنی۔ اس پارٹی میں وہ گروہ بن گیا جو بالشویک (باقی صفحہ ۹۶ پر)

روس آیا اور اس نے نئی حکومت دیکھی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ اعتدال پسندوں کی حکومت تھی جس میں امیر اور رئیس دونوں شامل تھے۔ اس نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج میں سٹالن بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ اور انقلابی جماعتوں کا سرکردہ لیڈر سمجھا جاتا تھا۔ نئی حکومت لینن اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ہو گئی اور انھیں گرفتار کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ مگر لینن روپوش ہو گیا۔ سٹالن کو گرفتار کر لیا گیا۔ آخر، نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن نے موقع پا کر ایوان پر ہلہ بول دیا اور بالشویک لیڈروں نے بڑی ہوشیاری اور دانائی سے بجلی کی تیزی کے ساتھ حکومت کو درہم برہم کر کے بالشویک حکومت قائم کر لی۔ اس زمانے میں سٹالن کے علاوہ ٹراٹسکی[1] بھی لینن کے ساتھ تھا اور بین الاقوامی اشتراکی انجمن کا سرگرم رکن تھا۔ انقلاب شکن طاقتوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ۱۹۱۸ء کے آخر سے ۱۹۱۹ء کے اوائل تک سات ہزار باغیوں کو سزائے موت دی گئی

بتا رہے ہیں یہ جمہورِ ملک کے تیور ــــــ دریدہ ہو کے رہے گی قبائے سلطانی

سٹالن کا ظہور ابھی تک سٹالن کی حیثیت ایک عام لیڈر کی سی تھی مگر بالشویک حکومت کے قیام کے بعد وہ ملک کی بہت بڑی شخصیت بن گیا۔ لینن کے بعد ملک میں دوسرا بڑا شخص سٹالن تھا۔ ٹراٹسکی سے دو سال اور لینن سے نو سال چھوٹا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ

(بقیہ حاشیہ ۹۵) کہلاتا ہے اور جو کسی سے بھی تعاون کرنے کو تیار نہ تھا۔ لینن اس گروہ کا سرکردہ لیڈر تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں بالشویکوں نے عارضی حکومت کو ختم کر دیا اور لینن اس نئی حکومت کا صدر بن گیا۔ ۱۹۱۷ سے ۱۹۲۴ء یعنی وفات تک لینن روس کی سویٹ گورنمنٹ کا نہایت جوشیلا اور سرگرم سربراہ رہا۔ عمر میں سٹالن سے نو سال بڑا تھا۔ لینن گراڈ کا شہر اسی کے نام سے مشہور ہے۔

[1] لینن سے سات سال چھوٹا تھا۔ بڑا پُرجوش اشتراکی لیڈر اور ادیب تھا۔ ۱۸۹۸ء میں انقلاب پسندی کے جرم میں گرفتار کر کے سائبیریا بھیجا گیا۔ جہاں سے بھاگ کر لندن چلا گیا۔ وہیں لینن سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں بغاوت کے وقت لینن کے ساتھ ہی واپس روس آیا مگر پھر دھر لیا گیا۔ اس بار بھی بھاگ نکلا اور آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا پہنچا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس تک بین الاقوامی اشتراکی انجمن کا سرگرم رکن رہا۔ یہودی النسل تھا۔ ادب اور خطابت کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتا تھا اور اس کے ساتھیوں میں کوئی اس کا ہم پایہ نہ تھا۔ اس نے انقلاب روس کی تاریخ لکھی جو تین جلدوں میں ہے اس کتاب میں اس نے اپنی ادبی اور سیاسی صلاحیتوں کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

موچی کا کام کرتا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائل ہوگیا۔ ان دنوں اشتراکی جمہوری پارٹی زوروں پر تھی، سٹالن بھی اس کا رکن بن گیا اور سیاسی سرگرمیوں میں تمام سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ جگہ جگہ شورشیں برپا کیں۔ جارجیا[ل] کا رہنے والا تھا اور یہی علاقہ اس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۱۹۱۷ کی سول وار میں اس نے بہت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں لینن کے مرنے کے بعد روس کی سب سے بڑی شخصیت بن گیا۔

ازدواجی زندگی کے دوران

پچیس سال کی عمر میں سٹالن کی شادی ہو چکی تھی اس کی بیوی جارجیا کی رہنے والی تھی اور وہیں یہ شادی بھی ہوئی۔ سٹالن نے شادی سے کچھ عرصہ قبل ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا چنانچہ ۱۹۰۲ میں اسی جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی چنانچہ بیوی کی جدائی گوارا نہ ہو سکی اور کسی نہ کسی طرح رہا ہو گیا، مگر جلد ہی دوبارہ قید ہو گیا۔

اس کی بیوی نہایت خوبصورت اور سلیقہ شعار تھی۔ سٹالن ابتدا ہی سے تند مزاج واقع ہوا تھا مگر اس کی بیوی طبعاً اس کے برعکس واقع ہوئی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سٹالن اُسے بہت چاہتا تھا۔ بیوی کو بھی اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ سٹالن کا بار بار قید ہونا اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ اس نے اُسے کئی مرتبہ سیاسیات سے الگ رہنے کا مشورہ دیا مگر سٹالن نے کبھی یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ بالآخر چند سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۲ء میں وہ فوت ہو گئی اور سٹالن پر رنج و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ازدواجی زندگی کے بعد

بیوی کی موت نے سٹالن کو سخت صدمہ پہنچایا۔ وہ کچھ مدت کے لیے سیاست کا میدان چھوڑ گیا اور فیصلہ کر لیا کہ تاعمر دوسری شادی نہ کروں گا۔ چنانچہ تنہائی کے دن گزارنے لگا۔ مگر اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جلد ہی دوبارہ سیاسی میدان میں اتر آیا۔ اب وہ بیوی کے معاملے سے بھی آزاد ہو چکا تھا چنانچہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش

[ل] ٹرکی اور کیسپین کے درمیان ایک روسی ریاست جو آرمینیا اور آذربیجان کے شمال میں واقع ہے۔ ریاست کا مغربی حصہ بحیرۂ اسود کا ساحل ہے۔ رقبہ ۲۷۰۰۰ مربع میل اور آبادی ساڑھے پینتیس لاکھ کے قریب ہے۔ تفلیس صدر مقام ہے۔ روئی، تمباکو، ریشم، گندم، جنگلات اور کوئلہ کے لیے مشہور ہے۔

کے ساتھ انقلابی جماعت میں کام کرنے لگا۔ بیوی کی موت تک وہ بارہ تیرہ مرتبہ گرفتار ہو چکا تھا مگر ہر بار سزا پا کر رہا ہو گیا۔ بیوی کی وفات کے بعد جب وہ گرفتار ہوا تو اس کے لیے جلاوطنی کی سزا تجویز ہوئی۔ چنانچہ چار سال کے لیے سائبیریا[1] میں جلاوطن کر دیا گیا۔ بعد ازاں قسمت نے اسے روس کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔

بنائے ستم بالشویک حکومت کو پانچ چھ سال تک داخلی خرابیوں اور خارجی لڑائیوں میں مصروف رہنا پڑا تاہم اس اثنا میں ملک کی صنعتی اور زرعی ترقیوں کی طرف تیز قدم اٹھائے جانے لگے۔[2] اس وقت سٹالن کو روس میں بڑی عظمت حاصل ہو چکی تھی۔ زمینداری کا پرانا نظام ختم ہونے لگا اور کاشتکاروں کو بہ طور خود زمینوں کا قبضہ دلانے کے پروگرام بننے لگے۔ دریں اثنا کسانوں کو سرکاری انعامات کا لالچ دے کر ان میں زمین کی پیداوار کو زیادہ اور بہتر بنانے کے جذبہ کو ابھارا گیا۔ چنانچہ زرعی نمائشیں منعقد کی جاتی تھیں۔ سرکاری افسران نمائشوں کو دیکھتے اور مستحق لوگوں کو انعامات دیتے۔

نظرِ کرم اسی قسم کی ایک زرعی نمائش ماسکو[3] میں منعقد ہوئی، جس میں روس بھر کے کسان اپنی اپنی کاشت کردہ چیزوں کے نمونے لے کر آئے تھے۔ سٹالن خود یہ نمائش دیکھنے کے لیے آیا ہوا تھا

---

[1] شمالی روس کا علاقہ جو کوہ یورال سے بحیرہ بیرنگ تک پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں قطب شمالی احاطہ کیے ہوئے ہے اور جنوب میں منگولیا اور ترکستان کے علاقے ہیں۔ آب و ہوا بہت شدید ہے۔ کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ کوئلہ لوہا اور بعض دوسری معدنیات ملتی ہیں۔ رقبہ ۴۲۰۴۲۰ ۴ مربع میل اور آبادی ۲۲ کروڑ کے قریب ہے۔

[2] صنعتی اور زرعی ترقی کا منصوبہ پنج سالہ منصوبہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ منصوبہ باقاعدہ طور ۱۹۲۸ء میں عمل میں لایا گیا جبکہ لینن وفات پا چکا تھا۔ اس سال یکم اکتوبر کو اس کا آغاز ہوا۔ صنعتی ترقی کے سلسلے میں یہ منصوبہ بہت کامیاب ثابت ہوا، مگر زرعی ترقی کے سلسلے میں چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر حکومت کو اس سلسلے میں زمینداروں پر تشدد کرنا پڑا۔

[3] ماسکو روس کا صدر مقام ہے جو دریائے ماسکوا کے کنارے واقع ہے۔ یونیورسٹی کے لیے مشہور ہے۔ تجارتی مرکز ہے۔ چمڑا، تمباکو، مشینری، چھپائی کا سامان اور کپڑا مشہور تجارتی اشیاء ہیں۔ آبادی اکتالیس لاکھ سے اوپر ہے۔

اور اس نے انعامات تقسیم کرنے تھے۔ نمونہ لانے والوں میں بدنصیب میریا بھی تھی۔ یہیں پہلی دفعہ سٹالن کی نظر اس پر پڑی اور دل وجان سے فریفتہ ہوگیا۔

میریا یوکرین[1] کی رہنے والی تھی۔ وہ بے حد غریب تھی اور تعلیم کا بہت شوق تھا مگر غربت کے باعث یہ خواہش پوری نہ کرسکی۔ ماں باپ بچپن میں مرچکے تھے۔ چنانچہ چچی نے اس کی پرورش کی اور اپنی زمینوں پر کاشت کرانے لگی۔ جب بڑی ہوئی تو اس کا خوابیدہ حسن بھی جاگ اٹھا۔ بہت حسین وجمیل تھی۔ قدرت نے حُسن وجمال کے ساتھ صحت اور جسم بھی بہترین دیا تھا چنانچہ سولہ برس کی عمر میں ہی اس کا حُسن اور شباب دیکھنے والوں کو مدہوش کیے دیتا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گٹھا ہوا گداز جسم۔ مرمریں باہیں، گورا رنگ، لمبا قد، گھنگریالے بال۔ وہ کارگاہِ قدرت کا بہترین نمونہ تھی۔ علاقے بھر میں اس کا حسن مثال بنا ہوا تھا۔ جب اس نے سُنا کہ ماسکو میں سرکاری نمائش ہو رہی ہے جس میں کاشتکاروں کو بہت بڑے انعام دیے جائیں گے تو اس نے بھی بڑی محنت سے کھیتوں میں کام کرنا شروع کردیا۔ گنے کی فصل تھی اس نے بڑی جانفشانی سے بہترین فصل اگائی اور گنے کا نمونہ لے کر نمائش میں پہنچی۔ جب سٹالن کسانوں کے نمونے دیکھتا ہوا میریا کے پاس پہنچا تو وہ بھی اس کے خداداد حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا، گنے سے زیادہ وہ اس کے شرمگین چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکی روس کے آہنی مرد کی آنکھوں کی تاب نہ لاسکی اور اپنی آنکھیں جھکالیں۔

"تم کہاں سے آئی ہو" سٹالن نے پوچھا۔

"یوکرین سے"

"کیا تم وہیں کی رہنے والی ہو؟"

"جی ہاں"

"یہ گنا کس نے اگایا تھا"

"میں نے عالی جاہ"

---

[1] یوکرین روس کا علاقہ ہے جو بحیرہ اسود کے شمال میں واقع ہے کیو (KIEV) صدر مقام ہے۔ رقبہ ۲ لاکھ پچیس ہزار مربع میل اور آبادی ۴ کروڑ سے اوپر ہے۔ بہت زرخیز خطہ ہے "سیاہ زمین" کا علاقہ کہلاتا ہے۔ گیہوں اور گنا بکثرت ہوتا ہے

لڑکی ابھی تک نظریں جھکائے بات کر رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر اوپر کی طرف دیکھا، سٹالن اس کے چہرے کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"تم بہت پریشان معلوم ہوتی ہو لڑکی!" سٹالن نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ میریا نے شرم سے نظریں پھر جھکا لیں اور کچھ جواب نہ دیا۔

دستِ گلچیں | نمائش ختم ہو چکی تھی، میریا کو پہلا انعام مل گیا وہ سٹالن کے حضور لائی گئی۔

"تمھاری کوئی خواہش ہو تو کہو میں پوری کروں گا" سٹالن نے پوچھا۔

"عالی جاہ! میرے والدین مر چکے ہیں صرف چچی ہی میرا وسیلہ ہے۔ چونکہ مجھے تعلیم کا بہت شوق ہے، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ حکومت اس معاملہ میں میری مدد کرے" میریا نے جواب دیا۔ پہلا انعام حاصل کرنے کی خوشی نے اس کی ہمت بندھا دی تھی وہ بہت خوش تھی اور بڑی بے باکی سے روس کے حاکمِ اعلیٰ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔

"تمھاری چچی کہاں ہے؟"

(اشارہ کرتے ہوئے) وہ ہے حضور میرے ساتھ آئی ہے۔"

میریا کی چچی نے سٹالن کو سلام کیا۔ سٹالن نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ اسے سلام کا جواب دیا۔ "تم لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ میں اور میری حکومت کسانوں کی بہتری کے لیے بہت کچھ کر رہی ہے، بلکہ ہمارا سب سے بڑا مقصد تم لوگوں کی مدد کرنا ہے۔" (میریا کی طرف انگلی کرتے ہوئے) میریا کی خواہش ہم ضرور پوری کریں گے۔ (میریا کی چچی سے مخاطب ہو کر) تم چاہو تو واپس اپنے گھر جا سکتی ہو میریا کو آج ہی ماسکو یونیورسٹی میں داخل کر دیا جائے گا اور سرکاری خرچ پر اس کی تعلیم اور خوراک کا سارا انتظام ہو جائے گا۔"

اگلے ہی دن میریا کو ماسکو یونیورسٹی میں داخل کر دیا گیا۔ میریا اور اس کی چچی دونوں بہت خوش تھیں۔ میریا کی چچی نے اسے مبارک باد دی اور اپنے گھر واپس پلٹ گئی ——————

میریا نے نمائش کا پہلا انعام جیت لیا ——————— روس کے سب سے بڑے پراسرار انسان نے میریا کے مستقبل کا ذمہ اٹھا لیا ——————— دستِ گلچیں نے پھول توڑ لیا

آنچ دیتی ہے جنسِ موعود + یعنی دھوکے میں ہم تمام ہوئے

فریبِ نظر میریا سولہ سال کی تھی جب سٹالن نے اسے یونیورسٹی میں داخل کرایا۔ تعلیم کے دوران وہ سٹالن کے دل و نظر کی آماجگاہ بنی رہی وہ پڑھتی رہی اور دن گزرتے گئے اب تعلیم کے ساتھ ساتھ محبت کی عملی کارگزاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ وہ آزادی سے سٹالن کے محل میں آتی۔ دونوں سیر و تفریح کے لیے ماسکو کے مضافات میں بھی چلے جاتے تاکہ شہر کے ہنگاموں سے دُور پُرسکون جگہوں پر اپنا دل بہلا سکیں اگرچہ اپنی بیوی کی وفات کے بعد سٹالن نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا تاہم اب اس کی جگہ میریا نے لے لی تھی — اس کا تعلیمی دور ختم ہو چکا تھا اور سٹالن کے ساتھ رومانی دنیا کی پُرفریب راہگزاروں میں سفر کر رہی تھی۔ دلوں کا یہ تعلق اب ڈھکا چھپا نہ رہا تھا۔ میریا سٹالن کے محل ہی میں رہنے لگی۔ وہ اس کے دل کی مالکہ تھی۔ سٹالن کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ "محبت مرض کی طرح ہے جو اہلِ علم' اربابِ دانش اور بڑے لوگوں کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے" تاہم اس کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ وہ روس پر حکومت کرتا تھا، میریا اس پر حکم چلاتی تھی۔ سٹالن جب بھی ماسکو سے باہر کہیں جاتا میریا ساتھ ہوتی۔ سٹالن گراڈ[1] میں اس نے محض میریا کی خاطر ایک الگ محل بنا رکھا تھا۔ دریائے دولگا کے پُرفریب مناظر میریا کو بہت پسند تھے چنانچہ وہ کئی کئی دن وہاں بسر کرتے۔ لینن گراڈ[2] میں میریا کے بعض عزیز رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے بھی چلی جاتی۔ سٹالن عموماً اس کے ساتھ ہوتا۔

نیا موڑ چند سال گزرنے کے بعد سٹالن کا جی میریا سے بھر گیا۔ اس کے دل میں میریا کی محبت کم ہونے لگی۔ وہ کئی کئی دن تک میریا سے نہ ملتا۔ بعض اوقات کئی ماہ گزر جاتے اور وہ میریا کا خیال تک دل میں نہ لاتا —— میریا حیران تھی کہ آخر کیوں ایسا ہو رہا ہے۔ سٹالن کے اس رویہ سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے نو سال سٹالن کی معیت میں گزار دیے تھے،

---

[1] سٹالن گراڈ روس کا مشہور شہر ہے۔ یوکرین کے مشرق میں دریائے دولگا پر واقع ہے۔ کیمیائی اشیاء اور زرعی آلات کے لیے مشہور ہے دوسری جنگِ عظیم کا فیصلہ اسی مقام پر ہوا تھا۔ (ستمبر تا نومبر ۱۹۴۲ء) آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب ہے۔

[2] روس کا مشہور شہر جس کا پہلا نام سینٹ پیٹرزبرگ اور پیٹرو گراڈ تھا۔ دریائے نیوا کے منبع پر واقع ہے۔ مشہور یونیورسٹی ہے۔ کپڑا، چمڑا، غلہ اور دیگر اشیا کے لیے مشہور ہے۔ آبادی ۳۲ لاکھ کے قریب ہے۔

اور اب زندگی کی پچیسویں منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس عرصہ میں اگرچہ اُسے دنیوی آرام بہم پہنچانے میں سٹالن نے کوئی کمی نہ کی تھی مگر ——— اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ میریا سے ملنا بھی پسند نہ کرتا تھا ——— ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میریا کو بالآخر پتہ چل گیا ——— نجیدا پہلی بیوی اس کی دنیائے محبّت کو تاراج کرنے کا باعث تھی۔ سٹالن اس سولہ سالہ حسین دوشیزہ کے دامِ حسن میں اسیر ہو گیا تھا۔ اسے نجیدا کے دامنِ صحبت میں پناہ مل چکی تھی ——— وہ میریا کو ترک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جس نے میریا کو زندگی کے نئے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا تھا سے

کبھی کبھی رسن و دار میں بھی بدلے ہیں مسرتوں کے گلوں سے لیے پھندے جھولے

نیا میدان یہ وہ زمانہ تھا جب روس میں کسانوں کی ترقی کے لیے زبردست کوششیں کی جا رہی تھیں زراعت کے لیے جدید قسم کے آلے کسانوں کو بہم پہنچائے جا رہے تھے۔ دوسری طرف برقی ترقی کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ پھر مشہور پنج سالہ منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ زمین کی انفرادی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت کی صورت پیدا کی جائے چنانچہ لینن کا بنایا ہوا "معاشی پروگرام" ختم کر دیا گیا۔ کسانوں سے زمینیں چھین کر انھیں سرکاری ملکیت قرار دے دیا گیا اس سے کسانوں میں بددلی پیدا ہو گئی اور وہ مخالفت پر اُتر آئے۔ حکومت کی طرف سے سختی کی گئی اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ گویا یہ منصوبہ ملک پر زبردستی ٹھونسا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات ایسے تھے کہ سٹالن کو ان میں بہت مصروف رہنا پڑا۔ وہ روس کے مختلف حصّوں میں دورہ کرتا۔ بعض اوقات کئی کئی ماہ باہر گزر جاتے اور اُسے ماسکو آنے کا موقع نہ ملتا۔ میریا اس کے محل میں پڑی عجیب و غریب باتیں سوچتی رہتی تھی۔ وہ سوچتی جس طرح وہ سٹالن کے ہمراہ رہا کرتی تھی اسی طرح اب اس کی نئی محبوبہ اس کے ساتھ سیر و تفریح کرتی ہو گی۔ چنانچہ اس کے دل میں نجیدا کے خلاف مخالفت اور دشمنی کے جذبات شدّت اختیار کرتے گئے۔ اگرچہ اس نے نجیدا کو دیکھا نہ تھا، نہ ہی اس نے سٹالن سے اس کے متعلق کچھ سنا تھا، تاہم اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی زندگی کو برباد کرنے والی صرف نجیدا ہے۔ اگر وہ راستے سے ہٹا دی جائے تو اس کی پُرمسرت زندگی پھر عود کر سکتی ہے اور سٹالن اس سے پھر اُسی طرح محبت کرنے لگ

جائے گا جس طرح پہلے کرتا تھا۔

کسانوں کی بغاوت دبانے کی بہت کوششیں ہورہی تھیں مگر بغاوت شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ تشدد نے لوگوں کو اور زیادہ مشتعل کر دیا تھا۔ انھوں نے نئی مشینیں اور آلات توڑ دیے۔ کھیتی باڑی کرنے سے انکار کر دیا۔ غلّے کے گوداموں میں آگ لگنی شروع ہو گئی۔ فصلیں تباہ کی جانے لگیں۔ حکومت جن کسانوں سے زبردستی کام لیتی وہ نہایت بد دلی سے کام کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی زرعی حالت بہتر بننے کی بجائے اور زیادہ ابتر ہونے لگی۔ سٹالن اور اس کی حکومت کے لیے یہ سخت پریشانی اور مصیبت کا دَور تھا۔

سٹالن نے اپنی پارٹی کے کارکنوں کو سخت سست کہا اور اس گڑبڑ کا سارا الزام ان پر رکھا۔ اس نے کہا کہ حکومت کی طرف سے زیادہ تشدد کیا گیا ہے اور یہ صورت حال انہی زیادتی کے باعث پیدا ہوئی ہے اگر سرکاری کارکن نرمی سے کام لیں تو حالات سدھر سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اجتماعی کاشت اور ریاستی کاشت میں شریک ہونا کسانوں کی مرضی پر ہے جو چاہے اپنی زمین حکومت کو دے اور جو چاہے اپنے پاس رکھے۔ غرض اس اعلان سے کسانوں کو مطمئن کر دیا اور بد امنی کم ہو گئی۔ سلگتی ہوئی آگ دب گئی اور کھیتوں میں امن و سکون سے کام ہونے لگا۔

اب سٹالن نے مختلف علاقوں کے دَورے کیے اور لوگوں کو اطمینان دلایا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے گا اور ہر طرح سے ان کی مدد کی جائے گی۔ کارخانہ داروں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سرکاری خزانے سے کارخانوں کو امداد دی جانے لگی۔ سٹالن خود بڑے بڑے کارخانوں کا معائنہ کرتا اور مزدوروں کی شکایات سن کر ان کی تلافی کا وعدہ کرتا۔ غرض مزدوروں اور کسانوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور کام حسبِ معمول ہونے لگا۔

نئی لذتیں | سٹالن گراڈ کی ایک عالیشان عمارت کے بڑے کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ سٹالن آگ کے قریب کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شاید ملک کے حالات پر غور کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان دوشیزہ نیم عریاں لباس میں اندر داخل ہوئی:

"سن لیا آپ نے!" وہ بڑے وحشت ناک طریقہ سے بولی۔

سٹالن نے سر اٹھایا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر دوڑ گئی

"کیا؟"

"یہی نا جو لوگ کہتے پھر رہے ہیں۔ میرے اور آپ کے متعلق۔"

"نجیدا! یہ بھی کوئی سننے کی باتیں ہیں۔ کہنے دو لوگوں کو۔"

"آپ پرواہی نہیں کرتے۔ آج دوپہر کو میں تھیٹر سے آرہی تھی تو ایک ترکستانی عورت مجھے ملی، اس نے مجھے ایسی باتیں بتائیں جنھیں سننے کی مجھ میں تاب نہ رہی۔ لوگ مجھ پر ہر طرح کی تہمتیں لگا رہے ہیں۔"

"نجیدا! تم ناحق پریشان ہوتی ہو، کہنے دو لوگوں کو، تمھیں مجھ سے غرض ہے یا لوگوں سے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے لوگوں کی ان باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے مگر میں کہتی ہوں کہ آپ یا تو مجھے چھوڑ دیں اور یا جائز طریقہ سے رکھیں۔"

سٹالن نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور دوبارہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "نجیدا، کل ہی ہم دونوں شادی کرلیں گے تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا طے ہوجائے۔"

نجیدا نے اپنے بازو سٹالن کی گردن میں حائل کر دیے۔ سٹالن نے گردن اوپر کی طرف اٹھائی نجیدا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ سٹالن کے قریب کر دیا۔ سٹالن کے ہاتھ اٹھے۔ اس نے نجیدا کو بھینچ لیا۔ دونوں کے لب ملے اور ——— تھوڑی دیر کے بعد نجیدا سٹالن کے پلنگ پر لیٹی مسکرا رہی تھی۔

وفا کے عہد سے دل مطمئن کہاں ہوگا   وفا کا عہد نبھاؤ تو کوئی بات بنے

نیا دور ۱۹۳۴ کا زمانہ تھا۔ سٹالن اپنے محل میں آرام کرسی پر لیٹا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر اور مونچھوں کے بال کہیں کہیں سے سفید ہوچکے تھے۔ اس کی عمر پچپن سال سے کم نہ تھی۔ سامنے اس کی نوجوان محبوبہ نجیدا بیٹھی تھی، جو اس کی نئی دلھن تھی۔ دونوں کی شادی ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ سٹالن اس نئی بیوی کے عشق میں اپنی مرحومہ بیوی اور میریا دونوں کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ اسے شاید یاد بھی نہ رہا ہو کہ میریا بھی اسی شہر میں کہیں رہ رہی ہے۔ کیونکہ میریا کو جب نجیدا اور سٹالن کی شادی کا پتہ چلا تو وہ سٹالن کا محل چھوڑ کر ماسکو میں کسی اور جگہ رہنے لگ گئی تھی۔ اگرچہ سٹالن نے اس سے قطع تعلق نہ کیا تھا، نہ ہی اُسے محل چھوڑنے کو کہا تھا مگر وہ آنے والی دلھن کے لیے

محل کو خالی کرنا ضروری خیال کرتی تھی۔ چنانچہ سٹالن اب نجیدا کو یہاں لے آیا تھا۔

سٹالن اخبار پڑھتا جارہا تھا ساتھ ہی نجیدا سے بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں دو فوجی افسر اندر داخل ہوئے اور سلام کرنے کے بعد کچھ کاغذات میز پر رکھ دیے۔ سٹالن نے باوقار انداز سے افسروں کی طرف دیکھا۔ "سارے کاغذات ساتھ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں" وہ یکزبان ہو کر بولے۔ سٹالن نے میز پر سے کاغذات اٹھائے، سرسری نظر ان پر ڈالی اور افسروں کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کاغذات دوبارہ میز پر رکھ دیئے۔ افسر چلے گئے۔ سٹالن نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا اور میز کے قریب ہو کر کاغذات پڑھنے شروع کر دیے۔

"نجیدا! ملک کا نیا دستور بنایا جا رہا ہے۔ پہلا دستور جو آج سے تیرہ برس قبل بنایا گیا تھا وہ بہت زیادہ آمرانہ تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس میں لوگوں پر قدرے سختی روا رکھی گئی ہے اب میں نے اس میں ترمیم کر کے (کاغذات نجیدا کے سامنے رکھتے ہوئے) اسے دوسری شکل دی ہے یہ پہلے سے کم آمرانہ ہے۔"

نجیدا مسکرا دی "میں اسے کیا سمجھوں گی ——— ٹھیک ہوگا۔ میں نے کوئی اس کی منظوری تھوڑی دینی ہے کہ اسے پڑھوں۔"

سٹالن مسکرانے لگا "مگر سٹالن تو کوئی کام تمھاری منظوری کے بغیر نہیں کرتا اور نہ کبھی کریگا تم اسے سمجھو یا نہ سمجھو آخری منظوری تمھاری ہی ہوگی۔"

نجیدا زور زور سے ہنسنے لگی۔

سٹالن نے دستور کے کاغذات اٹھالیے اور نجیدا سے اجازت لے کر باہر باغ میں چلا گیا، جہاں کرسیاں لگی تھیں اور دو پہرے دار بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ انھوں نے سٹالن کو دیکھتے ہی فوجی سلام کیا۔ سٹالن کرسی پر بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگا[1]۔

---

[1] روس کا پہلا دستور ۱۹۲۳ء میں بنایا گیا تھا مگر وہ زیادہ آمرانہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں دوسرا دستور تیار کیا گیا جس میں نرمی برتی گئی تھی۔ پہلے دستور میں خفیہ ووٹ کا ذکر نہ تھا۔ اس دستور میں خفیہ ووٹ کا اصول رائج کیا گیا۔ اور اس اعتراض کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ روس میں کمیونسٹ جماعت کے سوا کوئی دوسری جماعت

(باقی اگلے صفحہ پر)

حرماں نصیب | میریا کی مسرتیں ختم ہو چکی تھیں اس کی زندگی ایک طوفان خیز سمندر میں ہچکولے لے رہی تھی۔ اس کے دل کی بستی برباد ہو چکی، جس مستقبل کی خوشی میں اس نے گھر بار چھوڑا، عزیز چھوڑے، سہیلیوں سے ہوئی اور مادرِ وطن کو خیرباد کہہ کر پردیس میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ تاریک ہو چکا تھا۔ جب تک اس نے نجیدا کا نام نہ سنا تھا وہ سمجھتی تھی شاید سٹالن محض اپنی مصروفیات کے باعث اس سے دُور رہنے لگ گیا ہے اور اگر یہ نہیں کوئی اور وجہ ہے تو وہ اُسے اپنی محبّت کا واسطہ دے کر دوبارہ اپنی طرف مائل کر لے گی اور اسی کے قدموں میں اپنی زندگی گزار دے گی، لیکن جب سے اُسے نجیدا کی کارگزاریوں کا علم ہوا تھا اس کی ساری توقعات مایوسی کے المناک اندھیرے میں ڈوب کر فنا ہو چکی تھیں۔ وہ نجیدا کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ وہی اس کی تباہی کا باعث تھی۔ اسی نے اس کی پُرمسرت زندگی کی بہار لوٹی تھی۔ وہی اس کے محبوب کو گمراہ کرنے کا موجب تھی۔ اس نے اس کے خرمنِ آرام و راحت میں آگ لگائی تھی۔ وہی یہ سب کچھ کر رہی تھی ——— میریا نے تہیہ کر لیا کہ وہ نجیدا کو ٹھکانے لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کرے گی۔

> گرد اڑتی ہے خیابانِ تصوّر میں مگر !
>
> گرد میں چند شرارے بھی ہیں سرگرمِ خرام

بھیانک انتقام | رات کے ہیبت ناک سناٹے میں ماسکو کے ایک ویران مقام پر دو عورتوں کی سرگوشیوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے تم یہ کام بخیر و خوبی انجام دے لو گی۔ میں ساری عمر تمھارا احسان نہ بھولوں گی۔" یہ میریا کی آواز تھی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۵) بنانے کی اجازت نہیں۔ اس دستور کے ذریعہ ٹریڈ یونینوں، کوآپریٹو سوسائٹیوں نوجوانوں کی انجمنوں اور تہذیبی اداروں کو بھی اپنے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا حق دیا گیا۔ مگر شرط یہ تھی کہ یہ ادارے اشتمالیت کے خلاف نہ جاسکتے تھے۔ اس دائرے کے اندر رہکر جو چاہیں کر سکتے تھے۔ اس دستور کے مطابق ریاست کا نام مزدوروں اور کسانوں کی اشتراکی ریاست، رکھا گیا۔ مرد اور عورت دونوں کو ہر مسئلے اور ہر باب میں مساوی حقوق دیے گئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی عوامی تعلیم میں مذہب مخل ہوگا۔ البتہ ذاتی طور پر ہر شخص مذہب کو تسلیم کرنے یا مذہبی رسوم ادا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مذہب کا پراپگنڈا کرنے کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے مگر مذہب کی حمایت میں تبلیغ کرنے یا مذہبی تعلیم دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں وغیرہ وغیرہ۔

"میریا!" دوسری عورت نے کہا "مجھے اپنی جان کی تو پروا نہیں مگر مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہیں تم پر . . . . . ."

میریا نے عورت کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم بے فکر رہو۔ میں اس زندگی سے عاجز آ چکی ہوں۔ اگر میری جان چلی جائے تو تم بھی اس پر افسوس نہ کرنا، میں جانتی ہوں تم نے اس کام کی حامی بھر کر مجھ پر ایک ایسا احسان رکھ دیا ہے جس کا بدلہ میں تا عمر نہ چکا سکوں گی مگر بیڈا! یاد رکھو یہ احسان صرف مجھ پر نہ ہوگا بلکہ میں جانتی ہوں کہ تم سٹالن پر بھی احسان کرو گی۔ اس بدبخت عورت نے اس پر ایسا قبضہ جما رکھا ہے کہ سرکاری کاروبار میں بھی دخل دیتی ہے اور قدم قدم پر سٹالن کو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ وہ روس کے عوام کے لیے بھی کسی حالت میں بہتر نہیں ہو سکتی اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔"

"میریا۔ تمھیں شاید احساس نہ ہو کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ میرے کوئی اولاد نہیں اور جب تک تم محل میں رہیں میں تمھیں اپنی ہی بچی کی طرح سمجھتی رہی اور تمھاری وجہ سے میرے دل کو سکون میسر تھا۔ تمھارے چلے جانے کے بعد میرے لیے محل میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ جب سے نجیدا وہاں آئی ہے وہ بات بات پر مجھے ٹوکتی اور مجھ پر خفا ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ مجھے گالیاں دینے لگتی ہے جو میں برداشت نہیں کر سکتی مگر میں نے کبھی اسے نقصان پہنچانے کے متعلق نہ سوچا۔ اب جبکہ تم نے ساری صورت حال میرے سامنے رکھی ہے میں سمجھتی ہوں تمھیں نقصان پہنچانے کا اصل باعث نجیدا ہی ہے۔ اور تم یہ ٹھیک کہتی ہو کہ وہ سٹالن کی شہرت کو دھبا لگا دے گی۔ گویا وہ میرے اور سٹالن کے لیے بھی اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنی تمھارے لیے۔ چنانچہ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینے میں ہم تینوں کا فائدہ ہے۔ میں یہ کام ضرور کر کے رہوں گی۔"

میریا نے زہر کی چھوٹی سی شیشی بیڈا کے حوالے کرتے ہوئے کہا "ہمیں زیادہ دیر تک یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ یہ لو شیشی اور اب ہمیں رخصت ہو جانا چاہیے۔"

میریا نے بیڈا کو الوداع کہا۔ بیڈا محل میں چلی گئی اور میریا بھی واپس آ گئی۔ ٥

جذبۂ شوق کے دامن کا سہارا لے کر ۔۔۔ چھین لے دستِ ستمگر سے خزینہ اپنا

سرمئی انجام | رات کے سناٹے میں ایک تیز رفتار کار پوری تیزی کے ساتھ تاریکی کو چیرتی ہوئی کریملن[1] کے پھاٹک پر آکر رکی۔ فوجی پہرے داروں نے کار کو پہچان لیا اور پہلے سے زیادہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ روس کا ڈکٹیٹر کار سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے محافظ دستے کے فوجی افسر نیچے اُترے۔ پہرے داروں نے فوجی سلام کیا۔ پھاٹک کھول دیا گیا۔ سٹالن غیر معمولی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اور سیدھا نجیدا کے کمرے میں پہنچا۔ نجیدا بستر پر پڑی کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر پاس کھڑے تھے۔ سٹالن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ نجیدا نے سٹالن کو دیکھتے ہی منہ کھولا شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر زبان جواب دے چکی تھی۔ نجیدا کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ سٹالن اپنی محبوبہ کی لاش پر گم سم کھڑا تھا۔ دنیا نے پہلی مرتبہ روس کے آہنی انسان کی آنکھوں میں غم کے آنسو دیکھے۔ "نجیدا! تیرے دشمنوں کا بُرا ہو" سٹالن کی زبان سے نکلا اور وہ لاش پر جھک کر رونے لگا۔

ماسکو ریڈیو سے اعلان ہوا سٹالن کی محبوب بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اگلے روز اخباروں میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک سرکاری اعلان بھی شائع ہوا جس میں کہا گیا کہ کسی دشمن نے اس کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ مجرم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

مجھے گلوں کے سلگتے پیکر دکھا کے افسردگی نہ بخشو!
میں جانتا ہوں انھیں کے شعلے جلائیں گے شاخِ آشیاں بھی

---

[1] ماسکو میں سٹالن کے محل کا نام۔ یہ ایک وسیع قلعہ نما عمارت ہے جس میں روس کے شہنشاہ رہا کرتے تھے۔ اس کے اندر بڑا گرجا ہے جس میں بادشاہوں کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوا کرتی تھی۔ آجکل یہ جگہ سوویٹ روس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

کمال اتاترک
لطیفہ خانم

کمال اتاترک ـــــ اور ـــــ لطیفہ خانم

لطیفہ کی روش ایسی ہوگئی تھی کہ میں کسی
طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ
میرا پروگرام بدل دینا چاہتی تھی۔
(اتاترک)

میرا جرم ٹھیک وہی ہے جو جوزیفائن کا
تھا۔ میں بانجھ تھی، میں اولاد پیدا نہ کر سکی
میرے لیے یہ فخر کافی ہے کہ میں ترکی کے
نجات دہندہ کی مطلقہ بیوی ہوں۔ (لطیفہ)

دیارِ حُسن ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کی صبح ترکوں کے لیے مسرت و شادمانی کا پیغام لے کر آئی۔ سمرنا[1] فتح ہوگیا اور ترکی فوجیں اپنے اکتالیس سالہ جرنیل کی قیادت میں فاتحانہ انداز سے شہر میں داخل ہو رہی تھیں۔ شہر کے مختلف اطراف میں یونانیوں کو ان کے مظالم کی پاداش میں تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ لوگ خوف کے مارے گھروں میں چھپ گئے۔ یونانی جھنڈے سرنگوں تھے۔ یونانی سپاہیوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اچانک کشت و خون بند کرنے کا حکم دیا گیا اور اعلان ہوا کہ عیسائیوں، یہودیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں، اور تمام دشمنوں کی جان بخشی کی جاتی ہے۔

یہ اعلان سُن کر لوگ بے خوف و خطر گھروں سے نکل آئے۔ فاتح افواج کا خیر مقدم کرنے کے لیے دو رویہ قطاریں لگ گئیں۔ "مصطفےٰ کمال زندہ باد" اور "ترک غازی زندہ باد" کے نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ ترک افواج کے داخلے کے وقت عام شہریوں میں سراسیمگی اس لیے پھیل گئی تھی کہ اس سے قبل وہ شہر میں یونانیوں کے داخلے کا منظر دیکھ چکے تھے۔ یونانیوں کو پہلی جنگ عظیم کے بعد سمرنا اور تھریس کے علاقے بخش دیے گئے تھے اور انھوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرتے ہی باشندوں کو مظالم کا نشانہ بنایا اور وہ تباہی مچائی کہ الاماں۔ چنانچہ آج جب ترک شہر پر قابض ہوگئے تو وہی پہلا نقشہ پھر نظروں کے سامنے آگیا۔ لوگوں کا پُرانا

---

[1] ترکی کا مشہور قدیم شہر جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے درمیان خلیج کے سرے پر واقع ہے۔ آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔

خوف وہراس عود کر آیا کہ نہ جانے یونانیوں سے انتقام لیتے وقت ترک انھیں بھی ختم کر دیں اور یہی عوام کی دہشت زدگی کا باعث تھا مگر جب فاتح جرنیل مصطفےٰ کمال پاشا نے عام شہریوں کے علاوہ دشمنوں کو بھی امن دینے کا اعلان کر دیا تو ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا اور اس عظیم کردار کے انسان کو دیکھنے کے لیے سڑکوں، چوراہوں، گلیوں اور مکانوں پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔

ظہورِ حسن ترک سپاہی اور افسر شہر کا نظم و نسق بحال کرنے میں لگ گئے۔ اس دوران میں مصطفےٰ کمال بھی امن و سکون کے انتظامات دیکھنے کے لیے شہر کا دورہ کرتے۔ رؤسا اور دوسرے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ عام شہریوں سے بھی تبادلہ خیال کرتے۔ اس دوران میں ایک حسین و جمیل نوجوان خاتون ان کی ملاقات کے لیے آئی۔ اس کا حسن چاند کو شرماتا تھا۔ نہایت نفیس اور قیمتی لباس اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ وہ مصطفےٰ کمال سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ کمال نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

خاتون کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی جس نے لحظہ بھر کے لیے کمال کو حیرت میں ڈال دیا۔ خاتون کے چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ کوئی فریاد یا درخواست لے کر آئی ہے۔ کمال نے بھانپ لیا اور استفہامیہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور قبل اس کے اس سے کچھ پوچھتے وہ خود ہی اپنا مدعا بیان کرنے لگی۔

پسِ پردہ خاتون نے بتایا کہ وہ سمرنا میں رہتی ہے۔ جب یونانیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو وہ اسے بھی مشتبہ افراد میں شمار کرتے تھے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ترکوں کو تمام خبریں اور سامانِ رسد پہنچاتی ہے۔ اگرچہ ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا تاہم محض شک کی بنا پر یونانیوں نے اس کا عالیشان مکان جلا دیا تھا اور جتنی مدت یونانی سمرنا پر قابض رہے اسے ایک دن بھی آرام سے رہنا نصیب نہیں ہوا۔ خاتون نے کہا کہ میں ہمیشہ یہ دعا کیا کرتی تھی کہ آپ کو خدا نے فتح دے کر سمرنا میں آنے کا موقعہ دیا تو میں اس خوشی میں اپنے گھر پر آپ کو دعوت دوں گی اور ماحضر کے لیے درخواست کروں گی، سو میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ آپ سمرنا میں تشریف لائے اور مجھے ملاقات کا شرف بخشا۔ اب میری دلی خواہش ہے کہ آپ میرے ہاں تشریف لائیں۔ خاتون نے یہ بھی بتایا کہ میرے والد پیرس میں ہیں اور اس جنگ کے دوران یونانیوں نے مجھے قید کر

رکھا تھا اور آپ کی فتح ہی کے طفیل مجھے اس قید سے رہائی نصیب ہوئی ہے۔

مصطفےٰ کمال نے نہایت غور سے اس خاتون کی باتیں سنیں اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ خاتون کا انداز بیان اتنا میٹھا اور دلکش تھا کہ کمال اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے پھر اس کے حسین چہرے اور موٹی موٹی آنکھوں کی دلکشی نے بھی ترکی کے اس آہنی مردِ میدان کے دل کو موہ لینے کا کام انجام دیا۔ وہ انکسار کے طور پر نظریں جھکا کر جواب کا انتظار کرنے لگی۔ مصطفےٰ کمال سوچ میں پڑ گئے، پھر قدرے توقف کے بعد بولے" آپ پر جو واردات گذری ہے اس نے مجھے آپ کی قومی ہمدردی، جرأت اور بہادری کا قائل کر دیا ہے اور واقعی مادرِ ملک کو ایسی ہی دلیر اور بہادر بیٹیوں کی ضرورت ہے۔ میرے لیے آپ نے جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور جہاں تک دعوتِ طعام کا تعلق ہے، افسوس ہے کہ میں اسے قبول کرنے سے معذور ہوں"

کمال کے اس جواب نے خاتون کے چہرے پر پژمردگی کی لہر دوڑا دی، وہ اس یقین کیساتھ آئی تھی کہ مصطفےٰ کمال اس کی دعوت کو رد نہ کریں گے بلکہ ضرور قبول کر لیں گے مگر خلاف توقع بات سن کر اُسے سخت صدمہ پہنچا تاہم وہ مایوس نہ ہوئی اور جرأت کر کے اصرار کرنے لگی۔ یہاں تک کہ منت سماجت پر اُتر آئی۔ اس نے اپنے گلے سے لاکٹ کھولی اور اس میں سے مصطفےٰ کمال کی تصویر نکال کر انھیں دکھائی اور کہا کہ میں نے قرآن پر عہد کیا تھا کہ اگر خدا نے یونانیوں سے نجات دلا دی تو میں آپ کی دعوت کروں گی اور آپ کو اپنے گھر بلانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لاؤں گی خدارا آپ میرا دل نہ توڑیے۔

نادانستہ مصطفےٰ کمال نے اس کے جذبہ وایثار سے متاثر ہو کر دعوت قبول کر لی اور اس طرح تاریخ کا وہ حسرت ناک باب کھل گیا جس میں ترکی کا یہ مردِ غازی توپ اور تلوار کے دوش بدوش حسن و عشق کی نظر فریب وادیوں میں سیر کرتا نظر آتا ہے۔ دعوت کی یہ پُرمسرت تقریب معزز مہمان اور میزبان دونوں کے حق میں ایک افسوسناک رومانی اور ازدواجی ابتلا کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور بالآخر کچھ عرصہ بعد دنیا نے اس معزز میزبان کی زبانی سن لیا کہ" میں آج بھی ان پر اسی طرح فریفتہ ہوں جس طرح سمرنا میں پہلی ملاقات میں فریفتہ تھی لیکن وہ انانیت ہے جو محبت کے پاک جذبہ پر غالب آگئی ہے۔"

اس بیس سالہ خاتون کا نام لطیفہ خانم تھا۔

چونکہ اس رومانی داستان کے ساتھ ٹرکی کے سیاسی حالات اور مصطفیٰ کمال کی سیاسی اور جنگی سرگرمیوں کا بھی گہرا تعلق ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے، تاکہ مصطفیٰ کمال اور لطیفہ خانم کے خیالات اور ان کے باہمی تعلقات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

ٹرکی پہلی جنگِ عظیم دنیا کی تباہی اور بربادی کا پیغام لے کر آئی۔ بڑی بڑی سلطنتیں مٹ گئیں، کئی ملک تباہ و برباد ہو گئے۔ کئی قومیں بلندی سے پستی میں اتر گئیں اور کئی اس کے برعکس تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا تک جا پہنچیں۔ اس جنگ کے نتیجہ میں ایک ایسا انقلابِ عظیم رونما ہوا جس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔

روس، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں جو انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں انھوں نے یورپ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ پھر اسلامی ممالک بھی اس تباہی سے محفوظ نہ رہے۔ بلادِ عرب کے بیشتر علاقے برطانیہ، فرانس اور دوسرے ملکوں کے قبضہ میں دے دیے گئے اور ٹرکی کی سلطنت کے تو بالکل حصے بخرے کر کے رکھ دیے گئے۔

معاہدہ سیورے کی رو سے ایشیائے کوچک کے سوا باقی تمام علاقے ترکی سے علیٰحدہ کر دیے گئے۔ بحرِ اسود کا ساحلی علاقہ اتحادی کمیشن کے سپرد ہوا۔ سمرنا اور اس کے گردونواح کا ایک وسیع علاقہ یونان کو ملا۔ جنوبی ساحل کا ایک زرخیز ٹکڑا اٹلی کو بخش دیا گیا، تھریس کو بھی یونان میں شامل کر دیا گیا۔ اس تقسیم کے بعد جو بنجر، بے آب و گیاہ اور بے کار علاقے بچ گئے وہ ٹرکی کے پاس ہی رہنے دیے گئے۔ گویا بیرونی طاقتوں نے ٹرکی پر ایسا کلہاڑا چلایا کہ وہ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگا اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہ تھا۔ یورپ میں اسے "مردِ بیمار" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اس "مردِ بیمار" کو مردِ توانا اور مردِ میدان بنانے کا سہرا جس عظیم شخصیت کے سر ہے، وہ مصطفیٰ کمال پاشا ہے جسے اس کی بے لوث ملکی اور قومی خدمات کے سلسلے میں ترکوں نے اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب دیا اور جس نے پندرہ سولہ برس کے اندر اندر ٹرکی کی کایا

پلٹ کر رکھ دی۔

مصطفےٰ کمال پاشا | مصطفےٰ کمال پاشا ۱۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا پیشہ تجارت تھا۔ مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی جس کے نتیجہ میں مصطفےٰ کمال کو ابتدائی زندگی میں فارغ البالی نصیب نہ ہو سکی تاہم والدہ نے فوجی کالج میں تربیت دلائی اور وہ بیس سال کی عمر میں فوج میں بطور لفٹیننٹ بھرتی ہو گئے۔

اس وقت عبدالحمید ترکی کا سلطان تھا اور ملک کو ترقی کی طرف لے جانے کے بجائے تباہی کی طرف لے جا رہا تھا۔ مصطفےٰ کمال وطن کے شیدائی تھے اس لیے سلطان کے خلاف تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد ازاں رہا ہونے پر انھوں نے ملک کی از سرِ نو تنظیم کرنے کے لیے "وطن" کے نام سے ایک انجمن بنائی جو خلاف قانون قرار دے دی گئی اور مصطفےٰ کمال اور دوسرے تمام ممبروں کو ملک کے دور دراز علاقوں میں متعین کر دیا گیا۔ چنانچہ کمال کو دمشق کی طرف بھیج دیا گیا اور ایک فوج میں کپتان مقرر کر دیے گئے یہاں "وطن" ہی کے انداز پر "اتحاد و ترقی" کے نام سے ایک خفیہ انجمن کام کرتی تھی۔ کمال اس کے ممبر بن گئے اور یہ انقلابی جماعت ترقی کرنے لگی۔

بعد ازاں انقلابی جماعت کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے سالونیکا میں نظر بند کر دیا گیا اور محمد ارشاد محمد خامس کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

۱۹۱۱ اور ۱۹۱۴ کے درمیانی عرصہ میں مصطفےٰ کمال شمالی افریقہ اور بلقان کے علاقوں میں مصروفِ جنگ رہے پھر پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے پر لفٹننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز ہوئے اور گیلی پولی کے محاذ پر انگریزوں کو پسپا کرنے میں شاندار کام انجام دیا جس سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

جنگِ عظیم کے خاتمہ پر سلطنت عثمانیہ کا مکمل زوال ظہور میں آنے لگا تو دراصل ہی مصطفےٰ کمال کا آفتاب ترقی بلند ہونے لگا۔ اور وہ دشمن کے ساتھ کھلے طور پر جنگ آزما ہونے لگے۔

ڈکٹیٹر شپ | ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء اور ۳۰ اگست ۱۹۲۲ء کے درمیانی مدت میں وہ ترک فوجوں کے ہمراہ دشمن کے ساتھ جنگ آزما ہوتے رہے اور فتح پر فتح حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ

اگست ۱۹۲۲ء تک وہ ٹرکی کی سرزمین کو غیر ملکی فوجوں سے بالکل پاک کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے اور قوم نے متفق الرائے ہوکر انھیں ٹرکی کا ڈکٹیٹر مقرر کردیا۔

دامِ محبت | پہلی جنگِ عظیم کے نتیجہ میں سمرنا اور تھریس کے علاقے یونانیوں کے قبضہ میں آچکے تھے۔ ترک ہر قیمت پر یونانیوں کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۲۲ء کو ترکوں نے حملہ کرکے یونانیوں کے اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔ دلوپانار کی جنگ میں مصطفےٰ کمال خود انچارج تھے۔ اس جنگ میں یونانی بھاگ نکلے اور ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترک سمرنا میں داخل ہوگئے۔ یہیں مصطفےٰ کمال سے لطیفہ خانم کی ملاقات ہوئی اور لطیفہ نے انھیں اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔

بجا کہ دل کی گرہ کھولنے کا غم ہوگا ۔۔۔ حدیثِ درد کہوگے تو درد کم ہوگا

لطیفہ خانم | لطیفہ خانم تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ حسن و جمال کے ساتھ دولت بھی حصہ میں آئی تھی۔ والد جہاز ران تھے اور خود بھی کئی جہازوں کے مالک تھے جن دنوں مصطفےٰ کمال سے لطیفہ کی ملاقات ہوئی ان دنوں لطیفہ کے والد پیرس میں تھے اور مصطفےٰ کمال بذات خود بھی انھیں جانتے تھے۔ لطیفہ نے قسطنطنیہ کے امریکی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ پھر قانونی کالج پیرس میں بھی پڑھتی رہی۔ اس نے سارے یورپ کی سیاحت کی تھی۔ کئی زبانوں میں مہارت رکھتی تھی۔ گفتگو نہایت شستہ اور اعلیٰ تھی۔

دعوتِ طعام | مصطفےٰ کمال نے پہلی ملاقات میں ہی لطیفہ کے جملہ اوصاف کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ اس کی دلجوئی کے لیے بالآخر انھیں دعوت قبول کرنی پڑی۔ لطیفہ نے نہایت عالیشان دعوت کا اہتمام کیا۔ لطیفہ کا محل یونانیوں نے جلادیا تھا مگر وہ ایک اور عالیشان مکان میں رہنے لگی تھی۔ اسی مکان میں اس نے کمال کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد لطیفہ نے کمال کو مجبور کیا کہ وہ کچھ دن اس کے ہاں اسی مکان میں قیام کریں۔ چونکہ لطیفہ کی شرافت نے کمال کو بیحد متاثر کرلیا تھا، لہذا انھوں نے وہاں قیام کرنا بھی منظور کرلیا اور چند دن تک وہاں رہے۔ اس اثنا میں اکثر دوپہر کے وقت دونوں دیر تک باتیں کیا کرتے۔ ان ملاقاتوں میں کمال نے محسوس کرلیا کہ ایسی عورت ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

کمال کا اقرارِ محبت | کمال کے پہلو میں دل تھا وہ لطیفہ خانم کے لیے محبت کے جذبات

محسوس کرنے لگے ادھر لطیفہ کے انداز بھی صاف بتا رہے تھے کہ اُسے کمال سے محبت ہو گئی ہے۔ غرض دونوں طرف سے ان جذبات کی قدر کی گئی اور ایک موقعہ پر کمال کو اس کا اظہار بھی کر دینا پڑا مگر ان کا خیال تھا کہ جب تک ملک قطعی طور پر آزاد نہ ہو جائے وہ شادی نہ کریں گے۔ یہ بات بھی انھوں نے لطیفہ سے کہہ دی اور یہ بھی بیان کر دیا کہ وہ اس سلسلہ میں قسطنطنیہ کی نجات اور کانفرنس کے خاتمہ کے منتظر ہیں ؎

میری نگاہ میں شادابیٔ چمن ہی نہیں　　میں ریگ زاروں کے تشنہ لبوں کی پیاس بھی ہوں

ابتلا کا دور ملک کے حالات ایسے تھے کہ کمال زیادہ عرصہ تک لطیفہ کے ہاں نہ ٹھہر سکے اور سمرنا سے بروسہ[1] پہنچے۔ کمال کی روانگی لطیفہ کے لیے سخت صدمے کا باعث بنی مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ کمال کے قومی فرائض کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ رخصت سے قبل کمال نے جو وعدہ اس سے کر لیا تھا وہ کسی حد تک اس کے اطمینان کا باعث تھا۔

کمال کو سمرنا سے گئے ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا۔ اس اثنا میں لطیفہ پر کیا گزری، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال لطیفہ کے لیے یہ ابتلا کا دور سمجھنا چاہیے۔ وہ اس انتظار میں رہی کہ کمال جلد لوٹ کر آئیں گے، مگر ڈیڑھ ماہ گزر گیا کمال کی طرف سے لطیفہ کو کوئی نامہ و پیام نہ ملا۔

خفیہ عقد ڈیڑھ ماہ بعد مصطفےٰ کمال اچانک سمرنا پہنچے اور سیدھے لطیفہ خانم کے ہاں پہنچے۔ لطیفہ اس وقت گھر پر موجود تھی کمال کو دیکھتے ہی حیرت میں پڑ گئی۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس نے کمال کا خیر مقدم کیا۔ پھر باہم باتیں ہونے لگیں۔ کمال نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آئے ہیں۔ اور خواہش ظاہر کی کہ ہمارا نکاح شریعت کے مطابق ہو گا جس میں کوئی غیر شرعی رسم ادا نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس نکاح کا عام چرچا کیا جائے۔ لطیفہ کی جائے رہائش شہر کے مضافات میں تھی۔ چنانچہ نکاح کی رسم ادا کرنے کے لیے دونوں شہر میں آئے اور ایک مسجد میں نکاح ہوا۔ ٹرکی کی سب سے بڑی شخصیت کا اس طریقے سے خاموش نکاح ادا کرنا بہت معنی خیز تھا۔ لطیفہ خانم کے لیے یہ بات حیران کن ضرور تھی مگر وہ

---

[1] ٹرکی کا مشہور شہر جو استنبول سے قریباً ساٹھ میل جنوب میں واقع ہے۔ سلطنت عثمانیہ کا وارالخلافہ تھا۔ اس سے پہلے عیسائیوں کے دور میں بوتھینیا کا صدر مقام تھا۔

اسی میں خوش تھی ؎

خیال و خواب حقیقت کے روپ میں ابھرے
تمام رات مرے بازوؤں میں تم جھولے!

عقد کے بعد نکاح کے بعد کمال لطیفہ خانم کے ہاں واپس آ گئے اور کچھ مدت تک وہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں دونوں سیر کے لیے مختلف دیہات میں جاتے۔ دیہاتیوں کی شکایتیں سنتے اور انھیں رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح چند لوگوں کو پتہ چل سکا کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔

جمہوریت کا اعلان اس وقت تک سلطان عبدالمجید ترکی کے تخت پر متمکن تھا۔ چونکہ سیاسی حالات ایسے تھے کہ ملک کو سلطان کے پنجوں سے نجات دلانا ضروری تھا اس لیے ۱۹۲۳ کی شام کو مصطفےٰ کمال نے اپنے خاص احباب کو کھانے کی دعوت دی اور یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا چنانچہ طے پایا کہ اس مرض کا علاج جمہوریت کے سوا کوئی نہیں۔ اور اس کا اعلان کر دیا جائے۔

مصطفےٰ کمال بہ حیثیت صدر اگلے روز پارلیمنٹ میں مصطفےٰ کمال نے جمہوریت کا بل پیش کرنے کی اجازت چاہی، تو فلک بوس نعروں سے ہال گونج اٹھا۔ اور طے پایا کہ مصطفےٰ کمال چار سال کے لیے جمہوریت کے صدر چنے جائیں۔ خلیفہ عبدالمجید کو جلاوطن کر دیا گیا۔

لطیفہ خانم کو طلاق مصطفےٰ کمال اور لطیفہ خانم کی ازدواجی زندگی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی اور جلد ہی ان میں طلاق ہو گئی۔ اس طلاق کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ لطیفہ خانم انھیں مجبور کرتی تھی کہ وہ خلافت کو منسوخ نہ کریں اور خود تخت خلافت پر بیٹھیں مگر مصطفےٰ کمال ترکی کو جمہوریہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ "مصطفےٰ کمال آف ترکی" کا انگریز مصنف بھی ایسا ہی لکھتا ہے۔

آرم سٹرانگ اپنی کتاب "گرے ولف"[1] میں لکھتا ہے کہ لطیفہ کے عزیز و اقارب حکومت

---

[1] آرم سٹرانگ کی اس کتاب کے متعلق یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس میں مصطفےٰ کمال کی ذات کے متعلق بعض ایسی نازیبا باتیں کہی گئی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی کسی تاریخ میں ان کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً

(باقی صفحہ۱۱۷ پر)

کے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے تھے اور مصطفےٰ کمال کو ان کی یہ حرکتیں ناگوار گزرتی تھیں۔

سر عبدالقادر بھی سیاسی اختلافات کو اس طلاق کا سبب قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں "بعض سیاسی امور میں اختلاف ہو جانے سے انھیں ایک دوسرے سے الگ ہو جانا پڑا۔" اور یہ سیاسی اسباب یہی نظر آتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال اپنے مفاد پر ملک کے مفاد کو ترجیح دیتے تھے یعنی انھوں نے خلافت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا[۱] تھا اور شاید لطیفہ خانم خلافت کے حق میں ہو، اس لیے کہ اس طرح ملکہ بن کر وہ خود بھی زیادہ عزت و اہمیت حاصل کر سکے گی۔ اگرچہ وہ اپنی ذاتی ترقی کے لیے اس طرح سوچ رہی تھی اور ایک عورت کے سوچنے کا عام انداز بھی ہو سکتا ہے، پھر یہ کہ اس سوچ کے پسِ پشت محبت کے وہ جذبات بھی تھے جو مصطفےٰ کمال کے لیے لطیفہ کے دل میں پیدا ہو چکے تھے۔ اور وہ اس معاملے میں زیادہ مجرم قرار نہیں دی جا سکتی مگر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۶) مصنف نے جس لڑکی سے کمال کا عشق بتایا ہے وہ تپ دق کی مریضہ تھی اور لارڈ ایورسیلے نے اپنی کتاب "دی ٹرکش ایمپائر" میں لکھا ہے کہ یہ لڑکی مصطفےٰ کمال کی سگی بہن مقبولہ کی بیٹی تھی جو علاج کی غرض سے اپنے ماموں (مصطفےٰ کمال) کے پاس آئی ہوئی تھی۔

آرام سٹرانگ نے اس کتاب میں کئی دوسری عورتوں کو بھی مصطفےٰ کمال کی جنسی سرگرمیوں کا نشانہ بتایا ہے یہاں تک کہ کمال کی ذات کو "شریف عورتوں کے لیے خطرہ" کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب اتہامات ہیں جنھیں انگریز مصنف نے انگریزوں کی سیاسی رقابت کے تحت تراشا ہوگا۔

[۱] خلافت کی منسوخی کے بعد ترکی میں زبردست تحریک اٹھی کہ کمال کو خلیفہ بنایا جائے۔ اسلامی ملکوں سے بھی خواہشیں آئیں مگر مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ اگر خلیفہ ہی بنانا مقصود ہے تو آلِ عثمان سے بہتر اس کا کوئی حقدار نہیں۔ آرمسٹرانگ لکھتا ہے کہ مصطفےٰ کمال بادشاہت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اسے قبول کرنا گناہِ عظیم خیال کرتے تھے۔ اسی زاویہ نگاہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے البانیہ کی بادشاہت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ورنہ عز احمد کو جو البانیہ کا بادشاہ تھا خط لکھا جس کے ہر لفظ سے قربانی اور ایثار کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے لکھا کہ کاش تم جمہوریت کی بنیاد رکھ کر اپنے ملک اور سلطنت کو مضبوط اور مستحکم بناتے تاکہ اسلامی سلطنت ہمیشہ کے لیے ہوس اور نفس پرست لوگوں کے پنجہ سے آزاد ہو جاتی اور تمام سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

(باقی صفحہ ۱۱۸ پر)

اپنی اس خواہش پر اس کا اصرار کرنا گویا شوہر کے سیاسی شعور اور ملکی مفادات کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا اور یہی بات مصطفےٰ کمال کو مشتعل کرنے کا موجب ہوگی جیسا کہ مصطفےٰ کمال کے بیان میں آگے آئے گا۔

مختلف بیانات سر عبداللہ لکھتے ہیں[1]:

مصطفےٰ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا مگر اس کی دو بہنیں تھیں وہ بھی ماں کے نقش قدم پر چلتی تھیں۔ اس لیے وہ بھی مصطفےٰ کو ہمت دلانے اور ایثار کے ارادوں میں مستحکم رہنے میں مددگار ہوئیں۔ شاید انہی ایام ابتدائی اثرات کا یہ نتیجہ ہے کہ مصطفےٰ کمال عورت ذات سے بہت ہمدردی رکھتا ہے اور عورتوں کی ترقی کا دل سے خواہاں ہے گو جوان ہو کر اس نے دیر تک شادی نہیں کی مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ حسنِ نسوانی سے بے پروا یا محبتِ نسوانی سے بے نیاز تھا بلکہ اس کی حبِ وطن حبِ زن پر غالب آئی اور وطن کی مشکلات دیکھ اس نے عہد کیا کہ جب تک وہ ان مشکلات کو حل نہ کر لے شادی نہیں کرے گا۔ جب مشکلات کا بادل قدرے پھٹا اور امید کی کرن نظر آنے لگی تو قدرت نے اس کے لیے ایک رفیقۂ زندگی بھیج دی۔ لطیفہ خانم جو حسن و جمال کیسا[تھ] علم و کمال سے بھی آراستہ تھیں وہ مصطفےٰ کے غائبانہ مداحوں میں تھی۔ اس نے اپنی دلچسپی اور محبت کا اظہار کیا اور مصطفےٰ کمال کو بھی اس سے محبت ہوگئی اور ان کا باہم عقد ہوگیا۔

چند برس وہ خوش اور آباد رہے اور اسی عرصہ میں لطیفہ خانم ان کی معاون و مددگار رفیقہ ثابت ہوئیں، مگر پھر بعض سیاسی امور میں اختلاف ہو جانے سے انھیں ایک دوسرے سے علحدٰہ ہونا پڑا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۷) لوگوں نے انھیں مجبور کیا کہ اگر وہ بادشاہت قبول نہیں کرتے تو ہمیشہ کے لیے ملک کی صدارت قبول کریں مگر انھیں یہ بھی منظور نہ تھا۔ جب ان کے سامنے خلفائے راشدین کی مثال پیش کی گئی کہ وہ بھی تو لائف پریذیڈنٹ تھے تو آپ مسکرائے اور کہا کہ آپ لوگ میرے ایمان اور میری قوت کا مقابلہ ان گراں قدر ہستیوں کے ساتھ نہ کریں۔ میں قوم کا ادنیٰ خادم ہوں۔ جب تک میں نیک نیتی سے قوم کے کام سرانجام دے رہا ہوں۔ ہر پانچ سال کے بعد مجھے منتخب کیا جائے۔ اگر میری نیت میں فرق آجائے تو ملک اور قوم کا فرض ہے کہ مجھے ٹھوکریں مار کر ملک سے نکال دے۔

[1] "غازی مصطفےٰ کمال پاشا" (دیباچہ)

مصطفےٰ کمال پاشا کی زندگی کا یہ باب بہت دردناک ہے لیکن ہمارے مصنف نے اس واقعہ پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر اختلاف اس پر ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کی ذاتی ترقی کے لیے چاہتی تھی کہ وہ صدارت ملکی کے ساتھ مسندِ خلافت پر بھی متمکن ہو جائے اور کمال پاشا ملک کی بہتری اس میں جانتے تھے کہ خلافت کا ہی خاتمہ ہو جائے اور اس لیے وہ اس منصبِ جلیل کے لینے کو تیار نہ تھے۔

اگر یہ درست ہے کہ اصل وجہ اس افسوسناک علٰحدگی کی یہ تھی تو خواہ کسی کو مسئلۂ خلافت پر کمال پاشا کی رائے سے اختلاف ہو، پھر بھی اس مردِ کامل کی بڑائی کا اعتراف لازم آئے گا کہ اتنی بڑی چیز کو ایک اصول پر جس کو وہ صحیح مانتا تھا قربان کر دیا۔

شوہر اور بیوی کی جنگ

لطیفہ خانم کی طلاق کے بارے میں مصطفےٰ کمال اور لطیفہ خانم دونوں نے اپنے اپنے بیانات دیے جن سے طلاق کے اسباب پر اور زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ مصطفےٰ کمال نے جو بیان دیا وہ ترکی کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اخبار "زمیندار"

کے الفاظ میں وہ بیان یہ ہے:

"لطیفہ خانم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لطیفہ کی روش ایسی ہو گئی تھی کہ میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے جملہ اختیارات میں حصّہ لینا چاہتی تھی۔ میرے خیالات پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ میرا پروگرام بدل ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی روح میں رجعت پسندی چھپی ہوئی تھی۔ قدامت پرستی کا اس کے دل میں مسکن تھا۔ وہ ترکی جمہوریت کی تاجدار ملکہ بننا چاہتی تھی۔ اس کی خود پسندی خود اپنے شوہر کی عظمت کے آگے جھکنے سے بھی انکار کرتی تھی۔

مذکورہ بالا بیان کے جواب میں لطیفہ خانم نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے حسب ذیل بیان اخبارات میں شائع کرایا:

"میری بدنصیبی بہت بڑی ہے، لیکن میں صبر کروں گی۔ آج میں جوزفائن کی جگہ پر کھڑی ہوں۔ ہم دونوں بدقسمت عورتیں اس لیے پیدا ہوئی تھیں کہ دنیا کے دو سب سے بڑے سپہ سالاروں کے دل فتح کریں اور پھر چشم زدن میں ثریّا

سے تحت الثریٰ میں دھکیل دی جائیں۔ میں کمال کی ملکہ تھی اور جوزفائن نپولین کی ملکہ تھی۔ میں نا امید نہیں ہوں۔ فرانس کا مردِ میدان اگر زندگی کے آخری لمحے تک جوزفائن کے لیے کراہتا رہا تو مجھے یقین ہے کہ ترکی کا مردِ میدان بھی لطیفہ کے لیے بے قرار رہے گا۔ کیونکہ خدا نے جوزفائن اور لطیفہ کی قسمت یکساں بنائی ہے

آہ میری بربادی! لطیفہ اور جوزفائن کی تقدیریں کس طرح باہم ملتی جلتی ہیں۔ ہماری زندگیاں پاک محبت سے شروع ہوئی تھیں اور بے گناہ قتل پر ختم ہوگئیں۔ جس طرح جوزفائن بے قصور تھی اسی طرح لطیفہ بے خطا ہے۔ میں اپنے جلیل القدر شوہر کے ساتھ ویسی ہی وفادار تھی جیسی جوزفائن اپنے شوہر نپولین کے ساتھ وفادار تھی۔

لیکن نہیں! میرا ایک قصور ہے۔ میں بے شک مجرم ہوں۔ میرا جرم کیا ہے؟ آج پہلی مرتبہ میں دنیا کو اپنے جرم سے آگاہ کرتی ہوں۔ میرا جرم ٹھیک وہی ہے جو غریب جوزفائن کا جرم تھا۔ میرا گناہ میرے شوہر کی نظر میں یہ تھا کہ میں بانجھ تھی۔ میں اولاد پیدا نہ کر سکی۔ ترکی کی آبادی میں اضافہ نہ کر سکی۔ یہ ہے میرا اصلی جُرم۔ کیا واقعی میں مجرم ہوں؟ ہاں مجرم ہوں، کیونکہ غازی مجھے مجرم ٹھہرا چکا ہے لہذا مجھے اعتراف ہے کہ میرا جرم ہے۔ تقدیر بالکل بے قصور ہے ——— لطیفہ اور جوزفائن کی قسمتیں یکساں ہیں لیکن کیا مصطفےٰ کمال اور نپولین کی عظمتیں بھی یکساں ہیں؟ تاریخ یقیناً ایک بدبخت عورت کو اجازت دے گی کہ اس سوال کا جواب اپنے علم کے بموجب دے۔ میرا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ نپولین اپنی بیوی کی پرستش کرتا تھا۔ ایک دن اس معصوم سے کہنے لگا تو میرا ولیعہد پیدا نہیں کر سکتی اس لیے تجھے چھوڑے دیتا ہوں۔ نپولین بہادر تھا، صفائی سے حقیقت بیان کر دی تہمت نہیں تراشی۔

اس کے مقابلہ میں مصطفےٰ کمال کا کیا حال ہے؟ وہ بھی لطیفہ کی پوجا کیا کرتا تھا، لیکن جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ جوزفائن کی طرح لطیفہ بھی بانجھ ہے، اور

اس کے لیے ولیعہد نہیں پیدا کر سکتی تو نپولین کی سی شجاعت اس سے ظاہر نہیں ہوئی ۔ بے شک نپولین کی طرح وہ بھی اپنی بانجھ بیوی کو طلاق دیتا ہے مگر اصلی حقیقت کے اعلان کے ساتھ نہیں بلکہ طرح طرح کی بے بنیاد تہمتوں کے ساتھ، حالانکہ اگر وہ جرأت کے ساتھ حقیقت کا اعلان کر دے تو میں اور میرے ساتھ ساری دنیا اس کی عظمت کے آگے اسی طرح جھک جاتی جس طرح اس سے پہلے نپولین کی عظمت کے آگے جوزیفائن اور ساری دنیا جھک چکی ہے ۔

آہ ! میں تسلیم کرتی ہوں کہ قسمت نے مجھے بانجھ بنایا ہے ۔ وہیں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ غازی کو ترکی کے لیے اولاد کی ضرورت تھی مگر میرے بانجھ ہونے میں خود میرا کیا قصور ہے !!

مصطفےٰ کمال نے میرے دل کی دنیا جس طرح آباد کی تھی اسی طرح چشم زدن میں تاراج کر ڈالی ہے ، لیکن میری محبت ہنوز سرد نہیں ہوئی ۔ آج بھی میں ان پر اسی طرح فریفتہ ہوں جس طرح سمرنا میں پہلی ملاقات میں فریفتہ تھی۔ میری محبت کو زوال نہیں آسکتا اور چونکہ میرے دل میں ان کے سوا کسی انسان کی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔ میرا ایمان ہے کہ آج بھی وہ مجھ سے ویسی ہی محبت کر رہے ہیں جیسی کبھی کرتے تھے ، لیکن وہ انانیت ہے جو محبت کے پاک جذبہ پر غالب آگئی ہے ۔ میں اپنی باقی زندگی اس عالم غم و ماتم میں گزار دوں گی ۔ میں عمر بھر کسی مرد سے شادی نہیں کروں گی ۔ میرے لیے یہ فخر کافی ہے کہ میں ترکی کے نجات دہندہ کی مطلقہ بیوی ہوں ۔

میں اپنے دل و دماغ کو ترکی کی خوشحالی کے لیے وقف کر دوں گی ، کیونکہ میرے عاشق و معشوق نے مجھے ترکی کی بہتری ہی پر قربان کر ڈالا ہے ۔ میں آخری وقت تک ان کی ندامت کا انتظار کروں گی ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا آغوشِ محبت میرے لیے کھل جائے گا ۔ جب مروں گی تو میرے لبوں پر ترکی اور کمال کے سوا کوئی صدا نہ ہوگی ۔"

ترکی کا اخبار " وقت " لکھتا ہے کہ جب ہمارا نامہ نگار غازی کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان کے خیالات معلوم کرے تو اس بیان کو سننے کے بعد غازی نے صرف یہ جواب دیا کہ آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ ے

ے ترکِ تعلقات سے جی مطمئن سا ہے
اب کوئی لاکھ سلسلہ جنباں بھی ہو تو کیا

زندگی کے آخری ایام میں مصطفےٰ کمال نے جدید نظریوں اور تقاضوں کی بنیاد پر ٹرکی میں بہت سی ایسی اصلاحات نافذ کیں جنھوں نے تمام قدیم اور مروّجہ قباحتوں کا خاتمہ کرکے " جدید ٹرکی " کی بنیاد رکھ دی اور ملک کو یورپ کے دوسرے ترقی یافتہ اور طاقت ور ملکوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے اخیر میں قوم نے انھیں " اتاترک " کا معزز لقب پیش کیا (جس کے معنی ہیں " ترکوں کا باپ ")۔

حقوقِ نسواں حقوقِ نسواں کے ضمن میں انھوں نے اسلام کے بخشے ہوئے ان حقوق کی تجدید کی جن پر خلافت کے زمانہ میں کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ اس طرح ٹرکی کی صنفِ نازک پر انھوں نے عظیم احسان کیا۔

ایک قانون کے مطابق لڑکی کو باپ کی جائداد کا وارث بنایا گیا۔ یہ قانون بھی جاری کیا گیا کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویاں نہ کر سکے گا۔ اگر ضرورت کے مطابق ایسا کرنا چاہے تو دیوانی عدالت سے استقراریہ ڈگری حاصل کرنی ہوگی۔ مرد اور عورت دونوں کو ایک سا طلاق کا حق حاصل ہے مگر اس کا نفاذ بھی عدالتِ مجاز کی ڈگری کے بغیر نہ ہوگا۔ شادی صرف اسی صورت میں ہو سکے گی کہ مرد اور عورت دونوں اچھی صحت کا سرٹیفکیٹ پیش کریں۔ ہر عورت کے لیے ۸ سے ۱۸ سال کی عمر تک تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ ہوائی جہاز کا محکمہ لڑکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ہر بالغ عورت کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ پردہ حکماً ممنوع قرار دیا گیا۔ عورتوں کی علٰحدہ پولیس بنائی گئی۔ غرض عورت کو مرد کے دوش بدوش چلنے کے لیے تمام حقوق اور مناسب مراعات دی گئیں۔

ے " خاتونِ مشرق " مارچ ۱۹۴۱ء

میثاق سعد آباد مصطفےٰ کمال کی زندگی کا آخری بڑا کارنامہ میثاق سعد آباد ہے جس کے مطابق انھوں نے تمام اسلامی ملکوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اس معاہدہ کے مطابق تمام اسلامی ملکوں کی ایک بڑی فوج جو بیس لاکھ پر مشتمل تھی تیار کی گئی جس کا مقصد اسلام کی حفاظت کرنا تھا۔

وفات مصطفےٰ کمال نے چھ ماہ کی طویل علالت کے بعد ۹ نومبر ۱۹۳۸ء کو استنبول میں وفات پائی۔ وفات سے ایک دن قبل میثاق سعد آباد کے سلسلہ میں یمن، نجد، حجاز اور شام کا ایک وفد اس غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان ملکوں کو اس معاہدے میں شامل کر لیا جائے، چنانچہ وہ لوگ دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے اور معاہدہ مرتب کر لیا گیا۔ شام کے قریب اس معاہدے پر سب کے دستخط ہو گئے تو مصطفےٰ کمال نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آج میری وفات سے قبل اتحاد اسلامی کا یہ معاہدہ مکمل ہو گیا۔ خدا نے یہ کام میرے سپرد کر رکھا تھا۔"

کارروائی ختم ہونے پر مصطفےٰ کمال اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور کرسی پر بیٹھنے لگے، مگر نقاہت بہت زیادہ تھی اور تشنج کا دورہ شروع ہو گیا تھا اس لیے سنبھل نہ سکے اور کرسی سے گر پڑے۔

موت سے کچھ دیر پہلے توفیق رشدی پاس موجود تھے وہ یہ کیفیت دیکھ کر رونے لگے، تو مصطفےٰ کمال نے انھیں روتا دیکھ کر کہا "تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں راضی بہ رضائے مولا ہوں۔ اگر خدا نے ابھی مجھ سے کچھ کام لینا ہے تو میں اس وقت تک نہ مروں گا اور اگر میرا وقت آ گیا ہے تو میں خوشی خوشی دنیا کو خیرباد کہوں گا۔ میں بے حد خوش ہوں کہ مرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زیارت کا فخر حاصل کروں گا۔ اگر میں مر جاؤں تو تم دنیائے اسلام تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو رسول اللہؐ کے نقش قدم پر چلیں اور سادہ زندگی اختیار کریں۔ وہی نظم و ضبط سے رہیں جس طرح فاروقِ اعظمؓ نے مسلمانوں کو عسکری نظام کی تلقین کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق علم حاصل کریں اور زندگی کا ایک لمحہ بھی بے کار نہ جانے دیں۔ ترکوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں یورپ پر رکھیں اور بڑھتے چلے جائیں۔

وارن ہیسٹنگز کا رومان

ہیسٹنگز کے خلاف اہلِ ہند پر ظلم کرنے اور رشوت ستانی کے الزام میں مقدمہ چلا۔ سخت ذلت ہوئی۔ ہندوستان کی ساری کمائی مقدمے کی نذر ہوگئی۔ اس کی محبوبہ کو بھی اس مقدمے کا باعث خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ سائلوں نے اپنی عرضداشتوں کو منظور کرانے کے لیے اسے اپنا آلۂ کار بنا رکھا تھا اور وہ اس کے معاوضہ میں آزادی کے ساتھ جو کچھ ان سے ملتا قبول کر لیا کرتی تھی۔

اے عشق کہیں لے چل

بحرِ اوقیانوس کی طوفانی لہروں میں ایک چھوٹا سا بحری جہاز چلا جا رہا تھا۔ پچیس تیس کے قریب مسافر اس میں سوار تھے۔ مگر سب کے سب بیمار اور متردد نظر آتے تھے۔ جہاز کو انگلستان کے ساحل سے روانہ ہوئے مہینے سے اوپر ہو چکا تھا، مگر ہندوستان پہنچنے کے لیے ابھی مزید پانچ ماہ کا سفر باقی تھا۔ راستے کی صعوبتوں، موسم کی خرابی اور خوراک کی تکلیفوں نے اچھے اچھے تنومند اور مضبوط مسافروں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی حالت زیادہ ابتر تھی۔ آئے دن ایسے جہازوں کے ڈوبنے اور تباہ ہونے کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ دوسری صعوبتوں کے علاوہ یہ خطرہ بھی ہر وقت دامنگیر رہتا تھا، جس کے باعث سفر کے ختم ہونے تک ہر مسافر کو جان کا بھی خوف لگا رہتا تھا۔

ایک تختہ پر ایک مضبوط جسم کا دراز قامت مرد لیٹا تھا۔ اس کی عام حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑا شخص ہے جو اچھے دل و دماغ اور عزم و استقلال کا مالک ہے مگر چہرے پر مردنی چھائی تھی اور پریشانی کے عالم میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اگرچہ ہر مسافر کی یہی کیفیت تھی مگر اس شخص کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ بیمار ہو گیا ہے اور کمزوری اور نقاہت اس پر غلبہ پاتی جا رہی ہے۔

"کیا میں دریافت کر سکتی ہوں آج آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" ایک دبا دبا سا نسوانی آواز اس کے کانوں میں آئی۔
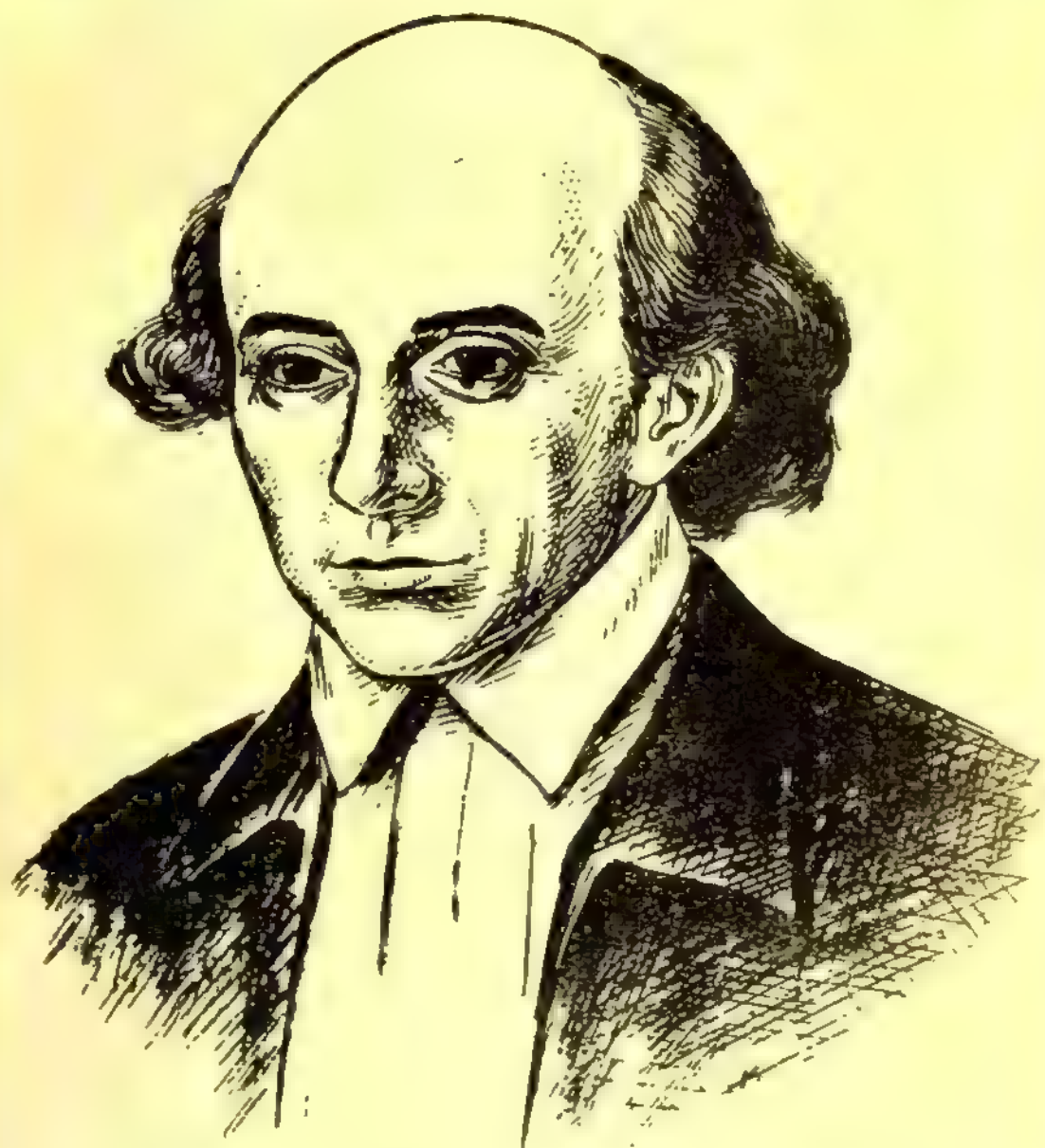
وارن ہیسٹنگز

بیمار نے دائیں طرف گردن موڑی تو سامنے ایک بائیس سالہ نوجوان خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر شفقت اور خلوص کے آثار نمایاں تھے۔ بیمار نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں اور قدرے توقف کے بعد مسکرانے لگا۔ اس کے زرد چہرے پر مسرت کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور وہ چمک اٹھا۔ اس نے تعظیم کے لیے اٹھنا چاہا مگر عورت نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر روک دیا "آپ لیٹے رہیے، اٹھنے کی تکلیف نہ کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں" وہ بولی۔

"آپ کی بے حد مہربانی۔ آپ کئی روز سے میری تیمارداری میں لگی ہیں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے میری خاطر گزشتہ رات بھی جاگتے گزاری"۔ بیمار نے بڑے نرم اور محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"افسوس تو مجھے ہونا چاہیے کہ میں آپ کی خاطر خواہ خدمت نہیں بجا لا سکی۔ اگر اس سفر میں زندہ رہی اور سلامتی کے ساتھ ہندوستان پہنچ گئی تو میری خواہش ہے کہ دل و جان سے آپ کی خدمت کروں۔ خدا آپ کو بھی اس وقت کے لیے زندہ و سلامت رکھے"۔

"اھوف! میرے پہلو میں دل ہے اور میں مرد ہوں۔ میں تمھاری خدمات حاصل کرنے کے بجائے اپنے آپ کو تمھاری خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں"۔

عورت نے یہ الفاظ سن کر سر جھکا لیا اور فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ بیمار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمھارا شوہر تمھاری قدر و قیمت سے ناآشنا ہے، اس کے پہلو میں دل تو ہے مگر اس دل میں تمھارے جیسی مخلص اور نیک دل خاتون کی محبت کا دخل کوئی نہیں۔ اھوف! یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ ہیسٹنگز دل و جان سے تمھارا ہو چکا ہے۔ تم اپنی قدر میرے دل سے پوچھو۔ آج میری اور تمھاری جان پہچان کو چار ہی دن تو ہوئے ہیں مگر میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے تم پیدا ہی میرے لیے کی گئی تھیں اور ہم بچپن کے ساتھی ہیں"۔

؎ رموزِ حسن کچھ ایسے ڈھکے چھپے تو نہ تھے
یہ اور بات ہے کچھ عشق ہی نے پہچانے

اھوف مسکرا کر ہیسٹنگز کی طرف دیکھنے لگی۔ ہیسٹنگز بھی دل ہی دل میں خوش نظر آتا تھا وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک بچی دوڑی ہوئی آئی اور امی جان کہہ کر اھوف کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک تیس سالہ جوان بھی آپہنچا۔ اس نے آتے ہی ہیسٹنگز کو سلام کیا اور اھوف کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہیسٹنگز کی مزاج پرسی کرنے کے بعد تینوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ جوان اھوف کا شوہر تھا۔

ہیسٹنگز کی زندگی! وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل تھا ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں بنگال آیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک کے طور پر کام کرتا رہا۔ پھر ترقی کرتے کرتے ۱۷۷۳ء میں جبکہ اس کی عمر اکتالیس سال کی تھی۔ ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ بارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہا پھر انگلستان چلا گیا جہاں اس پر اہل ہند پر ظلم و ستم کرنے اور رشوت ستانی کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ مقدمہ سات سال تک چلتا رہا۔ بالآخر وہ بری ہو گیا مگر ہندوستان میں رہ کر جتنی دولت اس نے کمائی تھی وہ سب اس مقدمے کی نذر ہو گئی اور وہ پائی پائی کو محتاج ہو گیا۔ بعد ازاں حالت سنبھلی تو زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف متوجہ ہوا اور آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے لگا۔ عمر کے آخری بیس سال اسی طرح گزارے چھیاسی سال کی عمر میں وفات پائی اور ڈیلز فورڈ میں دفن ہوا۔

ہیسٹنگز ۱۷ سال کی عمر میں بنگال آیا تھا۔ پندرہ سال کے اندر اندر وہ بنگال کا گورنر جنرل بن گیا، مگر جلد ہی بعض لوگوں کی مخالفانہ روش کے باعث اس عہدے سے استعفٰے دے کر ۱۷۶۴ء میں انگلستان واپس چلا گیا۔

زندگی کا وبال ہیسٹنگز کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے لڑکے کا نام جارج تھا۔ انگلستان پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کا نوجوان بیٹا مر چکا ہے۔ یہ خبر اس کے لیے بڑے صدمے کا باعث تھی۔ علاوہ ازیں انگلستان میں اُسے کوئی ملازمت نہ ملی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے پندرہ سالہ قیام میں اس نے جو روپیہ کمایا تھا وہ ختم ہونے لگا۔ انڈیا ہاؤس کے ڈائرکٹر اسے کوئی اہم ملازمت نہ دینا چاہتے تھے۔ ہیسٹنگز کے لیے زندگی وبال ہو گئی۔

نئی زندگی فرانسس سائیکس مرشد آباد کا ریزیڈنٹ تھا۔ جب وہ انگلستان آیا تو

ہیسٹنگز کی خستہ حالی دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے کوشش کی کہ ہیسٹنگز کو ہندوستان میں دوبارہ کوئی ملازمت مل جائے چنانچہ وہ کامیاب ہوا اور ۱۷۶۸ء میں ہیسٹنگز کو مدراس کی مجلس عاملہ کا نائب صدر مقرر کیا جانے کا حکم نامہ ملا۔ ساتھ ہی اُسے یہ اُمید بھی دلائی گئی کہ صدارت کا عہدہ خالی ہونے پر اسی کو دیا جائے گا۔[1]

ہیسٹنگز کو طویل بے کاری اور پریشانی کے بعد جب یہ خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی مایوسی جاتی رہی۔ اگرچہ ہندوستان جانے کے لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی تاہم اس نے قرض لے کر سفر کے لیے ضروری سامان اور اخراجات کا بندوبست کیا اور مارچ ۱۷۶۹ء میں "ڈیوک آف گرلنیٹن" نام جہاز میں سوار ہو کر عازم ہندوستان ہوا۔ اب ہیسٹنگز کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

داستانِ محبت | ہیسٹنگز کے معاشقے کی داستان اسی سفر کے ساتھ شروع ہوتی ہے ۔ امھوف اسی جہاز میں اس کے ساتھ شریکِ سفر تھی۔ امھوف کا شوہر اور اس کی بچی بھی ہندوستان جا رہے تھے۔ جہاز ہی میں یہ معاشقہ پروان چڑھا۔ جس کے باعث بعد ازاں کئی گل کھلے۔ ای پی مون اپنی کتاب میں ہیسٹنگز کے سفر اور اس کے عشق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے "اٹھارویں صدی میں ہندوستان کا بحری سفر عذابِ جان ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے کی تکالیف، کوفت اور خطرات کا اعادہ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی ہوا ہے، جب ہندوستان پہنچنے کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ لدے ہوئے جہازوں کو بحرالکاہل[2] کی راہ سے پہلے امریکہ اور پھر وہاں سے اس امید

---

[1] وینی سٹارٹ کلکتہ کونسل کا صدر تھا اور کلاؤ اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ چونکہ وینی سٹارٹ اور ہیسٹنگز میں دوستانہ تعلقات تھے اس لیے کلاؤ کو ہیسٹنگز سے بھی دشمنی ہوگئی تھی چنانچہ وہ ہیسٹنگز کی دوبارہ ملازمت کے راستے میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ فرانسس سائیکس نے کلاؤ کو لکھا کہ اگر تم ہیسٹنگز کی دوبارہ ملازمت کے بارے میں مدد نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم اس کی مخالفت نہ کرو۔ کلاؤ نے جواب دیا کہ چونکہ ہیسٹنگز وینی سٹارٹ کے خیالات اور تدابیر کا حامی ہے اس لیے میں صوبہ بنگال میں ان کا تقرر نہیں کر سکتا البتہ مدراس کونسل میں انھیں کوئی جگہ دلا دوں گا۔ چنانچہ کلاؤ کی کوشش سے ہیسٹنگز کو دوبارہ ملازمت ملی۔

[2] اس راستہ میں بحرالکاہل نہیں بلکہ بحر اوقیانوس آتا ہے۔ مصنف یا مترجم نے غلطی سے بحرالکاہل لکھ دیا ہے۔ (ارمان سرحدی)

تک واپس ہوتے ہوتے مہینوں لگ جاتے تھے۔ اور بعض اوقات تو یہ جہاز راستے ہی میں عدم پتہ ہو کر گم ہو جایا کرتے تھے۔ ہیسٹنگز کے زمانہ میں ایسے بحری سفر کی تکمیل میں کم از کم چھ ماہ صرف ہو جایا کرتے تھے۔ راستہ میں اگر خطرہ نہیں تو صبر آزما اور روح فرسا تکلیف تو بے حد ہوا کرتی تھی۔ ہیسٹنگز بڑے درد کے ساتھ یوں اس سفر کا ذکر کرتا ہے کہ معدہ ہمیشہ خراب رہتا تھا اور سر چکراتا رہتا تھا۔ ایک چھوٹے سے جہاز میں سفر کرنے سے یہی حالت ہوا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خراب موسم میں چھوٹے جہاز میں سفر کرنے سے زندگی نہ صرف بدمزہ بلکہ غیر محفوظ بھی تھی۔

اس جہاز کے سفر میں ایک قبول صورت جرمن خاتون بیرونس امہوف کی موجودگی سے خوش وقتی کا سامان ضرور پیدا ہو گیا۔ یہ خاتون اپنے خاوند اور بچے سمیت ہندوستان جا رہی تھی یہ بیرن فرانکونیا کا باشندہ تھا اور اس کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ وہ تھوڑا بہت مصوری کا کام جانتا تھا۔ اور اُسے امید تھی کہ اس کے ذریعہ وہ نوابانِ بنگال میں کوئی ذریعہ معاش پیدا کرے گا۔"

بحری سفر میں ہیسٹنگز بیمار ہو گیا اور بیرونس نے اس کی تیمار داری کی اور ان کی آپس میں محبت ہو گئی۔[1]

بیرون امہوف اپنی بیوی کے متعلق عام طور پر بے پرواہی رہا کرتا تھا۔ نہ اسے اس سے محبت تھی نہ نفرت اور نہ اس کے متعلق کوئی تقاضائے غیرت۔ اس نے اس میل جول سے کوئی تعرض نہ کیا۔ ہیسٹنگز کا سب سے پہلا سوانح نگار کنایۃً لکھتا ہے کہ "جرمنی کے پروٹسٹنٹ مذہب کا آئین شادی کی پابندیوں کے متعلق سخت رکاوٹ کا باعث تھا۔ ہیسٹنگز اپنے ولولہ شوق کے باعث اس پر قائم نہ رہ سکا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ بیرن اور ہیسٹنگز کا اس معاملہ میں خوشگوار سمجھوتہ ہو گیا۔ یہ خاتون فوراً ہی اس کے قبضہ میں نہ آئی بلکہ بیرن کو کمپنی کی ملازمت میں ایک جگہ دے دی گئی اور کوئی دو سال تک دونوں میاں بیوی اکٹھے ہی رہے۔ یعنی پہلے مدراس میں اور بعد ازاں کلکتہ میں۔ البتہ ہیسٹنگز ان کے ہاں برابر آتا جاتا رہا۔

پھر ۱۷۷۲ء میں کمپنی کے ایک حکم کے مطابق بیرن کو واپس بلا لیا گیا اور اس وقت کسی فیصلہ کن اقدام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ بیرونس ہندوستان ہی میں رہے اور بیرن جرمنی

---

[1] ہیسٹنگز کی عمر اس وقت سینتیس سال کی تھی۔

واپس جاکر ہیسٹنگز کے خرچ پر اپنی بیوی کے خلاف طلاق کا دعویٰ دائر کردے۔ کہ اختلاف مزاج کی وجہ سے تفریق شرعی ضروری ہے۔ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ہیسٹنگز نے بیرن کو یورپ واپس جانے کے لیے اتنا کافی روپیہ دیا ہوگا جو اس کو مصوری کے پیشہ میں رہ کر شاید خواب میں بھی حاصل نہ ہوتا۔

بیرن کی روانگی کے بعد ہیسٹنگز اور بیرونس کی صورت حالات کچھ غیر یقینی اور مشتبہ سی تھی، لیکن یہ بات کسی خاص بدنامی کا باعث نہ ہوئی۔ طلاق حاصل کرنے میں کافی سے زیادہ تاخیر ہوگئی۔ یعنی ۱۷۷۵ء تک ڈگری حاصل نہ ہوسکی اور چند موہوم وجوہات کی بنا پر ہیسٹنگز کو اس کی اطلاع ۱۷۷۷ء تک جب وہ کلکتہ میں تھا نہ پہنچ سکی کہ وہ شادی کر سکتا ہے۔ اس عرصہ دراز میں ہیسٹنگز نے جس صبر و تحمل سے کام لیا وہ سراسر قابلِ ستائش اور اپنی آپ نظیر ہے۔

افادیت پسندی کے نظریہ کے مطابق یہ شادی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسی خوش کن شادیاں دنیا میں شاذونادر ہی ہوا کرتی ہیں۔ ہیسٹنگز کو اپنی دوسری بیوی سے بے حد گہری اور سچی محبت تھی۔ اُسے اس سے ناقابل زوال عشق تھا جو آخری دم تک قائم رہا۔ دونوں ایک دوسرے سے خوش تھے۔ امھوف نے بھی جو اپنی بیوی سے بے پروا رہا کرتا تھا اپنی حالت درست کر کے اپنی جاگیر دوبارہ حاصل کر لی۔ اس نے بھی دوسری شادی کر لی۔ اس کے دو بیٹوں کو جو پہلی بیوی سے تھے۔ ہیسٹنگز کے خرچ پر بہترین تعلیم و تربیت حاصل ہوئی۔

آخر یہ خاتون جس نے تقریباً پچاس برس تک ہیسٹنگز کو اپنا بندۂ بے دام بنائے رکھا کس قسم کی عورت تھی؟ —— بلا شک و شبہ وہ خوبصورت عورت تھی اور اس کے خد و خال کی خوبصورتی نہ صرف ادھیڑ عمر تک بلکہ بڑھاپے تک قائم رہی۔ وہ بڑی باتمیز خاتون تھی اور نہ صرف کلکتہ کے ماحول ہی میں وہ مقبول تھی بلکہ شاہ جارج سوم اور ملکہ چارلوٹ بھی اس کے قدر دانوں میں سے تھے۔ فلپ فرانسس نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ "وہ بلاشبہ ایک مہذب اور قابلِ قدر خاتون ہے"۔ البتہ اس کے متعلق عورتوں کی رائے زیادہ اچھی نہ تھی۔ بعض کہتی تھیں کہ "وہ مغرور ہے۔ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے اور بناؤ سنگار اور لباس پر فضول

روپیہ صرف کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی وجاہت کا اثر ڈالنے کی خواہش مند اور قیمتی لباس اور زیورات کی دلدادہ تھی البتہ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا وہ اپنے خاوند کی شہرت برقرار رکھنے کے لیے کافی سے زیادہ محتاط تھی یا نہ۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ ہیسٹنگز دل وجان سے اُسے چاہتا تھا۔ اس لیے سائلین نے اپنی درخواستوں اور عرضداشتوں کو منظور کرانے کی غرض سے اُسے اپنا آلۂ کار بنائے رکھا اور وہ اس کے معاوضہ میں آزادی کے ساتھ جو کچھ ان سے ملتا قبول کر لیا کرتی تھی۔ اس کے متعلق ایک بات نہایت دلچسپ ہے کہ وہ کبھی بھی اچھی طرح انگریزی بولنے کے قابل نہ ہوئی۔ ہیسٹنگز نے اس کے متعلق ایک دفعہ لکھا کہ "یہ بات عجیب ہے کہ جب کبھی وہ انگریزی بولتی ہے وہ ان الفاظ کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکتی جو روزمرّہ استعمال میں آتے ہیں۔" گفتگو کا یہ طریقہ غالباً نفی اثبات کا مضحکہ خیز مجموعہ ہوگا۔ عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی سے پورے طور پر واقف نہ ہونے کی وجہ سے اس زبان کو عمداً اس طرح استعمال کرتی ہو جو اس کی نسوانی خوبی کو زیادہ مقبول بنا دے۔"[1]

شادی کے وقت ہیسٹنگز کی عمر پینتالیس برس اور بیگم ہیسٹنگز کی عمر تیس برس کی تھی۔ بیگم ہیسٹنگز نے نوّے برس کی عمر پائی یعنی ہیسٹنگز کے بعد انیس سال تک زندہ رہی، مگر ہیسٹنگز سے اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

---

[1] "وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج" مترجمہ سید اولاد علی گیلانی ایم اے۔

نیلسن کا رومان

لیڈی ہملٹن نے آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھا جس سے پانچ سال قبل اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک جنگی کشتی میں ایک کمزور، زرد رو نوجوان کپتان کھڑا تھا جس کی ایک آنکھ اور ایک بازو غائب تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ انگلستان کے مشہور فاتح نے دل ہار دیا۔

نیلسن کی عظمت | امیر البحر نیلسن انگلستان کا وہ مشہور و معروف بحری جرنیل اور فاتح ہے جس نے متعدد لڑائیوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں اور انگلستان کا نام روشن کر دیا۔ انگریز اس کا نام بڑے فخر سے لیتے ہیں۔

نیلسن کے کارنامے | ہوریشو نیلسن انگلستان کے ایک پادری کا لڑکا تھا۔ ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا۔ بارہ سال کی عمر میں بحری تربیت حاصل کی۔ اکیس سال کی عمر میں کپتان کے درجے کو پہنچ گیا۔ ۱۷۹۴ء میں کالومی کے محاصرے کے وقت اس کی داہنی آنکھ تلف ہو گئی۔ ۱۷۹۷ء میں سینٹا کروز کی جنگ میں دایاں بازو ضائع ہو گیا۔ ۱۷۹۸ء میں خلیج ابوکبیر میں فرانسیسیوں پر زبردست فتح حاصل کی جس کے صلہ میں ۲ ہزار پونڈ سالانہ کی پنشن ملی اور نواب بنا دیا گیا۔ ۱۸۰۵ء میں ٹریفلگر کی جنگ میں فرانسیسیوں کے بحری بیڑے کو تباہ کیا مگر خود مارا گیا۔

داستان عشق | نیلسن کے عشق کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب یکم اگست ۱۷۹۸ء کو جنگِ نیل میں اس نے نپولین کو زبردست شکست دی اور فرانسیسیوں کی طاقت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ انگلستان میں اس فتح پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ نیلسن اس فتح کے بعد نیپلز[1] چلا آیا۔ سارا شہر اس کے استقبال کے لیے زبردست تیاریاں کیے ہوئے تھا۔

---

[1] اٹلی کا مشہور شہر جو مشہور آتش فشاں پہاڑ ویسیوس کے دامن میں واقع ہے (پومپی کے قدیم شہر کے بالمقابل) آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔

جب نیلسن اپنے جنگی بیڑے کے ساتھ ساحل کے قریب پہنچا تو اہل نیپلز سجائی ہوئی کشتیوں میں استقبال کے لیے آئے۔ نیپلز کا بادشاہ آگے آگے تھا۔ اس کے بعد سر ولیم اور لیڈی ہملٹن آئیں۔ ان کے ساتھ فوجی بینڈ بج رہا تھا۔

فاتح کی ہار

لیڈی ہملٹن نے آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھا جسے آج سے پانچ برس قبل وہ دیکھ چکی تھی۔ ایک جنگی کشتی میں ایک کمزور اور زرد رو نوجوان کپتان کھڑا تھا جس کی ایک آنکھ اور ایک بازو ناپید تھا۔ پیشانی پر ایک تازہ زخم نمایاں تھا، چہرے سے طویل جدوجہد اور تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ یہ نیلسن تھا جسے دیکھنے کے لیے لیڈی ہملٹن شوق سے آگے بڑھی تھی۔ نیلسن کو بھی آج پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کے دل میں قدرت نے اگر محبت کی کوئی چنگاری پیدا کی ہے تو وہ صرف لیڈی ہملٹن ہی کے لیے وقف ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا انگلستان کا نامور فاتح دل ہار چکا تھا۔

لیڈی ہملٹن

لیڈی ہملٹن عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے ملازم لڑکی کی حیثیت سے زندگی کی ابتدا کی، مگر اتنی حسین و جمیل تھی کہ ہر شخص اس پر پروانہ وار قربان ہونے لگتا تھا۔ پہلے بحریہ کے ایک افسر کے پاس رہی پھر لارڈ واروک کے بیٹے چارلس گریول کے پاس ملازم ہوگئی لیڈی ہملٹن کو گریول سے بہت محبت تھی، مگر اس نے اسے اپنے چچا سر ولیم ہملٹن کے پاس فروخت کر دیا۔ لیڈی ہملٹن کم عمر تھی۔ سر ولیم نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک روا رکھا۔ اُسے تعلیم دلائی۔ سر ولیم بوڑھا تھا مگر لڑکی پسند آئی اور اس سے شادی کر لی۔ لیڈی ہملٹن کا اصل نام ایما تھا۔ سر ولیم سے شادی کرنے کے بعد لیڈی ہملٹن کے نام سے مشہور ہوئی۔

لیڈی ہملٹن کی نیپلز کی ملکہ کے ساتھ گہری دوستی ہوگئی۔ اور وہ اپنے شوہر کے ہمراہ ہر سرکاری تقریب میں شریک ہوا کرتی تھی۔ نیلسن نے اُسے دیکھا تو اس کا گرویدہ ہوگیا۔

رومان پرور ایام

نیلسن کی پہلی بیوی انگلستان میں موجود تھی، مگر وہ اکثر جنگوں میں مصروف رہتا تھا اور انگلستان سے باہر رہنا پڑتا تھا چنانچہ بیوی سے ملنے یا اس کے ساتھ رہنے سہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے بیوی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اب لیڈی ہملٹن پر فریفتہ ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اسے حاصل کرنے میں لگا دی۔

وہ لیڈی ہملٹن کے شوہر سر ولیم کے ساتھ اسی کے گھر میں رہنے لگا۔ اور یوں لیڈی ہملٹن کے ساتھ رومان پرور دن گزارنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اگرچہ لیڈی ہملٹن سر ولیم کی بیوی تھی مگر اپنے خیال کے مطابق وہ اسے اپنی بیوی بنا چکا تھا[۱] اور اس سلسلے میں سر ولیم کی طرف سے کوئی رکاوٹ نظر نہ آتی تھی۔

نئی رومانی فضا

۱۸۰۰ء میں جب نیلسن انگلستان واپس گیا تو ہملٹن کا سارا کنبہ بھی اس کے ساتھ وہیں چلا گیا مگر وہاں پہنچ کر نیلسن اپنی پہلی بیوی کے گھر میں رہنے لگا۔ پھر جلد ہی دونوں میں جدائی ہو گئی اور اس کے بعد آخر دم تک نیلسن لیڈی ہملٹن کے ساتھ رہا۔

لارڈ منٹو کی ڈائری

۱۸۰۱ء میں لیڈی ہملٹن کے ہاں نیلسن سے ہوریشیا نام لڑکی پیدا ہوئی۔ سر ولیم بھی ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں سر ولیم مر گیا۔

لارڈ منٹو[۲] نے اس کنبے کی زندگی کی ایک تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

"میں ہفتے کے دن لارڈ نیلسن کے ہاں کھانا کھانے گیا۔ اگرچہ میں ایسی کوئی بات کہنے کے لیے تیار نہیں جس سے لیڈی ہملٹن پر حرف آئے، نہ ہی میں نیلسن کی کمزوریوں پر اس سے برہم ہونا چاہتا ہوں مگر میں نے ان کے جس طرز زندگی کو دیکھا اس سے مجھے ملال ہوا اور مجھے غصہ بھی آیا ہے۔ میرا خیال ہے سر ولیم ان کے راستے میں حائل نہ ہو گا[۳] اور وہ میاں بیوی بننے کے قریب ہیں۔ لیڈی ہملٹن کی بھی یہ خواہش معلوم ہوتی ہے کہ وہ لیڈی نیلسن بن جائے۔ اس دوران میں لیڈی ہملٹن، سر ولیم اور سارا کنبہ نیلسن ہی کے خرچ پر اکٹھے رہ رہے ہیں۔ ان دونوں کی محبت کسی پسندیدہ انداز کی نہیں۔ نہ صرف کمرے بلکہ سارا گھر، سیڑھیاں وغیرہ

---

[۱] *100 GREAT LIVES*

[۲] لارڈ منٹو ۱۸۰۷ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس نے وارن ہیسٹنگز کے خلاف مقدمہ چلانے کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ ہندوستانی ریاستوں میں مداخلت کا قائل نہ تھا، مگر بعد ازاں ریاستوں کے پیچھے پڑ گیا کامیاب گورنر جنرل تھا۔ [۳] اس وقت تک سر ولیم زندہ تھا۔

سب دونوں کی تصویروں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ان میں ہر سائز اور ہر طرح کی تصویریں ہیں نیلسن کی بحری مشقوں، جنگوں اور دوسرے کارناموں کی تصویریں جگہ جگہ لٹکی ہوئی ہیں۔

انجام جب نیلسن ٹریفلگر کی جنگ پر جانے کے لیے آخری مرتبہ گھر سے نکلا تو اس نے اپنی پرائیویٹ ڈائری میں جو باتیں لکھیں اس میں اس نے ایسی باتیں بھی تحریر کیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے گھر چھوڑنے کا بہت غم ہے اور وہ اپنی محبوبہ کی جدائی کو بُری طرح محسوس کر رہا ہے۔

اس جنگ میں فتح کے آخری لمحے پر جب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ نیلسن کو گولی لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔ اسے محفوظ جگہ پر لے جایا گیا اور سرجن بلایا گیا مگر نیلسن جانتا تھا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔

"میں جا رہا ہوں" اس نے کہا "میں اپنی بیوی لیڈی ہملٹن اور اپنی بچی ہوریشیا کو ملک کی امانت کے طور پر چھوڑے جاتا ہوں"

جب کپتان ہارڈی اس کے قریب آیا اور کہا پندرہ جہاز غرق کر دیے گئے ہیں تو اس وقت اس کا دم لبوں پر تھا۔ بولا "ہارڈی! میری پیاری لیڈی ہملٹن کا خیال رکھنا، غریب لیڈی ہملٹن کی حفاظت کرنا، میرا بوسہ لو ہارڈی"

ہارڈی نے اس پر جھک کر اس کا بوسہ لیا۔ نیلسن کے حلق سے دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی "میری پیاری . . . . . . ہملٹن . . . . . میری معصوم بچی . . . . . . ہوریشیا"

ہم نے مشترکہ تمناؤں کے دیکھے تھے محل
وہ محل جو کہ زمیں بوس ہوئے جاتے ہیں!

رابرٹ کلایو کا غائبانہ رومان

"میں نے تمھیں آج تک نہیں دیکھا، پھر بھی تمھیں پیار کرتا ہوں۔ تمھاری محبت نے مجھے بے چین کر رکھا ہے، تمھاری تصویر نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ کیا بارگاہِ حسن میں میرا حقیر نذرانۂ محبت قبول ہو سکتا ہے۔" کلایو نے اس چٹھی میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔

کلایو رابرٹ کلایو انگریزوں کا وہ نامور جرنیل ہے جس نے ایک ادنیٰ کلرک کی حیثیت سے ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا، پھر اپنی قابلیت اور ذہانت کے طفیل ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی مستحکم بنیاد رکھ دی۔

۱۷۲۵ء میں پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک بھرتی ہو کر ہندوستان آیا۔ ان دنوں انگلستان اور فرانس کے درمیان سیاسی کشمکش جاری تھی، جس کے آثار ہندوستان میں بھی پائے جاتے تھے۔ کلایو نے اس سلسلہ میں اپنی قوم کے لیے بہت مفید کام کیے۔ پھر جب فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان ہندوستان میں جنگ رونما ہوئی تو کلایو اس میں انگریزی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو جھگڑے ہوئے ان میں کلایو نے بہت اہم کردار ادا کیا اور بالآخر یہاں انگریزی حکومت قائم کر دی۔ ۱۷۶۰ء میں جب وہ اپنے ملک کو واپس گیا، تو بعض پریشانیوں میں گھر گیا اور بالآخر خودکشی کر لی۔

اَن دیکھا محبوب کلایو کی داستانِ عشق بڑی عجیب و غریب ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُس نے اپنی محبوبہ کو بچشمِ خود نہیں دیکھا تھا صرف اس کی تصویر پر نظر پڑی تھی اور وہ اسے دل دے بیٹھا تھا اس دوشیزہ کا نام مارگرٹ میسکلین تھا۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لفٹننٹ ڈیوڈ کی بہن تھی اور انگلستان میں رہتی تھی۔ یہ وہی لفٹننٹ ہے جو اُس وقت کلایو کے ساتھ تھا جب وہ فرانسیسیوں سے بھاگ کر آیا تھا[۱]۔ کلایو نے کلکتہ میں ڈیوڈ کے مکان پر اور ایک اخبار میں اپنی محبوبہ کی تصویر دیکھی تھی اور اسی وقت

---

[۱] اس وقت کلایو کو مدراس آئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔

سے اس سے عشق کرنے لگ گیا تھا۔

محبوبہ کی تصویر گوہر رام نگری اس داستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں" شام کے چھ بج چکے تھے، سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے، سب کلرک اٹھ کر باری باری چلے گئے، مگر نوجوان کلایو کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سے بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے سامنے ایک اخبار پھیلا ہوا تھا۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اخبار کی طرف دیکھا۔ جوں جوں وہ غور سے تصویر کو دیکھتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا، وہ اپنے خیالات میں محو، گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے پروا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یکایک اس نے اخبار کو اٹھا کر فرطِ شوق و اضطراب سے تصویر کو چوم لیا۔

غائبانہ محبّت نوجوان کلایو کی دنیا عشق و محبّت کے رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ مارگرٹ کی تصور اس کی روح میں جذب ہو گئی اور یہ نقش روز بروز زیادہ گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ کام کاج سے جی گھبرانے لگا ——— اب اس نے کسی سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا، لیکن ایک نوجوان آدمی کے لیے مکمل طور پر خلوت نشین ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ایک شام کو لفٹنٹ ڈیوڈ آیا اور اُسے اپنے مکان پر لے گیا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اس کی ہیئت قلب منقلب ہو گئی۔ وہ دیوانہ وار مجنونانہ انداز میں دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگا۔ عجب اتفاق تھا ——— یہ مارگرٹ کی تصویر تھی۔ جس نے نوجوان کلایو کو غائبانہ محبت سے پاگل سا بنا دیا تھا۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا، مگر اس کے دل میں مارگرٹ کے لیے پریم کا اتھاہ ساگر موجزن ہو گیا۔ مارگرٹ لفٹنٹ ڈیوڈ کی کنواری بہن تھی۔ کلایو کا پژمردہ اور مایوس دل ہرا ہو گیا۔

نامۂ محبّت " پیاری مارگریٹ! میں تمھیں " پیاری " کے لفظ سے مخاطب کر رہا ہوں، لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں نے تمھیں آج تک نہیں دیکھا مگر پھر بھی میں تمھیں پیار کرتا ہوں کیوں، یہ میں نہیں جانتا۔ جب تک جاگتا ہوں تمھارا خیال ہر لحظہ دل میں بسا رہتا ہے۔ تمھاری تصویر نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ تم مجھے پاگل، باولا اور جنونی کہو گی، لیکن یہ سب سچ ہے۔ تمھاری محبت نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ میری روح کو غم نے بے حال کر دیا ہے اور تمھاری والہانہ الفت نے مجھے راحت سے محروم کر دیا ہے لیکن ابھی تو مجھ پر بہت کچھ گزرنے والی ہے۔

جب میں اپنے آپ کو گہرے احساسات کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جب رات کی خاموش اور اضطراب انگیز تاریکیوں میں تمھارے خیالات میں اپنے آپ کو جذب کر دیتا ہوں۔ جب میری روح عالمِ تخیل میں تمھارے آستانۂ شوق کا طواف کر رہی ہوتی ہے تو میں ایک ناقابلِ بیان میٹھی میٹھی جلن محسوس کرتا ہوں، جو بیداری میں مجھے جلا ڈالتی ہے۔ کیا بارگاہِ حسن میں میرا حقیر نذرانہ محبت قبول ہو سکتا ہے؟"

محبوبہ کی وارفتگی کلایو نے اس چٹھی میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ یہ چٹھی کلایو ایسے جرنیل کی وارفتگی اور شیفتگی کا ایک زندہ نمونہ تھی۔ مارگرٹ نے اس نامۂ محبت کو پڑھا۔ چٹھی کا ایک ایک لفظ سچی محبت کا پیام تھا۔ وہ بے تاب ہو اٹھی اور کلایو سے محبت کرنے لگی۔ ان کی غائبانہ محبت روز بروز ان کو قریب تر لے آئی۔ حتیٰ کہ ایک روز خوبصورت مارگرٹ اپنے انوکھے طالب سے ملنے کے لیے ہندوستان روانہ ہو گئی۔

کلایو، نوجوان کلایو اب ایک کلرک نہ تھا بلکہ بنگال کا فاتح[1]، ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا افسرِ اعلیٰ۔

محبوبہ کی اچانک آمد چاروں طرف تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ کلایو فورٹ ولیم کے قلعہ میں ایک کمرے میں بیٹھا خیالات کی گہرائیوں میں کھویا ہوا تھا۔ دُور ساحلِ سمندر پر سینکڑوں انگریز انگلستان سے آنے والے جہاز کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اس زمانے میں انگلستان سے آنے والوں کا ہندوستان میں شاندار خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ کلایو ان تمام مشاغل سے بے پروا عالمِ تخیل کی سیر کر رہا تھا "میری محبت کا انجام کیا ہوگا؟ موت! آہ ناکامی و حسرت کی موت" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس بہادر کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

---

[1] کلایو کو بنگال کا فاتح اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو بنگال کے نواب سراج الدولہ کو زبردست شکست دے کر بنگال پر انگریزوں کا اقتدار قائم کیا۔ یہ لڑائی جنگ پلاسی کے نام سے تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہیں سے انگریزوں کی فتوحات کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اس جنگ میں انگریزی فوج کلایو کی سرکردگی میں لڑی اور قلیل تعداد کے باوجود سراج الدولہ کے کثیر لشکر پر فتح حاصل کی۔ کلایو ۱۷۶۰ء تک بنگال میں انگریزوں کی طرف سے ناظم رہا۔ اس جنگ میں میر جعفر کی غداری خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اچانک دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، رومال سے چہرے کو پونچھا، اور تن کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا، ایک نوجوان حسینہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس نے حیرت اور تعجب کی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا

ملاپ "مارگرٹ! میرے خوابوں کی ملکہ مارگرٹ! کیا یہ بھی خواب ہی ہے!"

کلایو پہلی ہی نظر میں اپنی محبوبہ کو پہچان گیا، مگر اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ تھا۔ وہ دیر تک پاگلوں کی طرح ہوا میں دیکھتا رہا۔ مارگرٹ اس جذبۂ عشق سے بے حد متاثر ہوئی۔ وہ خود دیوانہ وار کلایو کی طرف بڑھی۔

"میرے پیارے! تمھاری سچی محبت مجھے اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور لے آئی۔"

کلایو نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پے در پے بیسیوں بوسے اس کے لبوں پر اور رخساروں پر ثبت کر دیے۔ پھر اسے علیٰحدہ کرتے ہوئے کہا

"مارگرٹ! تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ یہ میرا دوسرا جنم ہے۔"

"میں تمھاری ——— صرف تمھاری ہوں۔ کلایو! کیا تم مجھے قبول کرتے ہو؟" مارگرٹ نے وفورِ مسرت سے کانپتے ہوئے کہا۔

کلایو اب سنبھل چکا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس کے مرمریں ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا

"مارگرٹ! کلایو فاتح تھا مگر تم نے اس کو ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا ہے۔"

اگلے دن دونوں ایک مستقل رشتے میں منسلک ہو گئے۔

کلایو کی ازدواجی زندگی کے حالات کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ بہرحال وہ اس شادی سے بہت خوش تھا۔ ۱۷۵۳ء میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس انگلستان گیا تو شاہی طریقہ پر میاں بیوی کا استقبال کیا گیا۔

(دوسرا باب)

بادشاہ ۔ بیگمات اور شہزادیاں

شہنشاہ روم طیطوس کا رومان

"پیاری بنیرس! ملکی فرائض کا بوجھ میرے کندھوں پر آپڑا ہے اگر میں نے محبت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو میں اپنے فرائض اچھی طرح انجام نہ دے سکوں گا۔ محبت کی قربانی میری روح کو تسکین دے سکتی ہے۔" (طیطوس)

مذہبی اور تاریخی حیثیت

تورات اور کتب سیر و تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ان میں ایک کا نام بنوکدنذر یا بخت نصر تھا جو بابل کا بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ نے ۶۰۴ ق م میں یہودیوں کے وطن اور ان کی قوم کو برباد کیا۔ دوسری تباہی طیطوس[2] رومی کے ہاتھوں ہوئی اور یہ واقعہ رفع مسیح سے قریباً ستر سال بعد پیش آیا۔ یہودیوں کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں ان جابر اور قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں تباہی کے واقعات ظہور میں آئے۔ اس تباہی نے یہودیوں، یہودی قومیت اور یہودی مذہب کو فنا کر کے رکھ دیا۔ قرآن عزیز (سورۂ اسراء یا بنی اسرائیل) میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

طیطوس کون تھا؟

طیطوس دنیا کے ظالم ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ ویس پاسین[3] شہنشاہ روم کا بیٹا تھا۔ ۸۱ ق م میں پیدا ہوا۔ باپ کی زندگی میں رومی فوجوں کا جرنیل تھا اور بہت جابر اور قاہر مانا جاتا تھا۔ اس نے بہت سے معرکوں میں حصہ لیا۔ اور قتل و غارت، خونریزی اور ظلم و تشدد میں روم کے ظالم حکمران نیرو[4] کو بھی مات کر دیا تھا۔

---

[1] بخت نصر اور طیطوس کے ظلم و تشدد اور قتل و غارت کی مفصل داستان میری کتاب "دنیا کے ظالم حکمران" میں ملاحظہ فرمائیں (ادارہ)

[2] اسے انگریزی میں TITUS کہا جاتا ہے۔

[3] VESPASIAN

[4] ۳۷ - ۶۸ ق م - روم کا جابر شہنشاہ جس کا عہد حکومت چودہ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر اس مدت میں اس نے وہ ظلم و ستم کیا کہ لوگ اس کے نام ہی سے کانپ جاتے تھے۔ اس نے روم کو آگ لگا دی تھی مفصل حالات کے لیے دیکھیں میری کتاب "دنیا کے ظالم حکمران"۔

نجی زندگی | شہزادگی کے دنوں میں اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی کا نام مارشیا تھا اور وہ روم کے ایک عظیم المرتبت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مارشیا کو شوہر سے بہت محبت تھی مگر طیطوس اس کی طرف سے ہمیشہ بے پرواہی رہا۔ اس لیے کہ وہ شہزادی بینرس سے محبت کرتا تھا اور اس پر جان دیتا تھا۔ بینرس کی محبت میں وہ اپنی بیوی کو ہمیشہ فراموش کیے رہتا تھا لیکن آخر کار جب باپ کے مرنے پر شہنشاہیت کا تاج سر پر رکھا تو سلطنت کی ذمہ داریوں اور اپنی بیوی کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے محبوبہ کو ٹھکرا دیا۔ یہ دردناک داستان راجہ مہدی علی خان کے الفاظ میں بیان کی جاتی ہے :

رومانی سرگزشت | ہر طرف ایک ہنگامۂ کشت وخوں برپا تھا۔ رومن بہادروں کی تلواریں دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ گلیوں اور بازاروں میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں۔

طیطوس اور بینرس دونوں ایک مخملیں صوفے پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ یکایک باہر خوفناک چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی " دوڑو! دوڑو! مدد کرو! رومن آگئے، اف وہ ہنگامۂ قتل وغارت مچاتے آرہے ہیں "

ان آوازوں کا طیطوس اور بینرس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دونوں بے حس وحرکت بیٹھے تھے طیطوس کی باہیں بینرس کی صراحی دار بلوری گردن میں حمائل تھیں اور وہ پیار بھری نظروں سے اس کے چہرے کی بلائیں لے رہا تھا۔ طیطوس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنی محبوبہ سے اظہار محبت کر رہا تھا " میری پیاری! تم میرے ساتھ چلوگی؟ تم میری روح ہو! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کہیں ہو اور روح کہیں۔ تم میری ملکہ بنوگی اور میری رعایا پر حکومت کیا کروگی۔ روما کی سلطنت پر میں ہی نہیں بلکہ تم بھی حکومت کروگی "

یہ تھے وہ الفاظ جو شہنشاہ ویسپاسین کے بیٹے نے شاہ اگرپا[1] کی خوبصورت بہن بینرس سے کہے۔

---

[1] اگرپا (AGRIPPA MARCUS VIPSANIUS) جولیس سیزر کے بعد روم کا سب سے بڑا فوجی کمانڈر سمجھا جاتا ہے۔ ۶۳ ق م میں پیدا ہوا اور ۱۲ ق م میں وفات پائی۔ نہایت رحمدل اور منصف مزاج حکمران تھا۔ اہل روم اسے بہت پسند کرتے تھے۔

وہ اپنے محبوب کے مسرت انگیز اور پر جوش فقرے سن رہی تھی اور خوشگوار مستقبل کے رومانی تصورات اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑانے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک ایسا عظیم الشان اور خوبصورت آدمی اس سے اظہارِ محبت کر رہا ہے تو وہ جذبات کے سمندر میں تنکے کی طرح بہ گئی اور کہنے لگی "پیارے طیطوس! میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔"

طیطوس اپنی محبوبہ کے الفاظ سن کر فرطِ انبساط سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی مضبوط اور آہنی باہوں کی گرفت میں اس مخملیں مجسمے کو قابو کر کے انتہائی دیوانگی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا اور اس زور سے بھینچا کہ خوف اور مسرت کے احساس سے بینرس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ظالم نگاہیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ باہر سے پہلے سے بھی زیادہ خوفناک اور دہشت آفریں چیخیں سنائی دینے لگیں یکایک بہادر جرنیل اپنے فرائض کا احساس کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور مکان سے باہر نکل گیا۔ وہاں یہودیوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ طیطوس ایک بلند چبوترے پر کھڑا ہو کر یہودیوں کے خاک و خون میں تڑپنے کا نظارہ کرنے لگا۔

محاصرے کی مہم ختم ہو چکی تھی۔ طیطوس نے حکم دیا کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ یکایک شہر میں پھر قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی۔ روما کی فوجوں نے یہودیوں کو بھوکے بھیڑیوں کی طرح چیر پھاڑ ڈالا۔ عالیشان عمارتوں کو مسمار کر ڈالا اور شہر میں آگ لگا دی۔

جب شہر میں روم کا جھنڈا لہرانے لگا تو فوج کا اعلیٰ افسر طیطوس کی خدمت میں حاضر ہوا اور جھک کر آداب بجا لاتے ہوئے کہنے لگا "آقا! بڑے بڑے عظیم الشان پہاڑ بھی تیری عظمت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آج روما اپنے بہادر جرنیل پر فخر کر رہا ہے۔ اور شہنشاہ ویسپاسین تو اپنے ہونہار بیٹے کے کارناموں کی داستان سن کر پھولے نہیں سماتے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی طیطوس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کورنش بجا لاتے ہوئے کہنے لگا "آقا! مجھے آپ کی شریکِ حیات شہزادی مارشیا فرنیلا نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کیونکہ آج بہادر جرنیل طیطوس کے ہاں دخترِ بلند اختر پیدا ہوئی ہے۔ آقا تمام روما خوشیاں منا رہا ہے

اور اپنے جرنیل کو نیک دعاؤں سے یاد کر رہا ہے۔ خوش بختی اس کے قدم لینے کو تیار ہے۔"

یہ خبر سُن کر بہادر جرنیل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اب وہ اپنی اس بیوی کا خیال تک دل میں لانے کے لیے تیار نہ تھا جو روم کے سب سے مقتدر اور عظیم المرتبت خاندان کی حسین ترین عورت تھی وہ سنی اور ان سنی ایک کر کے فوراً اپنی محبوبہ کے قصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگا۔ بینرس نے ابھی ابھی وادئ شباب میں قدم رکھا تھا اس کا حسن موسم بہار کے سب سے پہلے پھول کی طرح نازک اور نو د آفریں تھا ——— وہ باغِ رضوان کی سب سے پہلی بہار کی طرح خوبصورت تھی۔ اس کی ہر بات شعر اور ہر ادا ایک طویل رومانی افسانہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت اس طرح چمکتی تھی جیسے دو عمیق و عمیق جھیلوں میں ستاروں کا عکس چمکتا ہے۔ اس کے تبسم سے پھول برستے تھے اور جب وہ چلتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا نور پاش خرام ایک ادائے غرور آفریں کے ساتھ صبح کے نور کو حقارت سے ٹھوکریں لگا رہا ہے۔ اس کی راہگذر کا ہر نقش قدم روضۂ رضوان کا پھول نظر آتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے سامنے باغ سے گزرا کرتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس کے جلو میں خود فتنۂ حشر بھی کانپتا ہوا ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ طیطوس جیسا بہادر اور سنگدل جرنیل اس کے سیمگوں قدموں پر اپنا سر رکھ دینا باعث فخر سمجھتا تھا۔

طیطوس بینرس کی محبت میں سرشار تھا اور ادھر بینرس طیطوس کی محبت کے نشے میں چور تھی۔ محبت کے دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب طیطوس کو اپنے وطن واپس جانا پڑا۔

دشمن حسینہ وطن میں اس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ ہزاروں قیدی بھی لایا تھا اور اپنی کثیر فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج فوج کا ہر سپاہی نعرے لگا رہا تھا "بہادر جرنیل طیطوس زندہ باد!" خیر مقدم کی تقریب نہایت پرعظمت تھی۔ بھلا طیطوس کی بیوی مارشیا کیوں اس میں شریک نہ ہوتی۔ اپنے شوہر کی کامیابی پر آج اس نے اپنا سر غرور سے بلند کر رکھا تھا۔ وہ وہ اپنے شوہر کے کارناموں کا ذکر سُن کر پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا، آج وہ اس قدر مسرور اور بدحواس تھی کہ اس کی ناگن کی سی زلفیں بار بار اس کے شانوں پر پریشان

ہوجاتی تھیں۔ بار بار شب زلف صبح رخ کو چھپا لیتی تھی اور بار بار وہ گورے گورے ہاتھوں سے اپنے حسین بال پیچھے کی طرف ہٹا دیتی۔ لیکن مسرت کی یہ گھڑیاں بہت جلد ختم ہوگئیں جب مارشیا نے دیکھا کہ جرنیل کے ساتھ ایک حسین پالکی بھی ہے جسے چاروں طرف سے غلام[1] گھیرے ہوئے ہیں تو زمین اس کے پیروں تلے سے نکل گئی۔ آہ متعدد غلام اور لونڈیاں حسن کی اس پر عظمت عورت کو پنکھا جھل رہی تھیں۔ مارشیا کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ غلام اور لونڈیاں اس عورت کو پنکھا نہیں جھل رہے بلکہ مارشیا کے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔

جب پالکی قریب پہنچی تو اس حسینہ کو دیکھ کر مارشیا کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مارشیا نے آج تک اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل میں کہنے لگی "اف! یہ عورت میری رقیب ہی سہی لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ یہ مجھ سے زیادہ حسین ہے"

اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا "چلو ہم اس تقریب میں شامل نہیں ہوں گے" محل میں جاکر ایک "جلسہ" منعقد کیا جس میں سب عورتوں نے مل کر یہ "قرارداد" منظور کی کہ ہم آخری وقت تک اس یہودی[2] شہزادی کے خلاف جنگ لڑیں گی اور جب تک طیطوس کو اس سے نجات نہ دلا دیں گی چین سے نہ سوئیں گی۔

طیطوس کا طرزِ عمل

اس کے بعد طیطوس کے دل و دماغ میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ اب اس نے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے اپنے صحیح رنگ میں پیش کیا۔ وہ انتہائی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس کے نزدیک گناہ و ثواب میں کوئی فرق نہ رہا۔ اس کی راتیں عیش و عشرت میں بسر ہونے لگیں اور اپنی ملکہ مارشیا کی طرف اس نے کبھی توجہ تک نہ کی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی رعایا پر بھی بے انتہا مظالم توڑنے لگا۔ وہ اس قدر بے رحم ہوگیا کہ اس پر

---

[1] اس زمانہ میں روم میں بھی غلام اور لونڈیاں رکھنے کا رواج عام تھا، اور عرب ممالک کی طرح وہاں بھی ان لوگوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی۔ (ارمان)

[2] طیطوس یہودیوں کے خلاف حال ہی میں جنگ لڑا تھا اور اہل روم اور یہودیوں کے درمیان سخت دشمنی پائی جاتی تھی۔ یہ مذہبی اور قومی تعصب بہت شدت اختیار کر چکا تھا۔ (ارمان)

نیروشانی کا گمان ہونے لگا۔ وہ بینرس کا پرستار تھا، اسی وجہ سے لوگ اس کے خلاف ہوگئے کہ اسے ایک یہودن سے کیوں محبت ہوئی ہے؟ انھیں کیسے گوارا ہوسکتا تھا کہ ایک غیر ملکی عورت[1] بہادر جرنیل طیطوس کو اپنی سحر آفریں محبت کے جال میں اسیر کرے۔ انھیں بینرس سے سخت عداوت ہوگئی اور اس حقیقت نے کہ ملکہ خود اس عورت کی جان کی دشمن ہے انھیں اور بھی آتش زیر پا کر دیا، لیکن طیطوس کا رعب اور دبدبہ اسقدر تھا کہ وہ علانیہ اس عورت کے خلاف کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا کر خاموش ہوجاتے۔ لیکن طیطوس کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ روز بروز اس کے دل میں بینرس کی محبت بڑھ رہی تھی۔ وہ اس ساحرہ کے حسن سے پوری طرح مسحور ہوکر رہ گیا تھا۔

بینرس اپنے وطن کے لیے بہت اداس رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنے وطن اور اہل وطن کو یاد کرکے روتی۔ جب اسے اپنی ننھی ننھی بہنوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی یاد آتی تو اس کی چیخیں نکل جاتیں۔ مگر وہ طیطوس کو بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ جب وہ اپنے ہم وطنوں کو یاد کرکے اداس ہوجاتی تو طیطوس دیوانہ وار اس کی آغوش میں آگرتا۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے بوسوں سے پونچھ ڈالتا اور اس کی لمبی لمبی پریشان زلفیں اس کے چہرے سے ہٹا کر اس کے ہونٹوں سے اپنے بے تاب ہونٹوں سے ملا لیتا اور نہ جانے کتنی دیر تک اپنے ہونٹ اس کے خوبصورت ہونٹوں سے ملائے رکھتا۔ بلکہ اس کے نازک نازک سیمگوں قدموں پر بھی بوسوں کی بارش کر دیتا اس طرح طیطوس کا دیوانہ وار اظہار عشق بینرس کے مجروح دل کے لیے باعث تسکین بن جاتا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہم وطنوں اور عزیزوں کو بھول جاتی۔

طیطوس نے اپنی شریک حیات مارشیا کو دل سے بالکل بھلا دیا تھا۔ اب اس کے شبستان کو صرف ایک شمع روشن کرتی تھی۔ اب اس نے کبھی اپنی حسین ملکہ کے گورے گورے بازوؤں میں بازو نہ ڈالے تھے۔ اب کبھی اس نے حسن کی اس جیتی جاگتی تصویر کو پیار سے آغوش میں نہیں لیا تھا۔ اب کبھی اس نے اپنی ملکہ کے نازک ہونٹوں سے "شراب محبت"

---

[1] بینرس، غالباً یروشلم کی رہنے والی تھی۔ (ارمان)

پی کر اپنے دل کی پیاس نہ بجھائی تھی ـــــــ اب کسی اور کے ہونٹ اس کے دل کی لگی کو بجھاتے تھے ـــــــ ملکہ کا وجود اب اس کی روح کے لیے باعث تسکین نہ تھا لیکن آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ اس سے محبت ہی نہیں بلکہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ لیکن اب ایک یہودی ساحرہ نے ہوش وحواس چھین لیے تھے۔ اور اس نے اپنی بیوی کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا۔

جب بھی کوئی " پبلک جلسہ " یا تقریب ہوتی اور طیطوس اس کی صدارت کرتا۔ بینیرس اس کے ساتھ ہوتی۔ شہنشاہ روم کے بیٹے کے ساتھ اس کی ہر دلعزیز ملکہ کی بجائے اس کی بدنام محبوبہ ہوتی جس کے غیر ملکی ہونے کا احساس رعایا کو آتش زیر پا کیے رکھتا۔ وہ آہستہ آہستہ کانوں میں باتیں کرتے اور کہتے " آہ ! ایک غیر ملکی یہودن عنقریب ملکہ بن کر ہم پر حکمران ہونے والی ہے"

طیطوس تخت پر

آخر شہنشاہ ویسپاسین کو موت نے اپنے آغوش میں چھپا لیا۔ سینٹ کو اب فیصلہ کرنا تھا کہ روما کا شہنشاہ کسے منتخب کیا جائے۔ سینٹ کے ارکان ظالم طیطوس سے بہت خوف زدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ عنانِ حکومت سنبھالتے ہی رعایا پر ظلم توڑنے لگے گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی ظالمانہ حرکت سے ملک میں بغاوت ہو جائے اور اس طرح ملک کو شدید نقصان پہنچے۔

بہر حال بینیرس مسرت سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ شاندار مستقبل کے خیالات اسے مسرور بنا رہے تھے۔ دوسری طرف مارشیا دیوانہ وار محل کے کمروں میں ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پھر رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی سہیلیوں سے کہتی " نہیں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ وہ بندریا کبھی ملکہ نہیں ہو سکتی۔ میں اُسے ہرگز ملکہ منتخب نہ ہونے دوں گی۔ ملکہ بننے کا حق صرف مجھی کو ہے۔ سینٹ کبھی اجازت نہیں دے گی کہ ایک یہودن ان پر حکمران ہو۔"

آخر طیطوس کو شہنشاہ بنانے کی رسم ادا کر دی گئی۔ لوگ خوش بھی تھے اور خوفزدہ بھی۔ خوش اس لیے کہ ایک شاندار تقریب منائی جا رہی تھی۔ جس میں وہ بھی حصّہ لے رہے تھے اور خوفزدہ اس لیے تھے کہ انھیں یقین تھا کہ طیطوس عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی رعایا پر ظلم ڈھانے شروع کر دے گا۔

تزئینِ حرم

بینیرس نے اپنی سہیلیوں سے کہا " کنیزوں سے کہہ دو میرے شبستان کو آج اچھی

طرح سے سجا دیں۔ جس راستے سے شہنشاہ سلامت آنے والے ہیں اُس راستے پر پھول بچھا دو۔ محل میں اس قدر روشنی کر دو کہ رات پر دن کا گمان ہونے لگے۔ میرے شبستان کا فرش آج عطر سے دھو دو۔ آج میرے بستر پر خوبصورت ترین اور نرم و نازک پھولوں کا فرش بچھا دو۔ خوشبودار شمعیں روشن کر دو۔ اور خزانے کی کنجی میرے ہاتھ میں دے دو، تاکہ شہنشاہ سلامت جب آئیں تو میں زر و جواہرات ان پر نثار کروں۔ آج آسمانوں کی جنت زمین پر اُتر آئے گی۔ آج میرے شبستان پر جنت کا گمان ہوگا۔ آج میں اپنے محبوب کے گلے میں باہیں ڈال کر اور اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا کر مسرت کی ایک شیریں نیند سو جاؤں گی ـــــــ

آج بہترین رقص کرنے والی لڑکیوں کو بلاؤ اور ایک محفلِ عیش و عشرت منعقد کرو۔ آج چنگ و رباب اور بربط کے نغموں سے محل میں ایک حشر برپا کر دو تاکہ خود زہرہ دیوی ہمارے محل سے نکلتے ہوئے نغموں کی دل کش آواز سن کر اپنے قصرِ بلوریں سے باہر نکل آئے اور میرے قدموں پر اپنا سر رکھ دے۔

بینیرس نے بہترین ملبوس زیبِ تن کیا۔ باریک اور چست، تاکہ اس کے سینے کا دلکش ابھار اور اس کے خوبصورت جسم کا نور شہنشاہ کے دل میں جذبات کی آگ لگا دے۔ وہ دیوانہ ہو کر اس پر "حملہ" کر دے۔ اسے اپنی آغوش میں چھپا لے۔ اسے اپنی آہنی گرفت میں بھینچ ڈالے اور اس کے ہونٹوں، رخساروں کے اتنے بوسے لے جتنے آج تک دنیا کے تمام عاشقوں نے اپنی محبوب عورتوں کے نہ لیے ہوں ـــــ بینیرس کے دل میں محبت کا میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ اس کے خون کے ہر قطرے میں جذبات نے ایک مسرت انگیز ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ آج وہ جذبات محبت کے سمندر میں تنکے کی طرح بہ جانے کے لیے تیار تھی۔

محبوبہ کی مایوسی

شام کو بینیرس کے شبستان کے قریب قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اپنے مخملیں صوفے پر سے اچک کر کھڑی ہو گئی اور دروازے سے باہر آ گئی، لیکن اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب طیطوس کی بجائے وہاں ایک سپاہی کھڑا دیکھا۔

سپاہی آ کر کہنے لگا "شہنشاہ سلامت کہتے ہیں کہ آج رات میں ذرا دیر سے آؤں گا۔"

بینیرس یہ ناخوشگوار اور غیر متوقع الفاظ سن کر بھوکی شیرنی کی طرح غضب ناک ہو گئی اور

کہنے لگی "نکل جاؤ میرے محل سے، میں تمھیں آج سے برطرف کرتی ہوں"۔

جب سپاہی چلا گیا تو وہ آکر اپنے بستر پر گر گئی اور اپنا پھول سا چہرہ اپنے کنول کے سے ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ کیونکہ یکایک "حقیقت" اس پر روشن ہو گئی تھی اور اس کے دل میں وہ تمام شکوک و شبہات پیدا ہو گئے جن کا تصور اس کے لیے لرزہ خیز اور ہیبت ناک تھا۔

وہ بار بار روتی اور بار بار چپ کر جاتی اور دل میں کہتی "شاید طیطوس آج مصروف ہوگا اس لیے نہیں آیا۔ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ہمیں آج ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس سے پہلے طیطوس نے کبھی اتنی بے التفاتی نہیں کی تھی۔ وہ ہر ضروری کام کو ٹھکرا کر اس کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا، لیکن آج نہ جانے کونسا ایسا ضروری کام آپڑا تھا کہ وہ کسی طرح آنے کا نام نہ لیتا تھا۔

یکایک وہ بے تاب ہو کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر اُدھر مضطربانہ انداز سے پھرنے لگی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور کان قدموں کی آہٹ پر تھے۔

پیامِ مرگ آخر کار طیطوس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بینیرس کا دل دھڑکنے لگا جب طیطوس کے چہرے پر اس نے ایک بے تاب نگاہ ڈالی تو اس پہلی ہی نگاہ میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے محبوب کے دل میں کوئی زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، لیکن اس کے باوجود بینیرس نے طیطوس کو اپنے آغوش میں لینے کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے اور اس کے ساتھ چمٹ کر کہنے لگی "میرے پیارے محبوب! کیا بات ہے، مجھے ایسے معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے"۔

طیطوس نے اپنی محبوبہ کا منہ چوم لیا اور اُسے اپنی آغوش میں لے کر اور اس کے چہرے پر پیار بھری نظریں گاڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا "پیاری بینیرس! تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے؟ میرے محبت کے مندر کی دیوی صرف تمھیں ہو۔ کیا تمھیں میری محبت پر بھی شک ہوا ہے؟"

بینیرس دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بولی "نہیں میرے پیارے محبوب، اب تک تمھاری طرف سے میرے دل میں کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ آج مجھے معلوم ہو

رہا ہے کہ تمھاری دنیا بدل گئی ہے۔ میرے پیارے! آج میری روح کو ضرور کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ طیطوس کے سینہ سے لگالیا اور زاروقطار رونے لگی۔

طیطوس اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ آخر کانپتی ہوئی آواز میں بولا "بینیرس! آج میں روم کا شہنشاہ بنا دیا گیا ہوں۔ یہ دن ازل سے میری قسمت میں لکھا تھا اور میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ جب یہ دن آئے گا تو میں تمھیں بھی حکومت میں اپنا حصہ دار بناؤں گا۔ جب لوگ میری ستائش میں نعرے لگا رہے تھے تو روما کے گذشتہ شہنشاہوں کے چہرے میری نظروں کے سامنے آگئے۔ روما کی شان اور عظمت کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا میرے عظیم الشان فرائض کا نقشہ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ایک شہنشاہ کو کس قدر پُرشوکت ہونا چاہیے۔ پھر میری پیاری تمھیں بتاؤں میں اپنے عہد کا آغاز کس طرح بے عزتی اور بے آبروئی سے شروع کر سکتا ہوں۔"

شہنشاہ کے یہ الفاظ سن کر بینیرس کا چہرہ زرد ہوگیا۔

کروٹ ۱ طیطوس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میری جائز بیوی مارشیا ہر طرح سے ملکہ کہلانے کے قابل ہے اور ملکہ بننے کا حق بھی اسی کو ہے۔ اس کے حق کو نظرانداز کر دینا ایک اچھے حکمران کو زیب نہیں دیتا۔"

بینیرس رو کر کہنے لگی "لیکن تمھارے وعدے کیا ہوئے؟"

"مجھے یاد ہے کہ میں نے تم سے بہت سے وعدے کیے تھے۔ افسوس ہے کہ میں ان وعدوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کروگی۔"

بہت دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد طیطوس اٹھ کھڑا ہوا اور بینیرس اس کی طرف دردبھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

"آقا! میں نے کونسی خطا کی تھی کہ آج تم مجھے تباہی کے خوفناک غار میں دھکیل رہے ہو۔ تمھاری محبت اور تمھاری قسموں پر اعتبار کر کے میں نے اپنی شہرت پر بٹہ لگایا۔ رشتہ داروں اور عزیزوں کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے رسوا ہوگئی۔ پیارے وطن کو میں نے خیرباد کہا۔ تم کہتے

ہو تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ اگر ٹھیک کہتے ہو تو میرے بغیر کس طرح رہ سکو گے ؟

"پیاری بینیرس ! ملکی فرائض کا بوجھ میرے کندھوں پر آپڑا ہے۔ اگر میں نے محبت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تو میں اپنے فرائض اچھی طرح انجام نہ دے سکوں گا، محبت کی قربانی ہی میری روح کو تسکین دے سکتی ہے۔"

بینیرس اپنے محبوب کے ساتھ چمٹ گئی اور کہنے لگی "جس طرح تم کہہ رہے ہو اسی طرح ہوگا اگر میری محبت کی قربانی سے تمھارا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے تو میں بخوشی تمھاری زندگی کے شاداب گلستان سے کوچ کرنے کو تیار ہوں۔"

طیطوس نے بینیرس کو دونوں ہاتھوں سے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا "اگرچہ ہم جدا ہو رہے ہیں لیکن میرے دل میں جو جگہ تم نے حاصل کی ہے وہ اور کوئی حاصل نہ کرے گا۔"

فرائض نے محبت پر فتح حاصل کر لی۔ مارشیا کی جائز محبت طیطوس کی بے راہروی پر غالب آئی، بینیرس روم چھوڑ کر اپنے وطن کو چلی گئی۔ اگرچہ اس کے جانے کے بعد طیطوس اپنے دل سے اس کی یاد کو نہ مٹا سکا مگر ایک حکمران کی حیثیت سے اس کے ظالمانہ کردار کا جائزہ لیتے وقت جب ہم ایک انسان کی حیثیت سے اس کی زندگی اور کردار کے اس پہلو کو دیکھتے ہیں، تو تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے ؎

مرے پیار کو اک نئے موڑ پر دیکھ کر یوں مری جاں تعجب نہ کر
بدلتے رہے ہیں، بدلتے رہیں گے زمانے کے ہمراہ دل کے چلن

ملکہ کلوپیٹرا کے رومان

"تاج میرے سر پر رکھو اور مجھے شاہی لباس پہناؤ تاکہ میں اسی لباس میں اس سے ملوں جو میں نے جبل الطارق کی ملاقات میں زیب تن کیا تھا۔ وہ دیکھو میرا پیارا کھڑا مجھے بلا رہا ہے میری بہادری کی تعریف کر رہا ہے اور سیزر کے منصوبوں پر ہنس رہا ہے۔ خاوند! میں آئی" یہ کہتے ہوئے کلوپیٹرا نے بھی سانپ کو پکڑ کر اپنے آپ کو ڈسوا کر خودکشی کر لی اور اپنے محبوب شوہر سے جا ملی سیزر روتا رہا تھا۔

کلوپیٹرا کی شہرت

کلوپیٹرا دنیا کی وہ حسین اور بے نظیر ملکہ ہے جس کی وفات کو دو ہزار سال گزر چکے ہیں مگر آج بھی اس کے جمال اور جلال کی داستانیں اُسی طرح تازہ ہیں سلطنت رومہ کا مشہور تاجدار جولیس سیزر اور مارک انٹنی وہ مشہور فاتح ہیں جن کی مٹھی میں ساری دنیا تھی مگر اس خوش خصال اور خوش گفتار ملکہ نے اپنے بے مثال حسن، خداداد ذہانت خوش طبعی، بذلہ سنجی اور شیریں کلامی کے باوصف ان دونوں فاتحین کے دلوں کو فتح کیا یہی ملکہ اینٹنی کو تباہ کرنے اور آکٹیوین کو رومہ کا شہنشاہ بنانے کا باعث تھی۔ اگرچہ اس کی عالمی شہرت کا باعث اس کی بے مثل خوبصورتی تھی تاہم اس کا ذاتی کردار بھی اُسے تاریخ میں زندہ جاوید بنانے کا باعث تھا۔

فرعونِ مصر کا دربار

سکندریہ میں فرعونِ مصر کے محل میں روم کا شہنشاہ جولیس سیزر بیٹھا تھا فرعونِ مصر اور دوسرے درباری بھی موجود تھے۔ سیزر[1] ابھی ابھی اس مہم سے لوٹا تھا جس میں اس نے پمپئے اعظم کو زبردست شکست دی تھی۔ وہاں سے مصر کا رخ کیا تھا۔ مصر کی اکیس سالہ حسین ملکہ کلوپیٹرا اور اس کے تیرہ سالہ بھائی ٹامی چہارم[2] کے درمیان تخت کے متعلق

---

[1] ۱۰۰ تا ۴۴ ق م۔ روم کا مشہور جرنیل پمپئے چاہتا تھا کہ رومہ کی سلطنت اس کے قبضہ میں آجائے۔ سیزر اس کا حریف تھا۔ فرسیلیا کے میدان میں دونوں کی جنگ ہوئی۔ [2] کلوپیٹرا مصر کے فرعون ٹامی سیزدہم کی بیٹی تھی۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جولیس سیزر
کلیوپطرا

جھگڑا شروع ہوگیا تھا۔ یہ دونوں بہن بھائی مل کر مصر پر حکومت کر رہے تھے اور بات بات پر آپس میں اختلافات پیدا ہو جاتے تھے۔ بالآخر بھائی نے بہن کو جلاوطن کر دیا تھا۔

کلوپیٹرا نے شام پہنچ کر کچھ فوج جمع کی اور سکندریہ پر حملہ کر کے بھائی سے تخت چھیننا چاہتی تھی کہ اس اثنا میں جولیس سیزر سکندریہ پہنچ گیا۔ چنانچہ فرعون کے محل میں شاہی خاندان کے افراد نے بہن بھائی کے جھگڑے کا مسئلہ سیزر کے سامنے رکھ دیا کہ وہ ان میں فیصلہ کرا دے۔

حسن کا سحر کلوپیٹرا کو وہاں بلایا گیا۔ جب وہ محل میں پہنچی اور سیزر کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس حسین ساحرہ کی شانِ دلربائی دیکھ کر ورطۂ حیرت میں گم ہوگیا۔ کلوپیٹرا کے شباب اور اس کی رعنائی نے سیزر کو مسحور کر لیا۔ اس نے ملکہ کی درخواست سنے بغیر فیصلہ کر لیا کہ مصر کا تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور اُسے بیک وقت مصر اور روما دونوں سلطنتوں کی ملکہ بنا دے گا۔

کلوپیٹرا سیزر کے پہلو میں کئی ماہ کی لڑائیوں کے بعد جولیس سیزر نے مصر کا تخت کلوپیٹرا کو دلا دیا۔ کلوپیٹرا کا بھائی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد بھاگ نکلا اور دریائے نیل میں غرق ہوگیا۔ اب ملکہ تخت کی واحد مالک تھی۔ جتنی مدت سیزر ملکہ کے لیے لڑتا رہا ملکہ سیزر کے ساتھ رہی اور وہ اس کے حسن و شباب کی بہاریں لوٹتا رہا۔ دونوں بڑی خوشی اور مسرت کے دن گزارتے رہے۔ فتح کے بعد سیزر سکندریہ کے محل میں ملکہ کے ساتھ رہنے لگا اور ملکہ سے اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سیزرین ثامی رکھا گیا۔ یہ بچہ دو عظیم سلطنتوں یعنی مصر اور روما کا وارث بنا[1]۔ بچہ کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سیزر سکندریہ سے چلا گیا۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) ثامی نے ۸۰ ق م سے ۵۸ ق م تک حکومت کی پھر اپنے بیٹے ثامی تپاردہم کو سونپ دی اور کلوپیٹرا اور ثامی مل کر حکومت کرتے تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق فراعنہ مصر کے خاندانوں میں سگے بھائی بہنوں کی شادیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں چنانچہ کلوپیٹرا کے باپ نے مرتے وقت ہدایت کی تھی کہ کلوپیٹرا کی شادی اس کے چھوٹے بھائی سے کر دی جائے مگر بھائی کلوپیٹرا کے خلاف ہوگیا اور اسے تاج و تخت چھوڑ کر مصر سے نکلنا پڑا۔

[1] ملکہ کے بعد یہی بچہ سیزرین، ثامی شانزدہم کے نام سے مصر کے تخت پر بیٹھا۔

ملکہ کو سیزر سے بڑی محبت تھی مگر سیزر فتوحات کی خاطر سکندریہ سے جا چکا تھا۔ اس نے شمالی افریقہ اور ایشیا میں کئی علاقے فتح کیے۔ برطانیہ پر بھی حملے کیے[1]۔ جب روما واپس گیا تو ملکہ کو وہاں بلا بھیجا۔ وہ پہلے ہی سے بے تاب تھی۔ پیغام ملتے ہی روانہ ہو گئی۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئی۔ علاوہ ازیں چھوٹے بھائی ٹامی شانزدہم کو بھی ساتھ لیا جو اس کے ساتھ حکومت میں برائے نام شریک تھا۔

کلوپیٹرا روما میں ملکہ سیزر کے ساتھ محل میں عیش کے دن گزارنے لگی۔ اس نے سیاسی معاملات سے دلچسپی چھوڑ دی تھی اور سیزر کی محبّت میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ سیزر بھی اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے کئی سال روما میں گزارے۔ اس تمام مدّت میں سیزر اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا رہا۔ لیکن سیزر کے جہاں بہت زیادہ دوست اور مہربان موجود تھے وہاں اس کے دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی۔ چنانچہ وہ دن آگیا جو سیزر کی زندگی کا آخری دن تھا۔ ۴۴ ق م میں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

سیزر کی موت سیزر کی موت سے روما کی سلطنت میں سول وار شروع ہو گئی۔ فلپی دانی مقدونیہ میں سیزر کے مخالفوں اور اس کے دوستوں میں جنگ ہوئی اور روما کی سلطنت مختلف جرنیلوں میں تقسیم ہو گئی۔

نیا رومانی باب کلوپیٹرا سکندریہ میں بیٹھ کر تین سال تک اہل روما کی خانہ جنگیوں کا تماشا دیکھتی رہی۔ روما کی سلطنت تین جرنیلوں[2] میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مشرقی حصہ انٹنی[3] کو ملا۔ یہی وہ جرنیل ہے جو جولیس سیزر کی وفات کے بعد کلوپیٹرا پر مفتون ہوا۔ اور اس کے لیے نہ صرف

---

[1] ۵۵ ق م میں سیزر نے برطانیہ پر حملہ کیا مگر فوج تھوڑی تھی اس لیے کامیابی نہ ہوئی اور واپس چلا گیا۔ اگلے سال پھر ایک زبردست فوج لے کر برطانیہ پر چڑھائی کر دی۔ برطانوی جرنیل کیسی ویلینس کو زبردست شکست دی اور ملک بھی سیزر کے قبضہ میں آگیا۔

[2] جرنیلوں کے نام یہ ہیں: آکٹیوس سیزر، لیپی ڈس اور مارک انٹنی۔ اول الذکر بعد ازاں روما کا شہنشاہ بنا۔

[3] ۸۳ ق م تا ۳۰ ق م مشہور رومن جرنیل جو سیزر کا دست راست تھا۔ سیزر کی وفات کے بعد اس کے مخالف گروہ کے ساتھ مل گیا تھا۔

سلطنت کھوئی بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ کلوپیٹرا نے سیزر کی معیت میں زندگی کے نہایت شیریں اور پُرمسرّت دن گزارے تھے، لیکن اب انٹنی کے ساتھ واسطہ پڑنے پر اس کی المناک زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ انٹنی پر اُسی طرح فریفتہ ہوگئی جس طرح سیزر پر ہوئی تھی، مگر یہ محبت دونوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

انٹنی اور کلوپیٹرا

شیکسپیئر نے نہایت ہی خوبصورت انداز سے انٹنی اور کلوپیٹرا کی محبت اور ان کے انجام کی داستان بیان کی ہے۔ خان احمد حسین خان کے الفاظ میں اس کا ترجمہ حسب ضرورت تلخیص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر لکھتا ہے کہ جب وہ (انٹنی) جبل الطارق پہنچا تو اس نے کلوپیٹرا ملکہ مصر کو دیکھا جو ان دنوں عین عالم شباب میں تھی اور اس کے حسن وجمال کا شہرہ تمام عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ اس سے چھ سال پہلے جولیس سیزر اعظم اس پر مفتون ہو چکا تھا۔ ملکہ کو اس کے بھائی نے تخت سے معزول کر دیا تھا۔ سیزر نے اُسے پھر تخت دلایا اور اس سے ملکہ کا بیٹا سیزرین پیدا ہوا۔ مارک انٹنی نے ملکہ مصر کو پہلی مرتبہ روما میں دیکھا تھا جب اُسے سیزر کے جلو میں وہاں لے گئے تھے وہ اسی وقت سے ملکہ کا شیدا تھا۔ وہ جس قدر حسین تھی اُسی قدر بذلہ سنج اور شیریں گفتار تھی۔ اسے جبل الطارق میں بظاہر اسی الزام کی جوابدہی کے لیے بلوایا تھا۔ کہ وہ کیسیس[1] کی سازش میں شریک تھی مگر بجائے اس کے کہ بحیثیت جج اس کے مقدمے کی سماعت کرتا۔ اس کا عاشق اور غلام ہوگیا۔ اس کے لیے مصر پہنچا اور اس کے ہاتھ بک گیا۔

جس وقت وہ مصر میں ملکہ کے شاہی محل واقع اسکندریہ میں عیش وعشرت اور لہو ولعب میں مصروف تھا۔ انٹنی کی بیوی فلویا اور اس کے بھائی لوسی اس نے بدیں امید کہ وہ اٹلی میں واپس آجائے، اگیٹوس سیزر[2] کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا مگر ان کو شکست ہوئی اور فلویا نے بھاگ کر

---

[1] یہ روما کا مشہور جرنیل تھا جو سیزر اعظم کی ڈکٹیٹرشپ کے سخت خلاف تھا۔ وہ سیزر کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ اسے مارک انٹنی نے شکست دی اور ۴۲ ق م میں مر گیا۔ سیزر کے قتل میں کلوپیٹرا پر بھی کیسیس کی مدد کرنے کا شبہ کیا گیا تھا۔ [2] یہ وہ سیزر ہے جو سیزر اعظم کے بعد اگسٹس کے نام سے روما کا پہلا شہنشاہ بنا۔ ۶۳ ق م میں پیدا ہوا اور ۱۴ ق م میں مرا۔ انٹنی اور لیپیڈس کے ساتھ رہا تھا۔ ۴۰ سال تک روما کا حاکم اعلیٰ رہا۔ اگسٹس کا دورِ حکومت بڑا شاندار تھا

یونان میں پناہ لی۔

انٹنی سہولت سے اٹلی جانے کی تیاری کر رہا تھا جب سکندریہ میں روما سے قاصد آئے تو انٹنی کے افسر دل میں اس سے ناراض تھے اور اس کی عیاشی و غفلت کے شاکی۔

ایک دن ملکہ اپنے آشنا کے ساتھ شاہی محل کے ایک کمرے میں آئی تو ان میں سے ایک نے کہا "دیکھنا یہ دنیا کا ستون کیسے قلب ماہیت سے دربار کا مسخرہ بن گیا ہے۔"

ایک دن وہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خادم نے کہا "جناب روما سے خبر آئی ہے۔"

انٹنی نے درشتی سے جواب دیا "روما کی خبریں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ مختصر الفاظ میں کہو کہ کیا بات ہے۔"

ملکہ نے ازراہِ تمسخر کہا "انٹنی! سن لو۔ کیا خبر ہے شاید فلویا خفا ہے۔ یا لونڈے سیزر[۱] نے کوئی فوری حکم بھیجا ہے۔ تم شرما کیوں گئے۔ کیا یہ سیزر کا ادب ہے یا فلویا کی سرزنش۔"

(مجبوراً انٹنی روما پہنچا۔ سیزر اور لیپی ڈسی سے ملا۔ سیزر جانتا تھا کہ کلوپٹرا کی محبت میں سیزر گمراہ ہو رہا ہے چنانچہ اس نے اپنی بہن اکٹیویا کی شادی انٹنی سے کر دی)

ملکہ مصر بھی غافل نہ تھی۔ ہر روز اس کے قاصد روما آتے اور پل پل کی خبر دیتے تھے۔ جب ایک قاصد یہ خبر لے کر آیا کہ انٹنی کی شادی اکٹیویا سے ہو گئی ہے تو ملکہ اس قدر برافروختہ ہوئی کہ خنجر لے کر اُسے مارنے جھپٹی۔ اگر وہ بھاگ کر جان نہ بچا لیتا تو مارا گیا تھا۔

جب اس کا غصہ فرو ہوا تو اس نے قاصد کو پھر بلوایا اور اس سے پوچھا کہ اکٹیویا کی شکل و صورت کیسی ہے؟ اور جب اس نے کہا "تم سے کہیں کم خوبصورت ہے، فکر نہ کرو" تو ملکہ نے اسے انعام دیا۔

انٹنی اور سیزر میں جب صلح صفائی ہو گئی تو حکومت ثلاثہ کے تینوں ارکان یکجا ہو کر پامپی پر بر مقام میسینا حملہ آور ہوئے۔ اُسے امید تھی کہ انٹنی کو وہ گانٹھ لے گا کیونکہ کسی زمانے میں وہ انٹنی

---

[۱] ایکٹیوس سیزر یعنی آگسٹس کی طرف اشارہ تھا۔

پر احسان کر چکا تھا۔ جب دونوں ملے تو یہ گفتگو ہوئی:

پامپی: "جب سیزر اور تمہارا بھائی آپس میں لڑ رہے تھے تو تمہاری والدہ سسلی میں میرے پاس آئی تھی اور میں بڑی عزت اور احترام سے پیش آیا تھا۔"

انٹنی: "میں سن چکا ہوں، تمہارا ممنون ہوں اور چاہتا ہوں کہ احسان کا بدلہ اتار دوں۔"

پامپی: "تو ہاتھ ملاؤ۔ مجھے امید نہ تھی کہ یہاں تم سے ملاقات ہو گی لیکن خیر!"

پامپی کو معلوم تھا کہ تینوں سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے اس نے ان سے اس طرح صلح کر لی کہ سسلی اور سارڈینیا لے کر بحیرۂ روم کو بحری قزاقوں سے صاف کرنے کا اقرار کیا۔

پامپی کے ہمراہیوں میں سے ایک نے انوبارلس سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ آکٹیویا کی شادی انٹنی سے ہو گئی ہے اور کیا انٹنی اور سیزر ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے ہیں؟"

انوبارلس: "یہ رشتہ جس نے ان کی دوستی کو باندھا ہے ان کی محبت کا گلا گھونٹ دیگا آکٹیویا سرد مہر اور خشک مزاج ہے۔ اس کا اور انٹنی کا جوڑ ناموزوں تھا۔ آخر وہ اپنی مصری آشنا کے پاس ضرور جائے گا۔ اور آکٹیویا کی آہیں سیزر کے غصے کی آگ کو ہوا دیں گی۔ انٹنی خواہش کا بندہ ہے۔ یہ شادی صرف ایک قسم کی حکمت عملی تھی۔"

جب میسی نم کی کانفرنس ہو چکی تو دولہا دلھن گرم جوشی سے اظہار محبت کر کے اُس سے جُدا ہوئے اور یونان کو روانہ ہو گئے۔ لیکن چند دن کے بعد سالے اور بہنوئی کے درمیان کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ کیونکہ سیزر نے پامپی سے بگڑ کر سارڈینیا اُس سے واپس لے لیا۔ اس لیے انٹنی نے اس بہانے سے کہ "تم جاؤ اور سیزر کو سمجھاؤ"۔ آکٹیویا کو روم میں بھیجا اور خود سکندریہ چلا گیا۔۔ وہاں جاکر اُس نے اعلان کر دیا کہ میں شہنشاہ مشرق ہوں۔ پھر اپنے معصوم بیٹوں کو بادشاہیاں دیں۔ تخت نشینی کے جشن میں کلوپیٹرا ملکہ قرار پائی اور آسٹیس کے لباس میں جلوہ افروز ہوئی۔

جب یہ خبر سیزر کو پہنچی تو بہت خفا ہوا اور جس مقصد کے لیے آکٹیویا اس کے پاس گئی تھی وہ پورا نہ ہوا جس پر انٹنی نے اُسے طلاق دے دی۔ اس طرح دونوں میں ناچاقی کی خندق مکمل ہو گئی۔

پامپی کو جب سیزر نے شکست دی تو وہ ایشیا کو بھاگ گیا اور وہاں مارا گیا اور رفتہ رفتہ سیزر نے لیپی ڈس سے جو تینوں میں کمزور تھا سب اختیار چھین لیا۔ اور وہ گوشہ نشین ہو کر رہ

میں زندگی بسر کرنے لگا۔ اس طرح سیزر اور انٹنی کے لیے مقابلے کا راستہ صاف ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کون واحد مالک ہو گا؟

انٹنی ایک بڑا لشکر اور جنگی بیڑا لے کر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر اکٹی ریم کی پہاڑی کے قریب جما ہوا تھا۔ ہر چند انو بارلس نے منع کیا لیکن ملکۂ مصر ساتھ ہی گئی۔

انو بارلس: "ملکہ آپ کی موجودگی شہنشاہ کے لیے باعث خلل دماغ ہو گی۔ اُس سے ہوش و حواس چھین لے گی اور اُسے ضروری کام کرنے کی فرصت نہ دے گی۔ روما میں پہلے ہی مشہور ہے کہ اس میں مردانگی نہیں رہی اور لوگ کہتے ہیں کہ انتظام جنگ تمھارے اور تمھارے آدمیوں کے ہاتھ میں ہے۔"

ملکہ: "لعنت ہو روما پر اور ان لوگوں کی زبانوں پر جو ہمارے خلاف باتیں بناتے ہیں۔ میں ملکہ ہوں اور اس حیثیت میں شامل جنگ ہوئی ہوں۔" انٹنی کا زور سمندر کی نسبت خشکی پر زیادہ تھا، اس لیے اس نے سیزر کو فارسیلیا میں جہاں پامپی نے سیزر کو جس کا وہ متبنیٰ تھا شکست دی تھی، مقابلے کے لیے للکارا۔ لیکن سیزر نے انکار کر دیا کیونکہ ایک تو اسے معلوم تھا کہ انٹنی بے بدل جرنیل ہے۔ دوسرے اس کا اپنا جنگی بیڑا جو پامپی کو شکست دے کر آیا تھا انٹنی کی بحری فوج سے جس کی کمان مصر کے ناقابل نوابوں کے ہاتھ میں تھی زبردست تھا پھر بھی اپنے تجربہ کار صلاح کاروں کے مشورے کے خلاف انٹنی نے بحری لڑائی منظور کر لی اور ملکہ مصر نے جس کو اپنے جنگی بیڑے پر بہت ناز تھا۔ انٹنی کی غلط ضد کی تائید کی۔

لڑائی بڑے جوش و خروش سے ہو رہی تھی۔ مصری دستے نے رخ پھیر لیا اور بھاگ اٹھا۔ جب انٹنی نے دیکھا کہ ملکہ مصر کے جہاز بھاگے جا رہے ہیں تو وہ بھی ایک کشتی میں کود کر اس طرف چلا گیا۔ جب لیڈر ہی نہ رہا تو باقی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ صرف انو بارلس ہی وفادار رہا اور اپنے آقا کے پیچھے اسکندریہ چلا گیا۔ اور سیزر بھگوڑوں کے تعاقب کی سہولت سے ساتھ تیاری کرنے لگا۔ شرم اور مایوسی سے بے حال ہو کر انٹنی نے اپنے باقی ہمراہیوں کو اکٹھا کر کے کہا:

"زمین شرما رہی ہے کہ میں اس پر بخوبی کھڑا ہوں۔ میری مصیبتیں اتنی ہیں کہ اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا اور میں ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا۔ میرے پاس ایک جہاز سونے سے لدا ہوا

ہے۔ یہ لو آپس میں بانٹ لو اور سیزر سے صلح کر لو۔ میں خود مفرور رہا اور بزدلوں کو راستہ بتایا لیکن اب جو راستہ اختیار کیا ہے۔ اس میں تمھاری ضرورت نہیں۔ میں دوستوں کے نام تمھیں خط دوں گا اور تمھارا مطلب آسانی سے حل ہو جائے گا۔ میرا جہاز اور خزانہ لے لو اور مہربانی کر کے میرے پاس سے دُور ہو جاؤ کیونکہ میں اب اپنے آپ سے باہر ہو رہا ہوں۔"

اس موقعہ پر ملکہ مصر وہاں آگئی۔

انٹنی : "آہ ملکہ تم مجھے کہاں لے آئیں۔"

ملکہ : "میرے سرتاج! مجھے معافی دو۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم میرے پیچھے آؤ گے۔"

انٹنی : "ملکہ! تم کو خوب معلوم تھا کہ میرا دل تمھارے جہاز میں تھا۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے اختیار میں ہوں اور تمھارے حکم کو دیوتاؤں کے حکم پر ترجیح دیتا ہوں۔ اب مجھے اس لونڈے کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ میں وہی ہوں جو نصف دنیا پر حکمران تھا اور لوگوں کو بناتا اور بگاڑتا تھا۔ اور اب یہ نوبت آگئی ہے کہ فریب اور چالاکی سے اس کوشش میں ہوں کہ وہ لونڈا جو شرائط پیش کرے وہ نرم ہوں۔

تمھیں معلوم ہے کہ تمھاری محبت نے مجھے کس قدر کمزور کر دیا ہے۔ جو تمھاری محبت کہتی ہے وہی کرتا ہوں۔"

ملکہ : (روکر) "معافی دو! آہ معافی دو!"

انٹنی : "تم کیوں روتی ہو۔ تمھارا ایک ایک آنسو تمھاری عزت اور حرمت سے جو ہم گنوا بیٹھے ہیں زیادہ بیش قیمت ہے۔ ادھر آؤ۔ مجھے ایک بوسہ دو اور تلافی ہو جائے گی۔ میں نے یوفرونیس کو سیزر کے پاس بھیجا تھا۔ کیا وہ واپس آگیا ہے؟ میری جان! میرا دل بیمار ہے، لیکن جب قسمت ضربات لگاتی ہے تو میں اور بھی بے پروا ہو جایا کرتا ہوں اور کہتا ہوں جو کرنا ہے کر لے۔"

جو پیغام انٹنی نے سیزر کو بھیجا تھا وہ واقعی عاجزانہ تھا۔ پیغام یہ تھا:

"انٹنی اب سیزر کو اپنی قسمت کا مالک سمجھتا اور مصر میں رہنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اگر یہ اسے منظور نہیں تو پھر یہ درخواست کرتا ہے۔

کہ اسے یونان میں معمولی شہری کی طرح رہنے کی اجازت مل جائے، بلکہ ملکہ مصر بھی سیزر کو بادشاہ تسلیم کر کے سلام اطاعت پیش کرتی ہے۔ اور اس کی تمنا صرف یہ ہے کہ تاجِ مصر اس کے وارثوں میں رہے۔"

سیزر نے نہایت سرد مہری سے یہ وحشیانہ جواب دیا:

"انٹنی کی درخواست میں نہیں سن سکتا۔ ملکہ کی درخواست اُس صورت میں منظور ہو سکتی ہے کہ وہ یا تو اپنے بے عزّت عاشق کو مصر سے خارج کر دے یا وہیں قتل کر دے۔"

ادھر انٹنی کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ادھر اس کے پیچھے پیچھے سیزر نے اپنا ایلچی تھابرس ملکہ مصر کے پاس بھیجا تاکہ ملکہ کو سمجھائے کہ جو سیزر کہتا ہے وہ مان جاؤ اور انٹنی سے قطع تعلق کر لو ملکہ اپنے بچاؤ کے لیے نیم راضی ہو گئی اور اس نے انوبارلس کا استمزاج کیا۔

ملکہ: "اب ہم کیا کریں؟"

انوبارلس: "ہماری خستہ حالت دیکھو اور مر جاؤ۔"

ملکہ: "کیا یہ میرا قصور ہے یا انٹنی کا؟"

انوبارلس: "صرف انٹنی کا۔ جس کی محبت نے اسے اندھا کر دیا۔ اگر تم بھاگ اُٹھی تھیں تو وہ تمھارے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر کیوں آیا۔ جب نصف دنیا، نصف دنیا سے لڑ رہی تھی تو اس نے جرنیل کی حیثیت میں اپنا فرض کیوں نہ پورا کیا۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ تمھارے بھاگتے ہوئے پھریرے کے لیے اس نے اپنی فوج کا ساتھ جو لڑنے مرنے کے لیے تیار تھی، چھوڑ دیا۔"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی انٹنی اور اس کا قاصد جو سیزر کو مل کر آیا تھا اور اس کا جواب لایا تھا۔ داخل ہوئے۔

سیزر کا روکھا پن انٹنی کو بہت بُرا لگا۔ اور اس نے سیزر کو کہلا بھیجا کہ تیرا عالم شباب ہے اور دنیا کو تجھ سے بہت کچھ توقع ہے۔ اگر مرد ہے تو میرے مقابل میں تنہا آ۔ یہ پیغام بھیج کر انٹنی چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد انوبارلس بولا:

"سچ ہے جب انسان پر بدقسمتی چھا جاتی ہے تو اس کی عقل ماری جاتی ہے۔ اس وقت فتح سیزر کے ہم رکاب ہے۔ وہ کب مانے گا کہ ایک مغلوب دشمن کے ساتھ کلہ بکلہ زور آزمائی کرے۔ اس وقت مجھ میں اور میری وفا میں فساد ہونے کو ہے۔ احمق سے وفاداری بے وقوفوں کا کام ہے، لیکن جو شخص ادبار میں اپنے آقا کا ساتھ دے۔ دشمن پر فتح پاتا ہے، اور اس کا نام ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔"

اس اثنا میں سیزر کا ایلچی تھاریس آ پہنچا اور کہلا بھیجا کہ خلوت میں کچھ کہنا ہے۔ ملکہ نے کہا کہ انوبارلس کے سامنے کہہ دو۔

ایلچی : "سیزر کو معلوم ہے کہ تم صرف ڈر سے انٹنی کا ساتھ دے رہی ہو۔ اب تمھیں اس کی محبت نہیں رہی اور اُسے افسوس ہے، وہ تمھیں مورد الزام نہیں سمجھتا۔"

ملکہ : "سیزر دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے انٹنی سے برضا و رغبت تعلق پیدا نہیں کیا۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔"

یہ سن کر انوبارلس کو صدمہ ہوا۔ اور وہ دل میں یہ کہتا رہا کہ میں انٹنی سے پوچھوں گا۔ افسوس ملکہ نے بھی اسے جواب دے دیا۔ اب اس کی تباہی یقینی ہے اور وہ وہاں سے چلا گیا۔

انوبارلس کے جانے کے بعد ملکہ اور ایلچی تنہا رہ گئے۔

ایلچی : "تم جو پیغام دیتی ہو۔ مجھے بتا دو۔ وہ تمھارا حکم مانے گا۔ اگر تم اس پر بھروسہ کرنے کا وعدہ کرو تو وہ بہت خوش ہوگا۔ لیکن اگر انٹنی کو چھوڑ کر اس سے تعلق پیدا کر لو تو وہ باغ باغ ہو جائے گا۔"

ملکہ : "اے نہایت مہربان قاصد! میری طرف سے جا کر اپنے آقا سے کہو میں اس کے ظفریاب ہاتھ کو بوسہ دیتی ہوں۔ اپنا تاج اس کے قدموں میں رکھتی ہوں اور اس کے آگے سجدہ کرکے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کو تیار ہوں۔"

ایلچی : "اس سے بہتر تمھارے لیے اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اجازت دو کہ میں تمھارے ہاتھ کو بوسہ دوں۔"

ملکہ : "تمھارے سیزر کا باپ اکثر ان نالائق ہاتھوں کو بوسہ دیا کرتا تھا۔ یہ لو میرا ہاتھ ہے۔"

اس موقع پر انٹنی اور انوبارلس آ گئے اور ملکہ کے چہرے سے انٹنی اس کی دو رخی تاڑ گیا۔

انٹنی :۔(گرج کر) "تو کون ہے؟"

ایلچی : "میں وہ ہوں جو اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں جو اس وقت سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔"

یہ جواب ایلچی نے گستاخانہ لہجے میں دیا اور انٹنی نے چلا کر اپنے آدمیوں کو آواز دی۔

انٹنی : "دیوتاؤ اور شیطانو! اب اقتدار میرے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ بادشاہ مجھ سے کانپتے اور میرے حکم کا انتظار کرتے تھے۔ ارے کیا بہرے ہو گئے ہو؟ میں وہی انٹنی ہوں۔ اس شخص کو یہاں سے لے جاؤ اور تازیانے لگاؤ۔ اگر اس وقت سیزر کے بیس تابع فرمان بادشاہ ہوتے تو میں سب کو قمچیاں لگواتا۔ لے جاؤ اور اسے چابک مارو۔ اور اس وقت چھوڑو جب یہ کتے کی طرح رحم کی التجا کرے یہ سزا دے کر پھر اسے میرے پاس لاؤ۔ میں اس کے ساتھ سیزر کو پیغام بھیجوں گا۔"

انوبارلس: "بوڑھے شیر کی نسبت جو مر رہا ہو، شیر کے بچے سے کھیلنا بہتر ہے۔"

انٹنی : "کیوں ملکہ! جب میں یہاں آیا تو تم جھینپ کیوں گئیں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمھاری جان نکلنے کو ہے۔ کیا ایسی عورت کے لیے جو رذیل خدمت گاروں پر مہربان ہو رہی ہے میں نے روما میں ایسی بیوی کو طلاق نہیں دی جو مستورات کا زیور تھی۔ مجھے تمھاری عصمت کا حال پہلے سے معلوم تھا۔ تم عصمت کا قیاس کر سکتی ہو لیکن تم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"

جب تھاریس کو خدام تازیانے لگا کر واپس لائے تو انٹنی کے غصے کا رخ ملکہ کی طرف سے اس کی جانب ہو گیا۔

انٹنی : (چلا کر) "اب واپس جا اور سیزر کو بتا کہ تیری کیا عزت ہوئی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ تو میری موجودہ حالت کو دیکھ رہا ہے اور یہ بھول گیا ہے کہ میں کون تھا؟"

ملکہ : "ابھی اور کچھ کہنا ہے؟"

انٹنی : "اب تم اس قدر سرد مہر ہو گئی ہو کہ سیزر کو خوش کرنے کے لیے اس کے ادنیٰ خادم سے آنکھیں لڑا رہی ہو۔"

ملکہ : "اگر تمھارا خیال درست ہے تو خدا کرے میرے سرد دل سے زہریلے اولے پیدا ہوں اور پہلا اولا میرے دل پر گر کر میری جان تحلیل کر دے۔ دوسرا میرے بچے سیزرین کو ہلاک کر دے۔ اس ژالہ باری سے میرے تمام بچے[1] اور بہادر مصری فنا ہو جائیں اور ان کی نعشیں بے گور و کفن پڑی سڑا کریں۔ کوئی انھیں دفن نہ کرے اور دریائے نیل کی مچھلیاں انھیں کھا جائیں۔"

اس اثنا میں خدام سیزر کے ایلچی کو وہاں سے لے جا چکے تھے اور انٹنی کا غصہ گھٹ رہا تھا۔ ملکہ کی تقریر نے اسے موم کر دیا۔

انٹنی : "بس بس۔ مجھے یقین آ گیا۔ سیزر سکندریہ میں خیمہ زن ہے۔ میں وہاں اس سے سرگرم پیکار ہوں گا۔ ہماری خشکی کی فوج شاندار طرز پر قائم ہے۔ جنگی بیڑہ بھی درست ہو گیا ہے۔ اب میں خون میں نہا کر میدان جنگ سے ان ہونٹوں کا بوسہ لینے آؤں گا۔ اب میں کسی کو پناہ نہ دوں گا۔ آؤ! آج کی رات اور عیش میں بسر کریں۔ میرے مظلوم کپتانوں کو بلاؤ۔"

انوبار بس موجود تھا اس نے سر ہلایا اور کہا :

انوبار بس : "تند خو ہونا خوف کی علامت ہے۔ ایسی حالت میں تو فاختہ بھی شترمرغ پر حملہ کر دیتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے کپتانوں کی عقل کم ہو رہی ہے اور جرأت بڑھ رہی ہے۔ جب جرأت عقل کی کمی سے بڑھتی ہے تو وہ اپنے ہتھیار جن سے اسے لڑنا ہے ضائع کر دیتی ہے اب مجھے اس سے کنارہ کش ہونے کا موقع تلاش کرنا چاہیے۔"

جب تھابرس واپس آیا تو باوجودیکہ سیزر کو اس کی بے آبروئی پر بہت غصہ آیا۔ وہ ہنس کر بولا :

---

[1] کلوپیٹرا کے تین بچے تھے ایک لڑکا سیزر سے پیدا ہوا اور دو جڑواں بچے انٹنی سے پیدا ہوئے۔

"اس بڈھے بدمعاش سے کوئی کہہ دے کہ مجھے مرنے کے اور بھی کئی طریقے آتے ہیں۔ میں دست بدست اس سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آج تمام فوج کو دعوت دو کیونکہ ہمیں کل آخری لڑائی لڑنی ہے۔ افسوس ہے بدنصیب انٹنی تیرے حال پر۔"

جب انٹنی کو اطلاع ملی کہ سیزر اس سے کھلم کھلا لڑنا پسند نہیں کرتا تو اس نے فیصلہ کیا کہ خشکی اور سمندر میں ایک ہی لڑائی ہو جائے۔ چونکہ اسے آنے والی مصیبت پہلے سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس لیے وہ اپنے تمام خدام سے رخصت ہوا۔ لیکن آخری دلیری از سر نو تازہ ہو گئی اور پھر فتح کی امید نظر آنے لگی۔

یکایک فوج میں یہ افواہ پھیل گئی کہ راگ کی آواز ہوا میں اور زمین کے اندر سنائی دیتی ہے۔ سپاہیوں نے اس کے یہ معنی لیے کہ دیوتا ہرکولیز جس کی انٹنی بہت عزت کرتا تھا اور جسے وہ اپنا مورث سمجھتا تھا اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ دوسرے دن وہ علی الصباح اٹھا اور حملے کے لیے تیار ہو گیا۔

بندرگاہ پر اس کی فوجیں موجود تھیں۔ یکایک اسے خبر ملی کہ انوبارلس اپنی تمام جائداد چھوڑ کر رات کے وقت چلا گیا ہے۔ اور سیزر سے جا ملا ہے۔ انوبارلس پر انٹنی کو کلی اعتماد تھا۔ اس کے جانے کا اسے حد سے زیادہ صدمہ ہوا۔ لیکن اس نے ناراضی ظاہر نہ کی۔ انٹنی نے معتمد خاص کو بلایا اور کہا "ابھی جاؤ اور انوبارلس کا تمام خزانہ اس کے پاس بھیج دو۔ خبردار! کوئی چیز باقی نہ رہے۔ میری طرف سے اُسے ایک شوقیہ خط لکھو۔ اور اس میں یہ درج کرو کہ خدا کرے وہ اپنے نئے آقا کو اس طرح نہ چھوڑے جس طرح مجھے چھوڑا ہے۔ میں اس خط پر خود دستخط کر دوں گا۔ میری بدنصیبی نے دیانت دار آدمیوں کو بد دیانت کر دیا ہے۔ لیکن انوبارلس پر بہت افسوس ہے۔

جس وقت انوبارلس کا خزانہ اور اس کے ساتھ انٹنی کے تحائف خچروں پر لدے ہوئے سیزر کے کیمپ میں آئے تو سب کو معلوم ہو گیا کہ آقا حد سے زیادہ فیاض اور شریف تھا۔ اور خادم نہایت بزدل، خود پسند اور نمک حرام۔ اس وقت بے اختیار انوبارس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:

"آہ ! اے انٹنی ! جب تو نے میرے کمینہ پن کا یہ انعام دیا ہے تو میری وفا کا انعام خدا جانے کیا دیتا۔ آہ تیری فیاضی دیکھ کر میرے دل کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ اگر غم انسان کو ہلاک نہیں کر سکتا تو اور بھی کئی طریقے ہیں جن سے جلد جان نکل سکتی ہے، لیکن یقین ہے کہ یہ غم میری جان لیے بغیر نہ رہے گا۔ کیا میں تیرے ساتھ لڑوں؟ اس سے تو بہتر ہے کہ کسی خندق میں گر کر جان دے دوں۔ میرے لیے غلیظ خندق میں مرنا نہایت موزوں ہوگا۔ انوبارلس کی پیش گوئی ٹھیک نکلی۔ سنتریوں نے بیان کیا کہ وہ تمام رات نہیں سویا اور انٹنی کا نام لیتا رہا۔ صبح دیکھا تو وہ مردہ پڑا تھا اور جسم پر کہیں کسی زخم کا نشان نہ تھا۔

لڑائی دو دن تک ہوتی رہی۔ پہلے دن انٹنی کی فوج نے دشمن کی فوج کو پسپا کر دیا، لیکن دوسرے دن کی بحری جنگ میں انٹنی کا تمام جنگی بیڑا اسے چھوڑ کر سیزر کا طرفدار ہو گیا یہ حال دیکھ کر وہ غصہ سے دیوانہ ہو گیا۔

" اب کچھ نہیں رہا۔ ان کمینے مصریوں نے مجھ سے بے وفائی کی اور اس متلوّن مزاج عورت نے جسے اپنی قسموں کا مطلق پاس نہیں۔ اپنے نئے آشنا کے ہاتھ مجھے بیچ ڈالا۔ سب سے کہہ دو کہ بھاگ جائیں۔ اب میرا کام صرف یہ ہے کہ اس سے انتقام لوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملکہ اس سے ملی۔

ملکہ : (انجان بن کر) "کیوں میرے سرتاج ! تم اپنی شیدا سے کیوں ناراض ہو؟" (انٹنی غصے میں بھرا ہوا اس کی طرف لپکا)

انٹنی : "دُور ہو جا۔ ورنہ میں تیری جان لے کر سیزر کی فتح کے جلوس کی رونق گھٹا دوں گا۔ اسے اجازت ہے تجھے اسیر کر کے روما کے لوگوں میں تیری نمائش کرے۔ جا اور اس کی رتھ کے پیچھے پیچھے چل کر آبرو بڑھا۔ او عورت ! تو صنفِ نازک کے لیے باعثِ شرم ہے۔"

ملکہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگی۔

انٹنی : "بہتر ہوا کہ تو چلی گئی۔ اگرچہ تیرا زندہ رہنا بہتر ہے، لیکن بہتر تو یہ ہے کہ تیری موت میرے ہاتھ سے ہوتی۔ کیونکہ ایک موت مر کر ہزاروں موتوں سے بچ جاتی۔ اس چڑیل کو مر جانا چاہیے۔"

(ملکہ اپنی خواصوں میں کھڑی کانپ رہی تھی)

ملکہ : "سہیلیو میری مدد کرو۔ وہ آج اجیکس سے بڑھ کر پاگل ہو رہا ہے۔"

اُس نے اپنی خواص چارلیاں کے مشورے سے اپنے مقبرے میں جو اس نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا تاکہ بعد مرگ اس میں دفن ہو، پناہ لی اور اپنے خدمتگار مارڈین کے ذریعے سے کہلا بھیجا کہ ملکہ نے خودکشی کر لی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ رقت آمیز لہجے میں کہنا کہ وہ تمھیں تو یاد کرتے مری ہے اور آخری وقت تمھارا ہی نام وردِ زبان تھا۔ پھر مجھے آکر بتانا کہ یہ سُن کر اس نے کیا کہا۔

جب مارڈین وہاں پہنچا تو انٹنی کے پاس اراس کھڑا تھا اور انٹنی خودکشی کی تیاری کر رہا تھا۔

انٹنی : "تیری ملکہ بہت نابکار تھی اس نے مجھ سے میری شمشیر چھین لی۔"

مارڈین: "نہیں جناب! وہ آپ پہ مرتی تھی اور شریکِ رنج و راحت تھی۔"

انٹنی : "خاموش ہو جا۔ وہ بے وفا تھی، اور اُسے بے وفاؤں اور دغابازوں کی موت مرنا ہوگا۔"

مارڈین: "انسان ایک بار مرا کرتے ہیں اور وہ مر چکی ہے جو تمھیں کرنا تھا، اس نے خود کر لیا۔ حالتِ نزع میں اس کے الفاظ یہ تھے۔ پیارے انٹنی! شریف انٹنی!"

انٹنی : "اراس! میرے ہاتھ لے لے۔ طویل دن تو ختم ہوا۔ اب ہمیں سونا چاہیے۔ میں ملکہ کو راستے میں جا ملوں گا اور رو کر معافی مانگوں گا۔ ملکہ! میری ملکہ! میں آ رہا ہوں مجھے بھی ساتھ لے لے۔ اراس جس وقت میں نے تجھے آزاد کیا تھا تو تُو نے قسم کھائی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو مجھے ذلت سے بچانے کے لیے میرے حکم سے مجھے قتل کر دیگا اب وقت آزمائش ہے۔ مجھے قتل کر دے۔ کھینچ لے تلوار اور یقین جان کہ تو مجھے قتل نہیں کر رہا بلکہ سیزر کو شکست دے رہا ہے۔"

اراس کو اپنے آقا سے محبت تھی۔ یہ سُن کر اس کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ ہچکچانے لگا۔

انٹنی : "اراس! کیا تجھے یہ پسند ہے کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، گردن جھکی ہوئی ہو اور فتح مند سیزر کی رتھ کے پیچھے پیچھے مجھے بے شرموں کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جائیں

—— ایک وار! —— اور میں ذلت سے بچ جاؤں گا۔ کیا سوچ رہا ہے؟ کھینچ

اراس : " تو پھر اپنا نورانی چہرہ مجھے نہ دکھاؤ اور منہ پھیر لو —— اے میرے پیارے آقا! کپتان اور شہنشاہ الوداع!"

انٹنی : " الوداع! ہاں ضرب لگا —"

وفادار خادم نے آقا کو ضرب لگانے کی بجائے خودکشی کر لی، اور کہا " اس طرح میں اپنے آقا کی موت کا عذاب نہ دیکھوں گا۔"

خادم کی وفاداری کا انٹنی پر حد سے زیادہ اثر ہوا۔ وہ چلّا کر بولا " اے میرے وفادار دوست! تو مجھ سے سرچند شریف تھا۔ تو نے بہادر اراس! مجھے سکھا دیا کہ وہ کام کروں جو نہ کر سکتا تھا۔ میری ملکہ اور تو نے شرافت کی مثال میرے لیے قائم کر دی ہے۔ اراس! تیرا آقا تیرا شاگرد بن کر جان دے رہا ہے۔ میں نے جان دینا تجھ سے سیکھا ہے۔"

یہ کہا اور انٹنی اپنی تلوار پر گر پڑا، مگر زخم جا سے لگا وہ فوراً مہلک ثابت نہ ہوا۔ اس نے اپنے محافظوں کو پکارا اور کہا میرا کام تمام کر دو۔ مگر ان میں سے کسی کو اس کے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے مرتا اور خون میں تر بتر دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئے۔ یکایک ملکہ مصر کا قاصد ڈالو میڈیز وہاں آگیا۔

قاصد : " حضورِ انور! میری ملکہ نے مجھے حضور کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

انٹنی : " کب بھیجا ہے؟"

قاصد : " ابھی "

انٹنی : " وہ کہاں ہے؟"

قاصد : " اپنے مقبرہ میں دروازہ بند کیے بیٹھی ہے، اُسے وہم تھا، مصیبت آنے والی ہے جب آپ نے اس پر ناواجب طور پر شک کیا کہ وہ سیزر سے مل گئی ہے تو اُسے بہت صدمہ ہوا اور آپ کا غصہ فرو کرنے کے لیے اس نے یہ بہانہ بنایا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا ایسا نہ ہو آپ شدتِ غم میں کچھ اور کر بیٹھیں۔ مجھے اصلیت بتانے کو بھیجا ہے لیکن افسوس! میں دیر سے آیا ہوں۔"

انٹنی : "ہاں تم دیر سے آئے ہو۔ میرے خدام سے کہو کہ وہ مجھے وہاں لے چلیں جہاں میری ملکہ ہے۔ بس یہ میری آخری خدمت ہے۔"

انٹنی کے خدام جن کے آنسو جاری تھے اُسے اٹھا کر لے گئے۔ راہ میں انھیں رُکا دیکھ کر انٹنی نے کہا :

انٹنی : "میرے نمک حلال دوستو! غصّے اور انتقام کے دانت تیز نہ کرو۔ سزا کو خوشی خوشی برداشت کرنا چاہیے اور یہی طریقہ ہے جس سے ہم سیزر کو سزا دے سکتے ہیں۔"

جب انٹنی کو خدمتگار اٹھا لائے اور اسے مقبرے کے باہر رکھ دیا تو ملکہ نے جو کوٹھے پر کھڑی تھی اسے دیکھ لیا اور سسکیاں لے کر کہا : "کسی طرح اُسے اوپر کھینچ لو"۔ وہ سیزر کے خوف سے مقبرے کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرتی تھی۔

ملکہ : "آہ انٹنی! میرے انٹنی!"

انٹنی : "ملکہ! میں مر رہا ہوں۔ اب ایک ہی تمنا ہے کہ موت صرف اتنی مہلت دے کہ ایک بار تیرے ہونٹ چوم لوں۔"

ملکہ : "میں سیزر کی فتح کے لیے باعثِ زینت نہ بنوں گی۔ اگر چھریاں، زہر، سانپ کسی کام آ سکتے ہیں تو میں مامون ہوں۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔ وہاں جان دوں گی جہاں تو رہا کرتا تھا۔ اگر بوسوں میں کسی کو زندہ کرنے کی طاقت ہوتی تو میں سو سال بوسے کیا کرتی۔"

انٹنی : "ملکہ میری آخری التجا یہ ہے کہ سیزر کے ہاتھ سے اپنی جان اور عزت بچانا۔ اس پر اعتبار نہ کرنا۔"

ملکہ : "عزت اور بچاؤ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ میں اب اپنے ارادے اور ہاتھوں پر اعتبار کروں گی۔ سیزر کا نام نہ لو۔"

انٹنی : "میری موجودہ حالت پر غم نہ کھاؤ۔ وہ زمانہ یاد کرو جب مجھ سے بڑا کوئی اور شہزادہ نہ تھا۔ میں مرتا ہوں لیکن کمینوں کی طرح نہیں۔ سیزر کی شجاعت نے انٹنی کو مغلوب نہیں کیا، بلکہ خود انٹنی نے اپنے آپ کو مغلوب کیا ہے۔ اب میرا دم رک رہا ہے اور

میں چلا۔"

انٹنی مر گیا تو ملکہ نے حد سے زیادہ واویلا اور گریہ وزاری کی اور بے ہوش ہو کر اس کی نعش کے قریب گر پڑی۔ پھر جب ہوش آیا تو اپنی خواصوں سے کہا۔ "اب جو مصیبت سر پر آئی ہے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔"

ملکہ : "موت کی بھڑکتی آگ میں پیشتر اس کے کہ وہ ہم تک آنے کی جرأت کرے، دوڑ کر جانا گناہ ہے۔ اہل رومہ کے طریقے پر ہمیں وہ کرنا ہے جو شریفوں اور بہادروں کا کام ہے تاکہ موت کو ہم تک آتے ہوئے غرور اور ناز ہو۔ اب ہمارا منتہائے نظر صرف پختہ ارادہ اور اس کی جلد تکمیل ہے۔"

جب انٹنی کے مرنے کی خبر سیزر کو پہنچی تو وہ بھی رو پڑا۔ انٹنی کی موت اس کے لیے ایک پرانے رفیق کی موت تھی۔ ابھی وہ اظہارِ غم کر ہی رہا تھا کہ ملکہ مصر کا قاصد یہ پوچھنے آیا تمہارا کیا ارادہ ہے؟

سیزر: "ملکہ سے کہہ دو کہ حوصلہ کرے۔ ہمارا ارادہ جو عزت و احترام سے خالی نہیں اُسے عنقریب معلوم ہو جائے گا۔"

مصری قاصد چلا گیا تو سیزر کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں ملکہ بھی اپنے آپ کو ضائع کر کے اس کے جلوس کی رونق خراب نہ کر دے۔ اس لیے اس نے فوراً ہرکولیس کو ملکہ کے پاس بھیج کر کہلایا کہ کسی قسم کا فکر نہ کرو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہرکولیس نے بڑی چالبازی سے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔ پہلے ملکہ کے مقبرے کے باہر کھڑے ہو کر باتیں کیں اور پھر مینار پر سیڑھی لگا کر چڑھ گیا۔ جب ملکہ نے دیکھا کہ وہ گرفتار ہو گئی ہے تو خودکشی کے ارادے سے خنجر نکالا۔ لیکن ہرکولیس نے خنجر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا "تمہاری عزت میں فرق نہ آئے گا۔"

ملکہ : "سیزر سے کہہ دو کہ جو کچھ ہو سکے بے شک کرے۔ میں یہ فانی جسم تباہ کر لوں گی، کھانا، پینا اور سونا چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے آقا کے دربار میں بے دست و پا ہو کر نہیں رہوں گی۔ نہ کاہل اکٹیویا کے طعنے سنوں گی۔ زنجیروں میں لٹکنے سے پہلے مصر

کی خندق میں مرنا بہتر ہے۔"

ہرکولیس کے سپرد مقبرے کا پہرہ تھا کہ کہیں ملکہ فرار نہ ہو جائے۔

ملکہ کی ایک خواص ڈولا بیلا کو اس کی بے کسی پر رحم آیا اور اس نے ملکہ کو آگاہ کر دیا کہ ہر چند سیزر وعدے وعید کر رہا ہے۔ لیکن اس کا پختہ ارادہ ہے کہ تمھیں اپنے جلوس میں لے جائے اور روم میں داخلے کے وقت تمھاری نمائش ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد سیزر بنفس نفیس وہاں آیا اور ملکہ کو سمجھانے لگا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تم میرا کہنا مانو گی تو میں تمھارے بچوں کو قتل کرا دوں گا۔ لیکن وہ اس کے دھوکے میں نہ آئی۔ اُسے ڈولا بیلا نے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی خواصوں کی طرف مخاطب ہو کر بولی :

"سہیلیو! وہ مجھے چکمے دے رہا ہے کہ کہیں میں بھی جان پر نہ کھیل جاؤں"

تھوڑی دیر کے بعد ڈولا بیلا نے آکر کہا "سیزر تین دن کے اندر اندر تمھیں اور تمھارے بچّوں کو قید کرکے روم بھیج دے گا۔"

اور جب وہ چلا گیا تو ملکہ نے اراس سے کہا "ہمارا تاج اور شاہی پوشاک لاؤ۔" تعمیل حکم کے لیے گئی اور ایک کسان ملکہ کے لیے انجیروں کی ٹوکری لایا۔ محافظ نے اُسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ انجیروں کے پیچھے زہریلے سانپ تھے۔ وہ سانپ جن کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہوتا۔ یہ تجویز ملکہ نے محافظوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کو کی تھی۔ کسان ٹوکری دے کر چلا گیا اور اراس پوشاک لے آئی۔

ملکہ : "تاج میرے سر پر رکھو اور مجھے شاہی لباس پہناؤ تاکہ میں اسی لباس میں اُس سے ملوں جو میں نے جبل طارق کی ملاقات میں زیبِ تن کیا تھا۔ وہ دیکھو میرا پیارا کھڑا مجھے بلا رہا ہے۔ میری بہادری کی تعریف کر رہا ہے اور سیزر کے منصوبوں پر ہنس رہا ہے۔ خاوند! میں آئی۔"

پھر وہ اپنی خواصوں چارمین اور اراس سے بغل گیر ہوئی اور ان کے منہ چوم کر کہا :

"الوداع! اراس کو ملکہ سے بے حد محبت تھی۔ یکایک اسے ایسا صدمہ ہوا کہ وہ کھڑے کھڑے گر کر مر گئی۔ ملکہ نے فوراً ایک سانپ اپنے سینے پر رکھ لیا اور دوسرا زیر بغل

اِدھر انھوں نے ملکہ کو ڈسا اُدھر اس نے معاً جان دے دی۔ اور بے جان ہو کر چارپائی پر گر پڑی۔

چارمین نے کہا "او موت! اب جس قدر غرور ہو سکتا ہے کرلے۔ کیونکہ اس وقت تیرے قبضے میں ایک بے نظیر بیگم ہے۔ دو خوبصورت رسیلی آنکھیں بند کردے تاکہ ان شاہانہ آنکھوں کو پھر سورج دکھائی نہ دے"۔

یکایک ایک سنتری جو خبر دینے آیا تھا کہ جناب سیزر آرہے ہیں، دوڑا ہوا آیا، اور پوچھنے لگا، ملکہ کہاں ہے؟

چارمین نے کہا "تم اور وہ دیر سے آئے"۔ پھر اس نے بھی سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوالیا۔

سنتری: "یہ کیا کارستانی ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

چارمین: "وہی ہو رہا ہے، جو ایک اعلیٰ خاندان کی خاتون کو کرنا چاہیے۔ عالی نسب لوگ بڑوں کے نام کو بٹہ نہیں لگایا کرتے"۔

یہ کہہ کر چارمین بھی مردۂ صد سالہ سے بدتر ہو گئی۔ اتنے میں سیزر اور ڈولا بیلا بھی آگئے۔

ڈولا: "حضور! آپ کوئی پیغمبر ہیں۔ وہی ہوا جو آپ فرماتے تھے"۔

سیزر: "کہیں سے ہمارے ارادے کی بھنک اس کے کان میں پڑ گئی ہوگی۔ یا اس نے قیاس دوڑایا ہوگا۔ وہ آخری دم تک بہادر رہی۔ اور شہزادیوں کی طرح جان دی۔ انھیں یہاں سے لے چلو۔ ملکہ کو انٹنی کی قبر میں دفن کیا جائیگا۔ دنیا کے کسی مزار میں اس طرح کے عاشق و معشوق نہ ہوں گے۔ جنازہ فوجی احترام سے اٹھایا جائے اور پھر روما کی طرف کوچ ہو"۔

جو زیست کو نہ سمجھیں، جو موت کو نہ جانیں
جینا انھیں کا جینا، مرنا انھیں کا مرنا

زلیخا کی داستانِ محبّت

جونہی حضرت یوسفؑ سامنے آئے تمام عورتیں ان کا حسن وجمال دیکھ کر دنگ رہ گئیں، وہ گم سم سی بیٹھی رہیں۔ بیخودی کے عالم میں چھریوں سے پھل کاٹنے کی بجائے اپنے ہاتھ زخمی کرلیے۔ تب زلیخا بولی یہی ہے وہ غلام جس کی محبت کا تم مجھے طعنہ دیتی ہو۔ اب بتاؤ اسے دیکھ کر تمھارا کیا حال ہوا۔ کیا میرا عشق بیجا نہیں؟

داستان کی اہمیت

حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کی داستان دنیا بھر میں مشہور ہے دنیا کی تین بڑی مذہبی جماعتوں عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کی مقدس کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ قرآن نے سورۂ یوسف میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور حضرت یوسف کی داستان کو احسن القصص (سب سے اچھا قصہ) کہا ہے۔ چونکہ اس داستان میں حسن وعشق کی چاشنی موجود ہے اس لیے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اس پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ مگر مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے جوہر دکھانے کی کوشش میں بعض مبالغہ آمیز باتیں بھی اصل واقعات میں شامل ہو گئی ہیں۔

اس خیال سے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر کی زندگی کے اس اہم پہلو کو سمجھنے میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو، ہم قرآن، تورات اور مستند تفسیروں پر بھروسہ کرتے ہوئے انھیں کی روشنی میں اس واقعہ کی تفصیلات پیش کریں گے۔

یوسفی جلال وجمال

حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے فرزند تھے، جو سنِ رشد کو پہنچ کر جلیل القدر پیغمبر کے منصب پر فائز ہوئے۔ بے حد حسین وجمیل تھے۔ ان کا حُسن آج تک بطور مثال چلا آتا ہے۔ دماغی اور فطری استعداد اور اخلاقی پاکیزگی کے لحاظ سے اپنے دوسرے گیارہ بھائیوں میں نمایاں اور ممتاز تھے، یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوبؑ انھیں تمام بیٹوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ بچپن میں ہمیشہ انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور تھوڑی دیر

کی جدائی بھی برداشت نہ کرسکتے تھے۔

یوسفؑ کنوئیں میں والد کی نظروں میں زیادہ مقبول ہونے کے باعث حضرت یوسف کے بھائی ان سے حسد کرنے لگے۔ چنانچہ ایک دن کھیلنے کے بہانے انھیں دُور جنگل میں لے گئے اور ایک اندھے کنوئیں میں گرادیا۔ پھر واپس آکر بہانہ بنایا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کو اس سے اتنا صدمہ پہنچا کہ انھوں نے رو رو کر اپنی بینائی کھو دی جانتے تھے کہ بھائیوں نے کوئی سازش کی ہے مگر اب کچھ نہ کرسکتے تھے۔ صبر جمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

یوسف مصر میں اتفاق سے ایک تجارتی قافلہ اس کنوئیں کے پاس سے گزرا۔ ان کے ایک آدمی نے پانی کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف اس ڈول میں بیٹھ گئے۔ جب اس نے ڈول نکالا، اس میں ایک خوبصورت نوجوان کو بیٹھا پایا تو خوشی سے چلا اٹھا کہ "مبارک ہو، یہ تو لڑکا ہے"۔ چنانچہ قافلے والے حضرت یوسفؑ کو چھپا کر اپنے ہمراہ مصر لے گئے [1]

اس زمانہ میں غلامی کا رواج عام تھا اور ہر جگہ غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی مصر میں بھی غلاموں کی منڈی لگتی تھی۔ قافلے والوں نے یوسفؑ کو بھی منڈی میں لے جاکر فروخت کردیا۔ فوطی فار [2] نام ایک شاہی سردار حضرت یوسفؑ کو خرید کر گھر لے گیا۔ فوطی فار

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف کنوئیں سے نکل آئے تو خود بھائی ان کے دعویدار بن گئے اور بیس روپوں میں انھیں قافلے والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ انھیں اپنے ساتھ مصر لے گئے۔

[2] قرآن مجید میں نام مذکور نہیں بلکہ اسے "عزیز" کہا گیا ہے اور تورات نے اس کا نام فوطی فار بتایا ہے اس زمانہ میں مصر پر جو لوگ حکمران تھے انھیں عمالقہ کہا جاتا ہے، مصری تاریخ میں ان کا نام ہیکسوس ہے۔ یہ دراصل عرب سے وہاں پہنچے تھے اور عرب عاربہ کی ایک شاخ تھے۔ قوت کے بل پر مصر کے حاکم بن گئے۔ حضرت ابراہیم بھی انھیں حکمرانوں کے عہد میں مصر گئے تھے۔ فوطی فار بھی غالباً خاندانِ عمالقہ میں سے تھا اور شاہی جلو داروں کا سردار تھا۔ اور حضرت یوسف سے اُسے نسبت قومیت کا خصوصی تعلق تھا۔

بڑا ذہین آدمی تھا اس نے حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال کے علاوہ ان کی دانش و بصیرت اور اعلیٰ سیرت کا پورا پورا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ گھر لے جا کر اپنی بیوی سے کہا کہ اسے بڑی عزت سے رکھنا، ممکن ہے یہ ہمارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہو اور ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں۔

یوسفؑ زلیخا کے گھر میں

فوطی فار کی بیوی ہی وہ عورت ہے جو تاریخ میں زلیخا کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن میں زلیخا نام نہیں بلکہ اسے صرف "عزیز کی بیوی" کہا گیا ہے مؤرخین اس کا نام زلیخا بتاتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ اپنے آقا کے کاموں کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد بصیرت اور بے مثال و بے داغ سیرت کی بنا پر اجنبی سرزمین میں اعلیٰ درجہ کے متمدن گھرانے کا انتظام ایسے طریق پر کیا کہ فوطی فار کی نظروں میں بہت زیادہ مقبول ہو گئے اور وہ ہر معاملے میں ان پہ کامل اعتماد کرنے لگا۔ حضرت یوسفؑ کو گھر کا مختار بنا دیا گیا۔

زلیخا کی بے قراری

چھ سال عزیز مصر کے ہاں رہے۔ جوانی کا عالم تھا اور حسن و جمال کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان میں موجود نہ ہو۔ جمال و رعنائی کا پیکرِ مجسم، رُخ روشن شمس و قمر کی طرح منور، عصمت و حیا کی فراوانی سونے پر سہاگہ، پھر ہر وقت کا ساتھ۔ عزیز مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پا سکی، پروانہ وار آپ پر نثار ہونے لگی، لیکن حضرت یوسفؑ کی عصمت مآب زندگی میں ایسے فعل پر ملتفت ہونے کا کیا امکان ہو سکتا تھا جو امانت اور حفظ حقوق کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے آئے تھے اور یہی ان کے پیغمبرانہ منصب کا تقاضا تھا۔ وہ ایسی کسی حرکت پر کیونکر مائل ہو سکتے تھے جو ان کی شانِ عظمت کے سراسر منافی تھی، ان سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہوں اور عزیز مصر کی بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کریں۔

کٹھن گھڑی

عزیز مصر کی بیوی نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن حضرت یوسفؑ نے کوئی التفات ظاہر نہ کیا تو آخر ایک روز مجبور اور بے قابو ہو کر

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اصرار کرنے لگی۔

حضرت یوسفؑ کے لیے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلۂ حسن سے لالہ رو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائش حسن و زینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، اِدھر یوسفؑ خود نوجوان، حسین اور حُسن کی خوبی سے آشنا دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام ساز گار حالات نے کیا یوسفؑ کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی عزیزِ مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی؟ کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی؟ کیا نفس نے جہانِ قلب کو ایک سکنڈ کے لیے بھی متزلزل کیا؟ —— نہیں، ہر گز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس پیکرِ عصمت' امینِ نبوّت' مہبطِ وحی الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے مصری عورت کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہِ راست آغوش الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا "یہ ناممکن ہے۔ پناہ بخدا! میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت "اللّٰہ" ہے، اور وہ تمام کائنات کا مالک' اور کیا میں اپنے مربّی " عزیزِ مصر" کی امانت میں خیانت کروں جس نے مجھ کو غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت و عزّت عطا کی' اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا۔ اور ظالموں کے لیے انجام و مآل کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے"[1]

زلیخا کا اتہام مگر عزیزِ مصر کی بیوی اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادے کو عملی شکل دینے پر مُصر رہی، حضرت یوسف کی نصیحت کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا، یہ نہایت کٹھن گھڑی تھی ناچار حضرت یوسفؑ بھاگنے کے خیال سے دروازہ کی طرف لپکے تاکہ باہر نکل جائیں، عزیزِ مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا اور قمیص سے پکڑ کر کھینچا۔ قمیص پھٹ گئی۔ عین اسی وقت عزیزِ مصر دروازہ کے باہر آپہنچا۔ اُسے دیکھتے ہی بیوی نے اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے مکر و فریب سے کام لیا اور اپنے شوہر کو سنانے کے لیے چلّا اٹھی، کہ جو شخص تیری اہل خانہ کے ساتھ بُری بات کا ارادہ کرے اس کی سزا قید یا دردناک عذاب کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔

---

[1] قصص القرآن جلد اوّل

حضرت یوسفؑ نے اس کے جواب میں صرف یہ کہا کہ خود اسی نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایسا خیال بھی نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی میری طرف سے کوئی نازیبا حرکت ہوئی۔

عزیزِ مصر یہ معاملہ دیکھ کر چکرا گیا۔ وہ حضرت یوسف کے متعلق یہ گمان ہی نہ کر سکتا تھا کہ انھوں نے ایسا کیا ہو۔ تاہم مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

فیصلہ عزیز کی بیوی کا چچا زاد بھائی بڑا دانا اور ہوشیار تھا اس نے فوراً یہ تجویز پیش کر دی کہ یوسف کی قمیص دیکھنی چاہیے، اگر آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور اگر وہ پیچھے سے چاک ہے تو یوسف سچا ہے اور عورت جھوٹی۔ قمیص دیکھی گئی تو وہ پیچھے سے پھٹی تھی۔

عزیز کو ویسے بھی اپنی بیوی کی خطاکاری کا احساس ہو چکا تھا، اب قمیص کو پیچھے سے پھٹا دیکھ کر اُسے کامل یقین ہو گیا کہ یوسف سچ کہہ رہے ہیں، لیکن اپنی عزت اور ناموس کی خاطر معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا، یوسف تم ہی سچے ہو اور اس عورت کے معاملے سے درگزر کرو اور اسے یہیں ختم کر دو۔ پھر بیوی سے مخاطب ہو کر بولا بیشک تو ہی گنہگار ہے اور سب تیرا ہی مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی اس حرکت کے لیے استغفار کر اور معافی مانگ۔

تشہیرِ عشق اس وقت عزیزِ مصر نے اپنی رسوائی کے ڈر سے معاملہ کو یوں ختم کر دیا مگر بات چھپی نہ رہی اور رفتہ رفتہ شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ تمام عورتیں عزیزِ مصر کی بیوی کو مطعون کرنے لگیں، شاہی خاندان کی عورتوں نے طعنے دینے شروع کیے کہ عزیزِ مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اونچے درجے کی خاتون ہو کر ادنیٰ غلام پر ریجھ گئی اور اسے اپنے قبضہ میں بھی نہ لا سکی۔

عزیزِ مصر کی بیوی کو یہ طعنے سخت شاق گزرتے اور دل میں فیصلہ کیا کہ اس کا بدلہ لیا جائے۔ سوچا کہ جس بات کا وہ مجھے طعنہ دیتی ہیں اُسی میں اُن کو بھی مبتلا کیا جائے۔

حُسنِ یوسف کی جھلک اس مقصد کے لیے اس نے شاہی خاندان اور عمائدینِ شہر کی عورتوں کو

مدعو کیا۔ جب سب دستر خوان پر بیٹھ گئیں اور کھانا کھانے کے لیے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ گوشت اور پھل کو کاٹ سکیں تو اس وقت حضرت یوسفؑ سے کہا کہ وہ باہر آئیں۔ وہ باہر آئے تو تمام عورتیں ان کا حسن و جمال دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ وہ حضرت یوسف کے رُخِ انور کی تجلّی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے حیرانی اور بیخودی کے عالم میں اپنے ہاتھ زخمی کر لیے۔ پھر بے اختیار پکار اٹھیں۔ یہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے، یہ تو نور کا پتلا ہے۔

اب عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنی کامیابی اور ان عورتوں کی شکست پر خوش ہو کر فخر سے کہا یہی ہے وہ غلام جس کے عشق و محبت کے متعلق تم نے مجھے مطعون کر رکھا ہے اور تیرِ ملامت کا نشانہ بنایا ہے۔ اب اسے دیکھ کر خود تم پر کیا گزری؟ تم ہی بتاؤ میرا یہ عشق بے جا ہے یا بجا۔ اور تمھاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟ بے شک میں نے اسے قابو میں لانا چاہا لیکن اس نے عصمت و پاکدامنی کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اب میں صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہنا نہ مانا تو میں اسے قید میں ڈلواؤں گی اور بے عزت کروں گی۔

حضرت یوسف ابھی تک عزیزِ مصر ہی کے گھر پر رہتے تھے اور اس کی بیوی برابر انھیں اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ حضرت یوسف نے اپنے بارے میں عزیز کی بیوی اور بعض دوسری عورتوں کی کوششیں جاری دیکھیں تو خدا سے دعا کی کہ اے اللہ جس کام کے لیے یہ عورتیں مجھے ورغلاتی ہیں، مجھے اس سے محفوظ رکھ بلکہ اس کی بجائے مجھے قید خانے کی زندگی قبول ہے۔

یوسف قید میں چونکہ عزیزِ مصر پر حضرت یوسف کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بڑے دیانت دار اور بلند کردار انسان ہیں، اس لیے وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ انھیں کسی قسم کا گزند پہنچائے، مگر اس کی بیوی پر عشق کا بھوت اسی طرح سوار رہا۔ بلکہ اس کی حالت اور زیادہ خراب ہو رہی تھی وہ حضرت یوسف کے لیے بری طرح مضطرب ہو گئی۔ پہلے اس نے خوشامد، چاپلوسی اور مکر و حیلہ سے مطلب براری کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوئی تو اب دھمکیاں دینے لگی، چنانچہ اُن سے کہا کہ میں تمھیں قید کرا دوں گی

مگر حضرت یوسف کے استحکام کو ان دھمکیوں کے باوجود حرکت نہ ہوئی اور عزیز مصر نے دیکھا کہ اس کی بدنامی بڑھتی جارہی ہے تو یہی مناسب خیال کیا کہ کچھ مدت کے لیے حضرت یوسف کو قید میں ڈال دے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے اور چرچے بند ہو جائیں۔ حضرت یوسفؑ کو قید کر دیا گیا۔

حضرت یوسف کی اخلاقی عظمت اور شانِ تقدس و رہنمائی قید خانے میں بھی سورج کی طرح چمکتی رہی۔ قید خانے کا داروغہ ان کا عقیدت کیش بن گیا اور اس نے قیدیوں کا انتظام و انصرام حضرت یوسف ہی کے سپرد کر دیا۔

اتفاق سے حضرت یوسف کے ساتھ دو اور قیدی تھے جن میں سے ایک شاہی ساقی تھا دوسرا شاہی باورچی خانے کا داروغہ۔ ان دونوں نے اپنے اپنے خواب حضرت یوسف سے بیان کیے اور تعبیر پوچھی۔ حضرت یوسف نے انھیں جو تعبیر بتائی تھی وہ صحیح نکلی۔ انھیں دنوں فرعونِ مصر نے بھی ایک خواب دیکھا، مگر کوئی معبر اس کی صحیح تعبیر نہ بتا سکا۔ ساقی جسے حضرت یوسف نے اس کے خواب کی تعبیر بتائی تھی۔ بادشاہ کے پاس گیا اور بتایا کہ اس خواب کی تعبیر حضرت یوسف سے پوچھی جائے۔ چنانچہ حضرت یوسف سے تعبیر پوچھی گئی انھوں نے جو تعبیر بتائی وہ صحیح نکلی۔ اسی تعبیر کے سلسلے میں فرعون نے انھیں دربار میں طلب کیا۔

زلیخا کی پشیمانی اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ ان عورتوں کے معاملے کی چھان بین کی جائے جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے۔

بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر حقیقتِ حال دریافت کی۔ سب نے یکزبان ہو کر کہا کہ ہم نے یوسفؑ میں کوئی برائی نہیں پائی۔

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی، وہ بھی بے اختیار بول اٹھی کہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے۔ وہ اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔

غرض ان تمام عورتوں کے بیانات سے جب فرعون کو اصل حال کی خبر ہو گئی تو اس کے دل پر حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت و جلالت، ان کی پاک بازی اور دیانت کا سکہ بیٹھ گیا۔

یوسف مصر کے حاکم بن گئے۔ حضرت یوسفؑ دربار میں آئے۔ بادشاہ کے ساتھ بات چیت ہوئی تو وہ آپ کی عقل و دانش اور حکمت و فطانت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بادشاہ نے انھیں تمام ملک کا امین وکفیل بنا دیا اور شاہی خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اور انھیں مختارِ عام کر دیا۔

جب مصر اور اس پاس کے علاقوں میں قحط پڑا تو یوسف کے بھائی غلہ لینے کے لیے کنعان سے مصر میں آئے۔ جب حضرت یوسف کے دربار میں پہنچے تو انھوں نے بھائیوں کو پہچان لیا مگر وہ حضرت یوسف کو نہ پہچان سکے۔ بن یمین حضرت یوسف کا سگا اور چھوٹا بھائی تھا، وہ ان کے ساتھ نہ آیا تھا۔ حضرت یوسف نے اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا اور جب وہ غلہ لے کر جانے لگے تو ان سے کہا کہ جب دوبارہ غلہ لینے آئیں تو اپنے چھوٹے بھائی (بن یمین) کو بھی ساتھ لائیں ورنہ غلہ نہ ملے گا۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ آئے تو بن یمین کو ساتھ لائے۔

اس دفعہ پھر وہ حضرت یوسف کو نہ پہچان سکے۔ حضرت یوسف نے بن یمین کو علیحدہ کر کے بتا دیا کہ میں یوسف ہوں، پھر ایک عجیب و غریب تدبیر سے[1] اُسے اپنے پاس رکھ لیا، اور بھائیوں کو غلہ دے کر رخصت کر دیا۔

جب تیسری مرتبہ بھائی غلہ لینے آئے تو حضرت یوسف نے اپنا آپ ان پر ظاہر کر دیا۔ اور بتایا کہ جس بھائی کو وہ کنوئیں میں پھینک کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مر چکا ہوگا، وہ آج ملکِ مصر کا مختار ہے۔ بھائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حضرت یوسف نے انھیں معاف کر دیا اور ہدایت کی کہ میری یہ قمیص لے جا کر والد کی آنکھوں پر ڈال دو۔ خدا نے چاہا تو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، پھر پورے خاندان کو میرے پاس مصر میں لے آؤ۔

بھائی چلے گئے۔ ابھی وہ کنعان میں پہنچے نہ تھے کہ گھر میں حضرت یعقوب کہنے لگے "مجھے

---

[1] حضرت یوسف نے بن یمین کو اپنے پاس رکھنے کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ بھائیوں پر پیالہ چوری کرنے کا الزام لگایا اور سزا کے طور پر ان کے بھائی (بن یمین) کو پاس رکھ لیا اور بھائیوں کو چھوڑ دیا۔ طوالت کے خوف سے اس واقعہ کی ساری تفصیل بیان کرنے سے یہاں گریز کیا جاتا ہے۔

یوسف کی بُو آ رہی ہے "۔ گھر والوں نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی ۔ اس لیے کہ وہ حضرت یوسف کو مُردہ سمجھ چکے تھے ۔ مگر حضرت یعقوب غلط نہ کہتے تھے ۔ تھوڑے ہی دنوں بعد برادران یوسف کنعان پہنچ گئے اور سارا قصہ بیان کر دیا پھر حضرت یوسف کی قمیص حضرت یعقوب کی آنکھوں پر رکھ دی اور وہ بینا ہو گئے ۔

حضرت یوسف کی آخری زندگی

اب حضرت یعقوبؑ اپنے سارے خاندان سمیت مصر آ گئے ۔ یہ خاندان ستر افراد پر مشتمل تھا ۔ حضرت یوسف نے ان کے آنے پر شاہی دربار منعقد کیا ۔ والدین کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور خاندان کے دوسرے افراد کو ان کے مراتب کے لحاظ سے بٹھایا ۔ اور حکومت کے دستور کے مطابق وہ سب تخت کے سامنے تعظیم کے لیے جھک گئے ۔ حضرت یوسف کے تمام بھائی بھی تعظیم کے لیے جھکے ۔ یہ تمام خاندان پھر مصر ہی میں آباد ہو گیا ۔ حضرت یوسف نے انھیں اچھی اچھی زمینیں دیں ۔

ایک سو دس برس کی عمر میں حضرت یوسف نے وفات پائی ۔

یزید اور عمارہ

دس ہزار اشرفیوں میں سودا ہوا۔ یزید کے لیے عمارہ خرید لی گئی اور مدینہ سے دمشق
لے جائی گئی مگر دو محبت بھرے دلوں میں جدائی ڈالنے والے سے قدرت انتقام
لے چکی تھی۔ عمارہ کو ہاتھ لگانے سے قبل یزید اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

ساغرِ طرب سنسان اور ویران رات تھی، ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی مدینہ کے گلی کوچوں میں ہو کا عالم تھا اگرچہ رات زیادہ نہ گزری تھی مگر سردی کی شدت کے باعث لوگ گھروں کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ شہر کے مشرقی جانب ایک بلند ٹیلے پر نہایت خوبصورت اور عالیشان مکان اپنے مسکینوں کی شان امارت کی نشاندہی کر رہا تھا۔ مکان کے باہر ایک پنڈال میں پندرہ بیس اونٹ بندھے تھے۔ بھیانک اور پرسکون تاریکی میں کبھی کبھی ان اونٹوں کی آواز ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھی۔ مکان کے اندر سے گانے کی نہایت شیریں اور رس بھری آواز آ رہی تھی۔ یہ عبداللہ بن جعفر کا مکان تھا جو مدینہ کا ایک دولت مند، بااثر اور معزز شخص تھا۔ اور اس وقت اپنی کنیز سے گانا سن رہا تھا۔ اس کنیز کا نام عمارہ تھا جو حسن و جمال میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ مدینہ بھر میں اس کی شہرت تھی۔ اور لوگ عبداللہ کو خوش قسمت انسان خیال کرتے تھے کہ ایسی خوبرو کنیز اس کے پاس تھی۔ عمارہ جہاں حسن کے لحاظ سے بے مثال تھی وہاں گانے میں بھی اپنا نظیر نہ رکھتی تھی وہ حد درجہ خوش گلو اور خوش آواز تھی۔ جب وہ ساز اور دف کے ساتھ گانا سناتی اور ناچتی تو سننے اور دیکھنے والوں کے اوسان خطا ہو جاتے۔ انھیں محاسن کے طفیل عبداللہ کو عمارہ سے بے حد محبت تھی اور وہ عمارہ کے ساتھ کنیزوں کا سا برتاؤ کرنے کے بجائے اُسے ملکہ کی طرح رکھتا، اچھے سے اچھا کھلاتا، بہترین پوشاک دیتا اور ہر طرح سے اس کی خبر گیری کرتا۔

عمارہ بھی اپنے محسن کو بہت چاہتی تھی۔ وہ دل و جان سے اس کی قدر کرتی تھی۔ اس کے ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جاتی تھی۔ جس طرح عبداللہ عمارہ کی جدائی

کی تاب نہ لاسکتا تھا اسی طرح عمارہ بھی عبداللہ کے بغیر نہ رہ سکتی تھی گویا ایک لحاظ سے دونوں عاشق اور محبوب کے درجہ تک پہنچ چکے تھے۔

دخلِ رقیب ان دنوں امیر معاویہ تختِ خلافت پر متمکن تھے۔ عبداللہ اور امیر معاویہ میں باہم گہرے تعلقات تھے اور عبداللہ اکثر ان سے ملنے کے لیے دمشق جایا کرتا تھا۔ ۵۵ھ کا واقعہ ہے، ایک مرتبہ عبداللہ دمشق گیا اور امیر معاویہ کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ عمارہ بھی ساتھ تھی۔ معاویہ نے انھیں ٹھہرنے کے لیے محل کے قریب ایک مکان دے دیا اور وہ مہمان کے طور پر وہاں رہنے لگے۔

اس قیام کے دوران معاویہ اکثر اپنے مہمان کے پاس آتے رہتے تھے، کبھی کبھی عبداللہ بھی معاویہ کے محل پر چلا جایا کرتا تھا۔ یہ یزید کے جوانی کے دن تھے اور ان دنوں معاویہ اُسے اپنے بعد خلافت کے لیے نامزد کر چکے تھے۔ یزید بھی اپنے والد کے دوست اور معزز مہمان کے ساتھ بہت گھل مل چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی کبھی کبھی عبداللہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ اُس نے عمارہ کے حُسن کی تعریف سُن رکھی تھی چنانچہ عبداللہ کے مکان پر یزید نے اُسے دیکھا تو پہلی نظر میں ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور عمارہ کی وجہ سے عبداللہ کے ہاں اس کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ ساتھ ہی عمارہ کو حاصل کرنے کے لیے اس کی بے تابی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

یزید کا چال چلن یزید کی بدبختی، بدنصیبی اور شقاوت و ضلالت کی داستان سے کون واقف نہیں۔ اس بدبخت ازلی نے جس بے حیائی اور بے دردی کے ساتھ خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ کو اپنی تیغ ہوس کا نشانہ بنایا اور اہلبیت کے بچوں اور عورتوں کو جن مصائب میں مبتلا کیا وہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا المناک باب ہے جس پر اسلامی دنیا ہمیشہ نوحہ کناں رہے گی۔ اپنی مطلب برآری کے لیے نہ اس نے دین و مذہب اور شرافت و آدمیت کو کبھی ملحوظ رکھا اور نہ ہی انسانیت کے دوسرے تقاضوں کو کوئی اہمیت دی۔ وہ فطری طور پر بڑا حیلہ باز، مکار، ظالم اور ہوا پرور شخص تھا۔ اس کی ہوس پرستیوں، خود غرضیوں اور مکاریوں کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ نفسانی خواہشات اور جنسی ہوس پرستیوں کے سلسلہ میں بھی اس کا کیریکٹر کم داغدار نہیں۔ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں وہ اپنی نظیر آپ تھا، تاریخ کے

علاوہ عربی ادب کی بہت سی کتابوں میں اُس کی جنسی سرگرمیوں اور بدکاریوں کے نہایت قبیح واقعات ملتے ہیں۔ عمارہ کے متعلق یزید کی جو رومانی داستان یہاں بیان کی جارہی ہے۔ یہ اس بدطینت انسان کی ہوس پرستی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ ہم نے یزید کے اس معاشقے کو تاریخی رومانوں میں جگہ دی ہے مگر یزید کے اس عشق کو ہم اس کی ہوس پرستی اور جنسی تلذذ کی ایک ذلیل سعی ہی قرار دیں گے جس کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے ؎

خواہش کا نام عشق، نمائش کا نام حُسن
اہل ہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

یزیدی سوچ عبداللہ کچھ دن دمشق میں قیام کرنے کے بعد عمارہ کے ساتھ مدینہ واپس چلا گیا، مگر یزید کو کسی کل چین نہ آتا تھا۔ عمارہ کی صورت اس کی آنکھوں میں سما چکی تھی۔ وہ اس کی شمع حسن کا پروانہ بن چکا تھا۔ وہ عمارہ کو حاصل کرنے کے لیے ہر ذلیل حربہ اختیار کرسکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عبداللہ بہت بااثر شخص ہے۔ مدینہ کے علاوہ دمشق کے تمام سرکردہ لوگ بھی اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ خود معاویہ اس کا بہت احترام کرتے تھے لہذا عمارہ کو عبداللہ سے زبردستی چھین لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی یزید کے گرد اُس جیسے بدباطن، مکار، ہوس پرست اور بے دین افراد کا ایک گروہ جمع رہتا تھا جو ہمیشہ اس کی خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اس کی خواہش اور حکم کے مطابق ہر مذموم فعل سرانجام دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یزید نے عمارہ کے سلسلہ میں بھی ان افراد سے مشورہ اور مدد چاہی ہوگی، مگر یہ بات کسی کے بس کی نہ ہوگی۔ لہذا وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے عاجز رہا۔ اُسے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر اس نے عمارہ کو حاصل کرنے کے لیے عبداللہ کے ساتھ کوئی چال چلی تو اس کے والد بگڑ جائیں گے اس لیے کہ وہ عبداللہ کے ہی خواہ تھے۔ چنانچہ یزید خاموش رہا مگر آتش ہوس اندر ہی اندر سلگتی اور بڑھتی رہی۔ اس نے طے کر لیا کہ تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد ہی یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ چنانچہ تہیہ کر لیا کہ خلیفہ بننے پر سب سے پہلا کام یہی کرے گا کہ عمارہ کو عبداللہ سے چھین کر اپنی آغوش میں لے آئے ؎

۵ ہمیں تو ضبطِ محبت قبول ہے لیکن
وہ موج سی جو رگوں میں اچھل اچھل جائے

خلافت اور خباثت دن گزرتے گئے، معاویہ بڑھاپے کو پہنچ چکے تھے۔ یزید تختِ خلافت کے لیے بیتاب ہو رہا تھا چنانچہ جلد ہی اس کے دل کی تمنا بر آئی۔ معاویہ اپنی عمر کے ۷۷ برس گزارنے کے بعد عالمِ فانی سے عالمِ جاوداں کو سدھارے[1] اور یزید سریر آرائے خلافت ہوا۔

تخت و تاجِ سلطنت سنبھالتے ہی یزید نے جو گھناؤنا کردار ادا کیا اور خاندانِ نبوت کو جس طرح تختۂ ستم بنایا۔ اس سے ساری دنیا آگاہ ہے۔ علاوہ ازیں اس کی بدکاریوں اور بداخلاقیوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ عمارہ کے سلسلہ میں بھی محبت کی جو چنگاری اس کے دل میں سلگ رہی تھی حصولِ خلافت کے ساتھ ہی یہ چنگاری یکلخت بھڑک اٹھی تھی اور وہ اپنے عزم کے مطابق عمارہ کو حاصل کرنے کے لیے کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کی سوچنے لگا۔

یزید کی بے بسی اگر عبداللہ کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو شاید یزید کو اس معاملے میں زیادہ سوچنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی اور وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر جبراً عمارہ کو چھین لیتا مگر عبداللہ کوئی معمولی آدمی نہ تھا، وہ وقت کے تمام بڑے لوگوں کے نزدیک قابلِ تکریم ہستی تھی۔ اس کے عقیدت مندوں اور ہمدردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ اس کے ساتھ جبر و تعدی کرنا گویا تمام لوگوں سے دشمنی مول لینا تھا۔ اور اس وجہ سے یزید کے لیے یہ مسئلہ بہت کٹھن تھا وہ جان چکا تھا کہ طاقت کے زور سے بھی یہ کام طے نہ پا سکے گا بلکہ اس کے لیے کوئی اور صورت نکالنی چاہیے۔

شاطر کی طلبی ان دنوں عراق میں یزید کی جان پہچان کا ایک شخص رہتا تھا جو طنز و مزاح اور ظرافت و لطافت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ وہ اپنی دلپسند اور ظریفانہ باتوں سے ہر کسی کا دل موہ لینے میں ماہر تھا۔ لوگ اُسے پسند کرتے تھے۔ اُسے سخن سازی اور فریب کاری میں بھی

---

[1] معاویہ ۴۱ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھے اور ۲۲ رجب ۶۰ھ (۲۸ اپریل ۶۸۰ء) کو وفات پائی۔

مہارت حاصل تھی۔ یزید کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی اور سوچا کہ اس کے ذریعہ عبداللہ کو پھانسا جائے اور کسی فریب اور بہانے سے عمارہ اس سے چھین لی جائے۔

یزید نے عراقی کو فوراً دمشق میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

شریروں کا معاہدہ عراقی حاضر ہوا تو یزید نے اپنے دل کی ساری کیفیت اس کے سامنے بیان کی اور کہا کہ عبداللہ بہت با اثر آدمی ہے، اگر میں نے اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی تو بہت سے لوگ میرے خلاف ہو جائیں گے، گو کھلم کھلا کسی کو میرے خلاف کوئی اقدام کرنے کا حوصلہ نہ ہوگا اور نہ ہی ان کے اقدام سے مجھے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے تاہم بہتری اسی میں ہے کہ اُس سے یا اس کے جملہ بہی خواہوں سے جھگڑے بغیر عمارہ کو حاصل کر لیا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں تم میری مدد کر سکو اور یہ کام انجام دے دو تو میں منہ مانگا انعام تمھیں دوں گا۔ زر و جواہر سے تمھاری جیبیں بھر دوں گا۔ بڑی بڑی جاگیریں اور انعامات عطا کروں گا۔ اس سلسلہ میں تمھیں جس قدر رقم خرچ کے لیے درکار ہو وہ تم مجھ سے ابھی لے سکتے ہو اور کسی اور شے کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دو۔ تمھیں پورا اختیار ہے۔

عراقی مکر و فریب، دغابازی اور حیلہ سازی میں ماہر شاطر تھا۔ یزید کی باتیں سن کر بولا، یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ خاطر جمع رکھیں میں چند دنوں کے اندر اندر عمارہ کو آپ کے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ مگر اس مہم کے لیے بہت زیادہ روپے کی ضرورت ہے۔

یزید نے اس وقت شاہی خزانہ کے مہتمم کو حکم دے دیا کہ عراقی کو جس قدر روپے کی ضرورت ہو فوراً دے دیا جائے۔

دامِ تزویر عراقی نے خزانہ شاہی سے ایک بہت بڑی رقم لی اور اس سے شام کے عمدہ عمدہ برتن اور دوسری اشیائے تجارت خریدیں اور اونٹوں پر لاد کر تاجر کی حیثیت میں مدینہ کا رُخ کیا۔ مدینہ پہنچ کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں سے عبداللہ کا مکان بالکل قریب تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ عراقی نے عبداللہ کو پیغام بھیجا کہ میں عراق کا سوداگر ہوں، شام سے مالِ تجارت لے کر فروخت کی غرض سے مدینہ میں آیا ہوں۔ میں نے آپ کے

حسنِ اخلاق اور آپ کی بزرگی کی بہت تعریف سُنی ہے، چاہتا ہوں کہ جتنے دن مدینہ میں قیام رہے آپ کے زیرِ سایہ دن گزاروں۔ اگر آپ مجھے اپنے مہمان کی حیثیت بخشیں تو میں آپ کا بہت احسان مند رہوں گا۔

عبداللہ بہت خلیق اور با مروّت شخص تھا۔ اس نے ایک اجنبی اور مسافر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُسے اپنی مہمان داری میں لینا قبول کر لیا۔ اور اُس سے ملاقات کی۔ پھر اپنے کارندوں کو ہدایت کی کہ سوداگر کے لیے پڑوس میں ایک مکان خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ عراقی اس مکان میں رہنے لگا۔ عبداللہ نے اپنے مہمان کی بہت خاطر مدارات کی اور دونوں میں تعلق بڑھتا گیا۔ عراقی نے اپنی شاطرانہ اور ظریفانہ طبیعت کے ذریعہ سے عبداللہ کو اتنا متاثر کر لیا کہ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ عبداللہ اُسے اکثر اوقات اپنے مکان پر لے آتا۔

ساغرِ غم | عراقی کو رہتے ہوئے کافی مدت گزر گئی۔ اس اثنا میں اس نے اپنی بذلہ سنجیوں کے طفیل عبداللہ کے دل میں اتنا گھر کر لیا کہ اُس نے اُسے اپنا خاص دوست اور دل راز دار بنا لیا۔ چنانچہ ایک دن عبداللہ نے اُسے رات کے کھانے پر اپنے ہاں بلایا اور بڑی شاندار ضیافت کی۔

لذیذ غذاؤں اور پُر لطف میووں کے ساتھ شراب کے دور بھی چلے۔ کھانے سے فراغت پائی تو عمارہ کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ عراقی نے مدینہ میں اپنے قیام کے دوران ایک دو مرتبہ عمارہ کو دیکھ لیا تھا، مگر اُسے قریب سے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ آج جب عمارہ بن سنور کر اس محفل میں آئی تو عراقی بھی اس کے حسنِ خداداد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ عبداللہ کے حکم پر عمارہ نے اپنی دل موہ لینے والی آواز میں گانا شروع کیا۔ اس کے دلکش نغموں سے ماحول پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ در و دیوار تک مخمور اور سرشار نظر آنے لگے۔ گانے کے سرور نے شراب کے نشے کو دوبالا کر دیا۔ عبداللہ اور عراقی دونوں سراپا مسحور بنے ہوئے تھے عمارہ ساز بجاتی اور گاتی رہی۔ بالآخر گانا ختم ہوا اور وہ حسبِ معمول نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ عمارہ چلی گئی مگر اس کے حسن اور دلربا نغموں کا نشہ عبداللہ اور عراقی پر بدستور طاری

رہا۔ خوشی کے جوش میں عبداللہ نے عراق سے پوچھا "کیوں دوست! کیا تم نے اپنی زندگی میں عمارہ جیسی حسین وجمیل اور خوش گلو مغنیہ دیکھی ہے؟"

عراق نے جواب دیا " بخدا میں نے اس لڑکی سے زیادہ خوبصورت اور اس سے بہترین گانے والی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ مجھے کئی بڑے بڑے تاجروں اور امیروں کی صحبت میں بیٹھنے اور نازک اندام لڑکیوں کا گانا سننے کا اتفاق ہوا مگر خدا شاہد ہے۔ آپ کی کنیز کا ہمسر کسی کو نہ پایا۔ نہ حسن وجمال میں اور نہ آواز کے لحاظ سے۔ ایسی کنیز تو صرف آپ ہی جیسے بزرگ کے لیے سزاوار ہے۔ عمارہ جیسی پری جمال، خوش اندام، ماہ وش اور ماہ پارہ روئے زمین پر کہیں نہیں مل سکتی۔ آپ دنیا کے خوش قسمت ترین آدمی ہیں۔ مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک آتا ہے۔"

عبداللہ: " اچھا یہ تو بتاؤ میری اس کنیز کی کیا قیمت[1] ہوسکتی ہے؟"

عراق: " بزرگ محترم! کوئی اندازہ ہو تو میں بتا سکوں۔ ایسی کنیز کی قیمت بھلا کون ادا کر سکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تخت خلافت کے سوا اس کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی"

عبداللہ (راضی میں خوش ہوتے ہوئے) " کیا تم محض میری خوشنودی کی خاطر ایسا کہہ رہے ہو: یا واقعی تم نے اپنے دل کی سچی بات کہی ہے؟"

عراق: " خدا شاہد ہے میں تم سے صحیح بات کہہ رہا ہوں۔ تمھاری خوشامد یا ناجائز دلجوئی نہیں کر رہا۔ نہ ہی عمارہ کی بے جا عزت افزائی کر رہا ہوں، وہ ایک ایسا ہوتی ہے جس کی قیمت کوئی جوہری ادا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں سوداگر ہوں اور سوداگر ہر سودے میں بڑی سوچ بچار سے کام لیتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم رقم میں زیادہ بہتر مال خریدے۔ اسے اپنے روپے کی بہت قدر ہوتی ہے۔ بے جا اصراف سے ہمیشہ بچتا ہے۔ اور میرا اپنا اصول بھی یہی ہے، مگر عمارہ کے معاملے میں میں سمجھتا ہوں اسطرح

---

[1] اُس دَور کے رسم ورواج کے مطابق غلام یا کنیز کا بیش قیمت ہونا بھی شانِ امارت یا فخر ومباہات میں شامل تھا۔

سوچنا غلطی ہے اور عمارہ اور آپ دونوں کی توہین ہے۔ میں اس بیش قیمت موتی کو دس ہزار[1] اشرفیوں کے عوض خریدنے کو تیار ہوں اور شاید یہی میری ساری پونجی ہوگی۔"

عراقی کی یہ بات سن کر عبداللہ بہت متعجب ہوا "دس ہزار اشرفیاں؟" اس نے پوچھا
"ہاں دس ہزار" عراقی نے جواب دیا۔
"کیا آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے؟" عبداللہ نے سوال کیا۔
"بخدا میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا" عراقی نے جواب دیا۔

دس ہزار اشرفیوں کا سن کر عبداللہ لالچ میں آگیا اور عمارہ کو بیچنے پر آمادہ ہوگیا۔
"اگر یہی بات ہے تو میں عمارہ کو آپ کے ہاتھ فروخت کرنے کو تیار ہوں۔"
"بہت بہتر" عراقی نے کہا "میں ابھی آپ کو یہ رقم ادا کر دیتا ہوں۔" یہ کہا اور اٹھ کر اپنی فرودگاہ کو چلا گیا تاکہ رقم لا کر عبداللہ کے حوالے کرے اور عمارہ کو لے جائے۔

عراقی کے چلے جانے کے بعد عبداللہ کی نظروں میں عمارہ کی جدائی کا نقشہ پھرنے لگا۔ یہ حقیقت تھی کہ عبداللہ عمارہ پر جان نثار کرتا تھا وہ اس سے پل بھر کی جدائی بھی گوارا نہ کر سکتا تھا اور محض نشہ اور لالچ کے تحت اس نے یہ سودا کر لیا تھا، مگر جلد ہی اسے عمارہ کی محبت نے بے بس کر دیا اور وہ اپنے کیے پر نادم ہوگیا۔ اس نے سوچا وہ عمارہ کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہ کرے گا اور اگر عراقی رقم لے کر آیا تو وہ لینے سے انکار کر دے گا۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ عراقی دس ہزار اشرفیاں لے کر آگیا اور عبداللہ کے سامنے رکھ دیں۔ عبداللہ نے اس سے کہا کہ "میں تو محض مذاق کر رہا تھا میرا ارادہ عمارہ کو بیچنے کا ہرگز نہیں تم نے خواہ مخواہ میری بات کو سچ سمجھ لیا۔"

عراقی بولا "اب تو عمارہ میری ہو چکی ہے تم نے میرے ساتھ سودا کر لیا ہے اور یہ محض مذاق نہیں تھا بلکہ سچ مچ کی خرید و فروخت تھی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شرعی اصول

---

[1] اس زمانہ میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ کنیز کی قیمت بھی دس ہزار اشرفیاں نہ ہو سکتی تھیں۔

کے بموجب مذاق میں ایجاب و قبول کرنے سے بھی بیع ہو جاتی ہے اور بیچنے والے کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خریدنے والے کی مرضی کے بغیر بیع کو فسخ کر دے "

عبداللہ نے کہا " تم نے تو دس ہزار اشرفیاں پیش کی ہیں میں تو دنیا کی ساری دولت کے عوض بھی عمارہ کو نہیں بیچ سکتا "

عراقی اپنی بات پر اڑا رہا - اس نے کہا " میں بھی کسی قیمت پر اس سودے کو فسخ نہ ہونے دوں گا "

عبداللہ نے کہا " اچھا اگر تم عمارہ کو خریدنے پر ہی ادھار کھائے بیٹھے ہو تو کچھ مدت تک ٹھہر جاؤ، جب کبھی میرا ارادہ اسے فروخت کرنے کا ہوا تو میں تمہارے سوا اور کسی کے ہاتھ فروخت نہ کروں گا "

عراقی نے عبداللہ کی ایک نہ مانی اور کہا کہ عمارہ بیع ہو چکی ہے اور اس کی قیمت پہنچ چکی ہے اب میں کسی طرح اُسے نہ چھوڑوں گا - وہ میری ہو چکی ہے، شرعاً اس پر آپ کا کوئی حق نہیں رہا "

اب عبداللہ مجبور تھا کہ عراقی سے رقم لے کر عمارہ کو اس کی تحویل میں دے دے - چنانچہ رقم لے لی اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ عمارہ کی رخصتی کا سامان کر دیا جائے - اس رقم میں سے تین ہزار اشرفیاں رخصتی کے سامان پر خرچ کرنے کے لیے دے دیں -

المناک گھڑی جب عمارہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اسے بہت صدمہ پہنچا - اسے اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ عبداللہ اُسے چھوڑ بھی سکتا ہے - جس طرح عبداللہ کو اس سے محبت تھی اسی طرح وہ بھی عبداللہ کی محبت سے سرشار رہتی تھی - چنانچہ وہ غم سے نڈھال ہو گئی - وہ کسی قیمت پر عراقی کے ساتھ جانے کو تیار نہ تھی مگر بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی - ایک کنیز کی حیثیت سے مالک کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی - تاہم عبداللہ نے اُسے واقعہ کی ساری تفصیل بتائی اور کہا کہ وہ اسے دل سے چاہتا ہے مگر وہ اپنی غلطی سے اس مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اگر بیچنے سے انکار کرے تو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا - ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ وہ صبر و شکر کرے اور اگر ہو سکا تو وہ دوبارہ اُسے اپنے پاس لانے کی

کوشش کرے گا ؎

تیرے گلشن کی بہار آج تجھے چھوڑ گئی!
تیری عشرت کا سبو ضربِ خزاں توڑ گئی!

ساعتِ فراق جس مقصد کے لیے عراقی نے یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا اور مدینہ میں اتنی مدت تک قیام کیا تھا وہ آج اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب رخصتی کا سامان ہو گیا تو عبداللہ نے دُکھے دل کے ساتھ عمارہ کو رخصت کیا۔ چلتے وقت عراقی نے عبداللہ کے احسانات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میرے قیام کے دوران میں آپ نے جس مروّت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کا عوض ہمیشہ میرے ذمہ رہے گا اور خدا نے زندگی بخشی تو دوبارہ آپ سے ملاقات کرنے آؤں گا۔ یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ ایک طرف عمارہ فرطِ غم سے گریہ کناں تھی تو دوسری طرف عبداللہ پیکرِ حسرت بنا اپنی غلطی پر آنسو بہا رہا تھا ؎

دل دھڑکتا ہے دھڑکنے کی صدا کوئی نہیں
سانس چلتی ہے پہ چلنے کی صدا کوئی نہیں

ان دونوں کے درمیان عراقی اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ اس کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اب وہ یزید کے دربار میں پہنچ کر انعام و اکرام پائے گا۔ وہ اپنے مستقبل کی درخشاں تصویر ابھی سے دیکھنے لگ گیا تھا۔

عمارہ دمشق میں عراقی عمارہ کو لے کر روانہ ہو گیا اور جوشِ مسرت میں منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے راستے کی تھکن محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایک جگہ استراحت کے لیے قیام کیا، اور اپنے جال پھیلانے کا سارا واقعہ عمارہ سے بیان کر دیا۔ اور کہا کہ میں نے تمھیں یزید کے لیے خریدا ہے لہٰذا میں ہرگز تمھیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ عمارہ یہ سن کر تڑپ اٹھی۔ اُسے رہ رہ کر عبداللہ کی سادگی اور عراقی کی چالبازی اور عیاری کا خیال آتا تھا۔ عبداللہ کی محبت نے ایک بار پھر اسے بیتاب کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جائے مگر مجبور تھی، بے بس تھی۔ وہ بھاگتی تو کیسے؟ عراقی نے اس کے شاندار مستقبل کی تصویریں بڑے دلکش اور خوبصورت انداز سے کھینچیں۔ اپنی چرب زبانی کا پورا پورا مظاہرہ

کیا اور عمارہ کا دل موہ لینے کی پوری کوشش کی، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کے ساتھ اس طرح چلی جا رہی تھی جس طرح کسی جانور کے گلے میں رسّی ڈال کر اُسے کشاں کشاں لے جایا جائے۔ اگرچہ خلیفہ کا نام ہر عام شخص کے لیے کشش کا باعث تھا مگر عمارہ ایک ادنیٰ کنیز ہوتے ہوئے خلیفہ کے پاس جانا پسند نہ کرتی تھی۔ مگر دمشق پہنچا دی گئی۔

ناکام آرزو عراقی عمارہ کو لے کر دمشق کے حدود میں داخل ہوا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس لیے کہ اس خدمت کے صلہ میں اسے گراں بہا انعام اور جاگیریں ملنے والی تھیں ــــــ مگر اُس کی یہ تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں جب دارالخلافہ میں پہنچتے ہی اُسے یزید کے مرنے کی خبر ملی[1]۔ اب وہ اپنی قسمت کو روتا پیٹتا عمارہ کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اب عمارہ کی حالت اس معصوم قیدی کی طرح تھی جو زندان میں اپنی زندگی کی گھڑیاں گزارنے کے لیے بند کر دیا گیا ہو۔ وہ عراقی کا دامن پکڑ پکڑ کر فریاد کر رہی تھی ؎

ہمارے خون کا الزام تم پہ آتا ہے
جو ہو سکے تو کہیں پیرہن کے داغ چھپاؤ

یزید کا ترکہ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تختِ خلافت پر بیٹھا تو عراقی نے سوچا کہ کیوں نہ باپ کا مال بیٹے کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور اپنی اس مہم کا حقِ خدمت اس سے وصول کر لیا جائے۔ چنانچہ اس نے عمارہ کو معاویہ کے حضور پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔

چونکہ معاویہ کے تخت پر بیٹھتے ہی بیعت کرنے والوں کا ہجوم ہو گیا تھا اور معاویہ کو فرصت نہ ملتی تھی، اس لیے عراقی نے کچھ دن تک انتظار کیا، جب معاویہ کو فراغت نصیب ہوئی تو ایک دن عراقی عمارہ کو لے کر اس کے پاس گیا اور سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ اس نے معاویہ سے کہا کہ مجھے اس تمام سلسلے کے لیے یزید ہی نے ساری رقم دی تھی اور یہ بیع میں نے یزید ہی کی جانب سے کی تھی۔ لہٰذا یزید کے مرنے کے بعد اس کے ترکے کے طور پر یہ کنیز آپ کی

---

[1] یزید صرف ۳ برس اور ۹ ماہ تختِ خلافت پر متمکن رہا۔ ربیع الاول سنہ ۶۴ھ (نومبر سنہ ۶۸۳ء) میں ۳۸ برس کی عمر میں داخلِ جہنم ہوا۔

ملکیت ہے۔

عراقی کو صلہ معاویہ کی عمر اس وقت میں اکیس برس کی ہوگی۔ اگرچہ اس کی زندگی عیش و آرام سے گذری تھی مگر عادات و خصائل اور کیریکٹر کے لحاظ سے اپنے باپ سے مختلف تھا۔ وہ نیک اور صالح شخص تھا۔ یزید نے اپنے عہدِ خلافت میں جو بداعمالیاں کی تھیں ان سے معاویہ کے دل کو بھی سخت رنج پہنچا تھا[1]۔ جب عراقی نے اُسے یہ نئی داستان سُنائی تو اُسے اور رنج ہوا۔ اس نے عمارہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ عراقی کو معاویہ کے اس انکار سے مزید رنج پہنچا۔ وہ تو اس خیال سے آیا تھا کہ معاویہ اُسے اس کی کارگذاری کے عوض میں بہت سا مال و دولت دے گا مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ اور وہ دل آزردہ ہوگیا۔ معاویہ نے عراقی کے چہرے سے بھانپ لیا کہ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہے اور جس طمع نے اس سے یہ سب کچھ کرایا ہے وہ پوری نہیں ہوئی۔ معاویہ چونکہ رحم دل بھی تھا اس لیے اس نے عراقی کی زیادہ دل شکنی گوارا نہ کی اور اتنا صلہ ضرور دیا کہ عمارہ اُسی کو بخش دی۔

احسان شناسی عراقی عمارہ کو لے کر گھر چلا آیا۔ عمارہ حیران تھی کہ کس مصیبت میں پھنس گئی۔ اُس نے عراقی سے کہا تم مجھے کہاں لیے لیے پھرتے ہو، اگر تم مجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تو عبداللہ کے پاس ہی چھوڑ آؤ۔ میں انھیں کہہ سن کر تمھیں وہی رقم واپس دلا دوں گی جو تمھارے کام آئیگی عراقی نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اُسے عبداللہ کے پاس چھوڑ آئے۔ چنانچہ کہنے لگا۔ اب تو

---

[1] یزید کے عہد میں جو دردناک واقعات پیش آئے تھے معاویہ کے دل پر ان کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ جب یزید کے بعد وہ تختِ خلافت پر متمکن ہوا تو اس کا دل حکومت سے اچاٹ ہو چکا تھا چنانچہ تین ماہ بعد ہی اس نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور کہا کہ میں خلافت کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ تم لوگ جسے چاہو اپنا حاکم بنا لو۔ میں چاہتا تھا کہ ابوبکرؓ کی طرح کسی کو اپنا جانشین مقرر کردوں یا عمرؓ کی طرح چھ آدمی نامزد کر کے کہہ دوں کہ ان میں سے کسی ایک کو چن لیا جائے مگر مجھے نہ عمر جیسا آدمی نظر آتا ہے اور نہ چھ آدمی ایسے دکھائی دیتے ہیں جو عمر کو مل گئے تھے۔ خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد معاویہ خانہ نشین ہوگئے اور اسی حالت میں چند ماہ بعد رحلت کی۔ اس کے ساتھ ہی خاندانِ معاویہ کی خلافت ختم ہوکر مروانی برسرِ اقتدار آ گئے۔

اصولاً میں تمھارا حق دار بن چکا ہوں، اس لیے کہ معاویہ نے تمھیں مجھے بخش دیا ہے اور میں تمھارا مالک ہوں مگر یقین جانو میں اب بھی تمھیں نہیں چھوؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم میں اور عبداللہ میں جدائی ڈالی اور جس لالچ کے تحت میں نے ایسا کیا وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اب میں اپنی بہتری اسی میں خیال کرتا ہوں کہ تمھیں تمھاری اصل جگہ پر چھوڑ آؤں ۔ عبداللہ نے میری بہت خاطر مدارات کی تھی اور میری مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھائے نہ رکھا تھا، وہ میرا محسن ہے۔ میں عمر بھر اس کا احسان نہیں بھلا سکتا اور رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ اس کے احسانات کا عوض مجھ پر باقی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس عوض کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ میں تمھیں اس کے سپرد کر کے اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں۔

عمارہ کو رخصت کرنے کے بعد عبداللہ پر جو گزری وہ بیان سے باہر ہے۔ عمارہ کے فراق میں اُسے زندگی کی گھڑیاں گزارنی مشکل ہو گئیں۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہتا تھا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا۔ ہر دم عمارہ ہی کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اس کے غلام اور ملازم سب پریشان تھے۔ عمارہ عبداللہ کے گھر کی واحد رونق تھی۔ عبداللہ کے گھر والے، عورتیں اور بچے سب عمارہ سے بے حد مانوس تھے۔ چنانچہ اس کے چلے جانے کے بعد بڑے چھوٹے سب غم زدہ تھے۔ وہ بھی ہر وقت عمارہ کو یاد کرتے رہتے۔ غرض عمارہ کے بغیر عبداللہ کا گھر غم کدہ بن چکا تھا اور اس پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

طلوعِ سحر

فریبِ زیست سے تاریک ہو چکے تھے دماغ
جلا دیے ہیں نئے سر سے آرزو نے چراغ

عراقی عمارہ کو لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد دونوں مدینہ پہنچے اور عبداللہ کے مکان سے قدرے فاصلے پر قیام کیا۔ عبداللہ کے خادموں سے عراقی کی جان پہچان ہو ہی چکی تھی۔ ان میں سے ایک خادم پر اس کی نظر پڑی تو اُسے بلایا اور عبداللہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔ عبداللہ عراقی کی آمد کی خبر سن کر بصد حسرت و یاس باہر آیا اور دونوں بغل گیر ہوئے۔ عراقی نے عمارہ کو خیمے کے اندر ہی رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی تاکہ عبداللہ کی نظر اس پر نہ پڑے۔ عبداللہ نے عربوں کی روایت کے مطابق اپنے مہمان کا پرجوش استقبال

کیا اور اُسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ عراقی نے اپنی جائے سکونت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سامنے خیمہ میں میرا سامان وغیرہ رکھا ہے۔ لہٰذا آپ میرے ساتھ وہاں چلیں اس نے یہ نہ بتایا کہ عمارہ بھی اس کے ساتھ آئی ہے اور خیمہ کے اندر ہے۔ عبداللہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا خیمہ کی طرف آیا۔ جونہی اندر داخل ہوا وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عبداللہ کی آمد سے قبل عمارہ زمین پر بیٹھی تھی۔ عبداللہ کو دیکھتے ہی فوراً کھڑی ہو گئی۔ نظریں جھک گئیں۔ بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے اپنی بانہوں سے چہرہ چھپا لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اِدھر عبداللہ کی یہ کیفیت تھی کہ مجسمہ حیرت بنا کھڑا تھا۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ اس کی زبان پر آ کر رُک جاتے تھے۔ غم اور خوشی کے ملے جُلے جذبات سے اس کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں وہ عمارہ پر صرف پہلی نظر ہی ڈال سکا اور جو اچانک تھی۔ اس کے بعد وہ عمارہ کی طرف دیکھنے کی جراُت نہ کرسکا۔ عمارہ کو دیکھتے ہی اس کے قدم اسی جگہ جم گئے اور سکتہ کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

عمارہ کے رونے کی آواز بدستور بلند ہوتی گئی، مگر عبداللہ خاموش اور مبہوت کھڑا رہا۔ عراقی کے لبوں پر بھی مہرِ سکوت لگ چکی تھی۔ کچھ دیر تک یہ منظر برقرار رہا۔ پھر عراقی نے عبداللہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "میرے محترم بزرگ اور معزز میزبان! میں آپ سے اپنی لغزشوں کی معافی چاہتا ہوں اور عمارہ کو واپس آپ کی نذر کرنے کے لیے لایا ہوں۔"

عراقی کے ان الفاظ نے عبداللہ اور عمارہ کے دکھے دلوں پر تازیانے کا کام کیا اور عمارہ فرطِ محبت میں آگے بڑھ کر عبداللہ کے گلے سے لگ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ یہ محبت اور ندامت کے آنسو تھے۔ عبداللہ عمارہ سے بات کرنے کی جراُت تو نہ کرسکا، عراقی سے مخاطب ہو کر لرزتی آواز میں پوچھا، "محترم مہمان! یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ عمارہ پر تو اب میرا کوئی حق نہیں۔"

اب عراقی نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ بیان کر دیا اور بتایا کہ یہ جال اس نے

یزید کے کہنے پر بچھایا تھا اور آج وہ اپنی اس کارگزاری پر سخت شرمندہ ہے چنانچہ عمارہ کو محض اس لیے ساتھ لے کر آیا ہے کہ وہ عبداللہ کے حوالے کر دے۔

عراقی کی زبانی ساری داستان سننے کے بعد عبداللہ نے عمارہ کا ہاتھ پکڑا اور دونوں اشکِ مسرت بہاتے گھر کی طرف چلے، عراقی بھی ساتھ تھا۔ جونہی انھوں نے گھر کے اندر قدم رکھا عورتیں، بچے اور نوکر "عمارہ"، "عمارہ" پکارتے ہوئے دوڑے۔ سب نے عمارہ سے معانقہ کیا، اور جب سب کو اصل واقعے کا علم ہوا اور انھیں بتایا گیا کہ عمارہ اب واپس نہیں جائے گی تو سب گھر والوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

عبداللہ نے اس مسرت میں صدقہ و خیرات کیا۔ غریبوں کو کھانا کھلایا اور اپنے احباب کی پر تکلف دعوت کی۔ اس نے عراقی کو اس مروت اور احسان کے بدلہ میں بیس ہزار اشرفیاں دینی چاہیں مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ عبداللہ نے بہت اصرار کیا مگر وہ یہی کہتا رہا کہ میں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے، اس لیے میں یہ نہیں لے سکتا۔ عراقی کے انکار کے باوجود عبداللہ نے اسے یہ رقم نذرانہ کے طور پر دے دی اور وہ چند دن مدینہ میں گزارنے کے بعد واپس چلا گیا ؂

حیات کی ممکنات سے ناامیدی عصیاں ہے مرنے والے
نہ جانے کب آپہنچتی ساعت وصال کی تُو جیا تو ہوتا!

تیمور کا رومان

"حبیب تمہارے الفاظ سخت ہیں لیکن ان میں صداقت کی بو آتی ہے۔ تم نے میری زندگی کے پانسہ کو ایک لحظہ میں پلٹ دیا ہے۔ میرے خیالات میں انقلاب ہوتا نظر آ رہا ہے۔" تیمور یہ کہہ کر اپنے خیمہ میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور فکر کے آثار صاف ہویدا تھے۔ وہ حبیب کے تیرِ نگاہ سے گھائل ہو چکا تھا۔

تیموری کارنامے | تیمور دنیا کا نہایت ظالم اور خونخوار حکمران گزرا ہے۔ جو چنگیز خاں[1] کے جانشینوں میں سے تھا۔ اس نے سمرقند و بخارا سے ہندوستان تک ایک شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی اور ترک قوم میں مرکزیت کی ایک نئی روح پھونکی جس سے چین اور روس کی تمام دست درازیاں ختم ہو گئیں۔ تیمور کے زمانہ میں ترکستان کو بہت عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔ سمرقند اور بخارا میں بڑے بڑے دینی علماء اور فضلا بلائے گئے۔ غرض اس نے ترکوں کی حکومت کا سکہ بٹھا دیا۔

تیمور ۱۳۳۵ء میں کیش (ماوراء النہر) میں پیدا ہوا۔ وہ زبردست مہم جو اور منچلا شخص تھا۔ چنگیز خاں کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی تھیں۔ اور جلد ہی ان تمام علاقوں پر قابض ہو گیا جن پر کبھی چنگیز کی حکومت تھی۔ پھر ایران، شام، سمرقند اور بخارا فتح کرنے کے بعد ہندوستان کو فتح کیا۔[2]

---

[1] تیمور کی طرح چنگیز خاں بھی بہت ظالم حکمران تھا۔ وہ آندھی بن کر منگولیا کے ریگستان سے اٹھا اور بغداد و دمشق تک اینٹ سے اینٹ بجاتا چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تاتاریوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تیمور کے زمانہ میں تاتاری مسلمان ہو چکے تھے۔ تیمور بھی اسلام کا پیرو تھا۔

[2] تیمور کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب اسلام کو فروغ دینے کا بہت خواہش مند تھا اور ہندوستان پر اس کے حملے کی غرض و غایت یہی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی دولت نے اُسے اس ملک پر حملہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

تیمور کے زمانہ میں ترک افواج دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی تھیں اور ایشیا میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سلطان بایزید ترکوں کا زبردست حکمران تھا۔ جس کی ہیبت سے سب ڈرتے تھے۔ تیمور کے دل میں فتوحات کا شوق بہت زیادہ تھا۔ وہ یلغار کرتا ہوا سلطان بایزید کے ملک میں داخل ہوگیا۔ اور انگورہ[1] پر حملہ کیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ تیمور کے جرنیل طغرل خاں نے جو اپنا ثانی نہ رکھتا تھا ترکوں کے چھکے چھڑا دیے۔ شہر فتح ہوگیا۔ بایزید کو زبردست شکست ہوئی۔ ہزاروں کی تعداد میں افسر اور سپاہی قید کر لیے گئے۔ انگورہ میں کہرام مچا ہوا تھا بازاروں اور گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ تیمور کی فوجیں ترکوں کے علاقے میں دُور دُور تک پھیل گئیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ[2] بھی ان کی دسترس سے نہ بچا۔ تیموری لشکر نے ہر طرف تباہی مچائی۔ ترکوں کے ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

شانِ تیموری فتح کے بعد تیمور نے شاہی محل کے عین سامنے خیمے لگا لیے اور قیدیوں کو حاضر کیا گیا۔ ان قیدیوں میں بایزید کا مشہور جرنیل یزدانی بھی تھا۔ یزدانی بہت بہادر اور منچلا جرنیل تھا

(بقیہ نوٹ صفحہ سابقہ) کرنے کا شوق دلایا۔ چنانچہ پہلا ایک فوج پیر محمد کی سرکردگی میں بھیجی جس نے اچھ اور ملتان کو سخر کیا۔ یہاں کے باشندے بھٹنیر کی طرف بھاگ گئے مگر تیمور نے ان کا تعاقب کیا اور انھیں سخت سزائیں دیں۔ پھر ترکوں نے سرسوتی کا رخ کیا اور دہلی سے چھ میل کے فاصلے پر رہ گئے۔ دہلی پر حملہ کرنے سے قبل تمام قیدیوں کو قتل کر دیا۔ دہلی کے سلطان محمود تغلق کو زبردست شکست دی۔ تین دن تک دہلی میں قتل عام کیا۔ بچوں بوڑھوں عورتوں کو تہ تیغ کیا، دہلی کی ساری دولت سمیٹی اور میرٹھ گیا جہاں قلعے مسمار کیے۔ پھر ہردوار کو لوٹا جموں کے راجہ کو شکست دی اور پندرہ ماہ ہندوستان میں گزارنے کے بعد واپس اپنے ملک چلا گیا۔

[1] آجکل اس شہر کو انقرہ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی ترکی کا پایہ تخت تھا اور آجکل بھی صدر مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔

[2] اسے استنبول بھی کہتے ہیں۔ ترکی کا مشہور شہر اور بڑی بندرگاہ ہے۔ پہلے ترکی کا صدر مقام تھا باسفورس میں داخل ہونے کا جنوبی دروازہ ہے۔ سینٹ صوفیہ کی مشہور و معروف مسجد اسی جگہ ہے۔ آبادی پچاسی لاکھ کے قریب ہے۔

اس کے نام سے دنیا تھراتی تھی مگر آج وہ بھی سرنگوں تیمور کے سامنے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا تھا۔

تیمور نے حکم دیا کہ بایزید کی فوج کے تمام قیدی قتل کر دیے جائیں۔

جرأتِ حُسن | اس حکم کو سُن کر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تیمور کے سامنے کسی کو بولنے کی جرأت نہ تھی، بلکہ کوئی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ اتنے میں قیدیوں کی صف میں سے ایک نوجوان لڑکی جس نے فوجی لباس پہن رکھا تھا آگے بڑھی اور تیمور کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

تیمور نے غصے میں تیوری چڑھائی۔ ایک قیدی کا اس طرح آگے بڑھ کر اس کے قریب آنا صریحاً گستاخی تھی۔ مگر ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ قیدی بول اٹھا "کیا انصاف اسی کا نام ہے کہ کسی قوم کا ناموس لوٹ لیا جائے، اس کے بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کو بے دردی سے قتل کیا جائے اور جو بچ جائیں انھیں قیدی بنا کر پھر ان کی گردن زنی کا حکم دیا جائے۔ آپ کے سپاہیوں نے جو تباہی کی ہے اس سلسلہ میں مظلوموں کی داد رسی کرنے کی بجائے الٹا انھیں سزا دی جا رہی ہے، یہ کس قانون اور اخلاق کے کس ضابطہ کے ماتحت جائز ہے ؟"

تیمور چکر میں | تیمور نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسے الفاظ سنے تھے۔ وہ غصّے میں تلملا اٹھا۔ اس نے بڑی غضبناک نگاہوں سے قیدی کو گھورا۔ یکایک اس کا غصّہ حیرت میں تبدیل ہو گیا۔ ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں اور تعجب کے انداز میں پوچھا

" کیا تم لڑکی ہو ؟"

" جی ہاں ! میں لڑکی ہوں " قیدی نے جو فی الواقع لڑکی تھی اور مردانہ لباس میں جنگ میں حصہ لے چکی تھی، جواب دیا۔ پھر بولی " فتح اور شکست تو قسمت کا کھیل ہے۔ ہم نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خاطر جو ہو سکا کیا۔ مگر افسوس ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بایزید جیسے باعظمت اور پُرشکوہ تاجدار کی سطوت کا خاتمہ ہو گیا اسے قیدی بنا لیا گیا اور اس کی بے کس اور مظلوم رعایا کو خستہ حالی کا شکار ہونا پڑا۔ میں آپ سے رحم کی التجا نہیں کر

رہی بلکہ انصاف چاہتی ہوں۔ انصاف اور عدل ۔"

تیمور بڑی حیرت سے لڑکی کو دیکھتا رہا اور اس کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ وہ اس کی جرأت، بہادری اور بے باکی پر دنگ رہ گیا۔ پھر اس کے بے مثال حسن نے بھی تیمور کے دل پر زبردست اثر کیا اور تیمور کی کیفیت ہی بدل گئی۔

تیمور نے حکم دیا کہ اس لڑکی اور اس کے تمام لواحقین کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

محبوبہ کی شخصیت اس ایرانی لڑکی کا نام امتہ الجبیب تھا، اس کا باپ یزدانی سلطان بایزید یلدرم کی افواج کا جرنیل تھا۔ یزدانی آتش پرست تھا بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا تھا۔ اس کی غیر معمولی جرأت، بہادری اور قابلیت کے باعث ترکوں میں اُسے امتیازی درجہ حاصل تھا اور اس کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ امتہ الجبیب اس کی اکلوتی بیٹی تھی، جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اُسے عربی، فارسی، ترکی، چینی اور زرتشتی زبانوں پر کمال دسترس حاصل تھی۔ باپ نے اسے جنگی تعلیم و تربیت سے بھی آراستہ کیا تھا۔ ترکی کے مدرسہ حربیہ میں اس نے فنونِ جنگ سیکھے۔ وہ بہت حسین و جمیل تھی۔ چنانچہ جنگی مدرسہ میں تعلیم پانے کے دوران کئی نوجوان افسر اس کی طرف مائل تھے۔ مگر اس نے کبھی ان باتوں کی طرف توجہ نہ دی۔ فنونِ جنگ سیکھنے کے بعد وہ باپ کے ساتھ فوج میں کام کرنے لگی۔ اپنی قابلیت کے باعث ترقی کر کے افسر کا درجہ پایا اور مردانہ لباس پہن کر لڑائیوں میں حصہ لینے لگی۔ خلیفہ وقت بھی اس کی بہادری سے بہت خوش تھا اور اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ تیمور کے حملہ کے وقت بھی وہ اپنے باپ کے دوش بدوش لڑی مگر اب باپ کے ساتھ وہ خود بھی قید ہو کر تیمور کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ پھر اپنی ہی جرأت اور بہادری سے اس نے تیمور کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسے رہا کر دے۔ چنانچہ وہ اور اس کا باپ دونوں رہا کر دیے گئے تھے۔

لڑکی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر میں چلی آئی، لیکن جاتی دفعہ تیمور کے دل کا صبر و قرار بھی لیتی گئی۔ حمیدہ[1] ایک عام لڑکی تھی۔ تیمور کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنائے

---

[1] امتہ الجبیب بعد میں حمیدہ بانو کہلائی۔

اس نے تمام رات کروٹیں بدلتے کاٹ دی۔ حمیدہ کی یاد خوابوں میں بھی ستاتی رہی۔ تیمور چاہتا تھا کہ اسے بھول جائے، لیکن سہانی صبحوں اور کبھی ٹوٹتی راتوں کو حمیدہ کی یاد کہنہ ناسور بن جاتی۔ ماہ پارہ رقاصائیں تیمور کے حضور میں حاضر ہوتیں، ناچتیں، گاتیں، لیکن تیمور کو مسرت و انبساط کی دولت نہ بخش سکتیں۔ اس کا صبر و قرار ایک چمپئی رخساروں والی دوشیزہ نے لوٹ لیا تھا۔ اور اس کے چلے جانے سے فضا پر اندھیرے رقص کناں تھے۔

پیامِ شادی | دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیمور نے حمیدہ کے باپ امیر یزدانی کے پاس شادی کا پیغام بھیج دیا۔ امیر یزدانی تیمور کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی روز تیمور کی آتشِ غضب بجلی بن کر حمیدہ بانو پر گرے گی اور یہ کمسن کلی آنِ واحد میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔ لیکن حمیدہ بانو نے باپ سے کہا کہ آپ شادی کا پیغام قبول کر لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو تیمور کا مزاج ٹھیک کر لوں گی۔

دوشیزگی میں وہ امۃ الحبیب کے نام سے مشہور تھی لیکن شاہی حرم میں آتے ہی اس کا نام حمیدہ بانو ہو گیا۔

شادی کے بعد | چونکہ وہ علم و فضل اور فنونِ سپہ گری میں طاق تھی اس لیے تیمور کی منظورِ نظر بن گئی۔ اگرچہ تیمور کی اور بیویاں بھی تھیں لیکن محل میں حمیدہ بانو ہی کا سکہ چلتا تھا۔ شادی کے بعد وہ ہر معرکہ میں تیمور کے دوش بدوش لڑی۔ ایک دلربا حسینہ ہونے کے باوجود اسے عیش و عشرت سے نفرت تھی۔

شادی کو تھوڑے دن گزرے تھے کہ مطخرہ کے گورنر شریف حسین نے تیمور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ بغاوت کی خبر سن کر تیمور کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوجوں کو حکم دیا کہ پوری طاقت سے حرکت میں آئیں۔ حمیدہ بانو نے کہا

"سلطانِ عالم! اس مہم کی قیادت مجھے سونپ دیجیے۔ میں شریف حسین کو زندہ یا مردہ آپ کے دربار میں پیش کروں گی، اگر مجھے شکست ہوئی تو لوٹ کر کبھی واپس نہ آؤں گی۔"

تیمور نے کہا "بیگم، بڑی خوفناک جنگ ہو گی، مجھے خطرہ ہے کہ تم صورتِ حال پر قابو نہیں پا سکو گی۔"

"تیمور کے علاوہ مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا" حمیدہ بانو نے تن کر کہا۔

حمیدہ بانو کو تیموری فوجوں کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ وہ گرجتی برستی اصطلحزہ جا پہنچی۔ جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شریف حسین نے قلعہ کا دروازہ کھول دینے کا فریب دے کر شب خون مارا۔ تیموری فوج نیند کے نشے میں مدہوش پڑی تھی۔ بیگم اپنے خیمہ میں بیٹھی تیمور کو خط لکھ رہی تھی۔ اچانک گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز کانوں میں آئی۔ بیگم نے اپنے پہرہ دار کو خبردار کیا، لیکن پہرے دار کے ہوشیار ہونے سے پہلے شریف حسین کی فوجوں نے بیگم کے خیمے کو گھیر لیا تھا۔ حمیدہ بانو نے اپنے آپ کو خطرہ میں پایا تو تلوار سونت کر باہر نکل آئی اور گرج کر کہا

"شریف حسین! اگر مرد ہو تو مقابلہ پر آؤ"

شریف حسین نے کہا "بیگم، تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تم اس وقت میرے قبضہ میں ہو بہتر ہے کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو" یہ بات سُن کر بیگم کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے ایک ایسا تیر کھینچ کر مارا کہ وہ گھوڑے سے نیچے آ رہا۔

شریف حسین کی فوج نے ہر طرف سے بیگم کو گھیر لیا۔ بیگم کی موت یقینی تھی مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح حملے کو روکتی رہی ——— عین اس وقت جب تلوار چلاتے چلاتے بیگم کے بازو شل ہو چکے تھے۔ اچانک شوروغل اٹھا، معلوم ہوا کہ تیموری فوج بیگم کی مدد کے لیے آپہنچی ہے۔ چند گھنٹوں کے مقابلہ کے بعد شریف حسین کی فوج بھاگ نکلی۔ شریف حسین مارا گیا اور بیگم فتح کے شادیانے بجاتی قلعے میں داخل ہوئی۔

جب تیمور کو فتح کی خبر ملی تو خوشی سے اس کے آنسو نکل آئے اور اس نے چلا کر کہا

"خدا کی قسم! حمیدہ بانو شیر دل ملکہ ہے۔ تیمور کے سوا اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا"[1]

---

[1] "سنگم اور سائے" مصنفہ عبدالقدیر، اٹک

نورجہان اور جہانگیر

"میں نے سلطنت نورجہان کے سپرد کردی ہے۔ مجھے سیر بھر گوشت اور سیر بھر
شراب کے سوا کچھ نہیں چاہیے"۔ ـــــــ (جہانگیر)

ہندوستان کی بیگمات میں نورجہان کو عالمگیر شہرت حاصل ہے، یہی وہ حسین و جمیل ملکہ ہے جس کے بانکپن اور عشوہ طرازیوں نے جہانگیر جیسے جلیل القدر تاجدار کو بھی اپنی بارگاہ میں جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نورجہان کے حسن و ناز، اس کے جلال و جمال، اس کی شان و شوکت اس کے علم و فضل اور اس کے عشق و محبت کی داستان نہ صرف دلکش اور دلچسپ ہے بلکہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز بھی ہے۔

نورجہان کا خاندان

نورجہاں کا دادا خواجہ محمد شریف خراسان[1] کے حاکم محمد خان تکلا کا وزیر تھا اس نے اپنے حسن تدبر اور اعلیٰ کارکردگی کے باعث بڑا نام پایا اور حاکم خراسان کی نظروں میں بڑی عزت حاصل کر لی چنانچہ حاکم نے سلطنت کے تمام امور اسی کے سپرد کر دیے۔ لیکن جب محمد خاں کا انتقال ہو گیا تو خواجہ محمد شریف ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کے ہاں ملازم ہو گیا، اس نے اسے مرو[2] کا گورنر مقرر کیا۔

خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے۔ آقا طاہر اور مرزا غیاث۔ یہی مرزا غیاث ہے جو نورجہان ملکہ ہند کا باپ تھا۔ نورجہاں کی ماں مرزا علاؤالدولہ کی بیٹی تھی جو اپنے وقت کے بڑے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔

---

[1] افغانستان کے مغرب میں ایران کا ایک صوبہ ہے۔ بعض مؤرخین نے محمد خان تکلو کو ہرات کا حاکم لکھا ہے۔ ہرات افغانستان کا بڑا شہر ہے جسے "ہندوستان کی کنجی" بھی کہتے ہیں۔ ہرات کی آبادی ۸۵ ہزار کے قریب ہے۔

[2] ترکمان کا ایک شہر جو آجکل روسی علاقے میں شامل ہے۔

مرو کی گورنری کے زمانہ میں خواجہ محمد شریف اور مرزا غیاث اپنے اہل و عیال کے ساتھ بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ امیری کے سب سامان موجود تھے۔ مرزا غیاث کے دو بیٹے اور ایک لڑکی تھی (نورجہان ابھی پیدا نہ ہوئی تھی) اور سب بڑے ناز و نعم سے پلتے تھے۔ مگر قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خواجہ محمد شریف کی آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ اس کے خاندان پر نحوست اور ادبار کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ اور چشم زدن میں خاندان کی کایا ہی پلٹ گئی۔

بربادی کا دور مرو کے علاقے میں سازشوں کے جال خواجہ محمد شریف کی زندگی ہی میں پھیل رہے تھے۔ خواجہ کی وفات پر سازشیوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ سازشیوں نے مرحوم گورنر کے خاندان کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ لوگ دراصل پرانے حکمران خاندان کے ہمدرد تھے اور شاہ طہماسپ کے خلاف تھے۔ چونکہ خواجہ محمد یوسف طہماسپ کے منظور نظر تھے۔ اس لیے مخالفوں نے ان کی وفات کے بعد تا طاہر اور مرزا غیاث کو ہدف ظلم بنایا۔ مرزا غیاث نے اپنے رفیقوں اور دوستوں سے مدد چاہی مگر سازشیوں نے ان کی بھی نہ چلنے دی اور بالآخر مرزا غیاث کو وطن سے نکلنا پڑا۔

مرزا غیاث کو سوائے تن کے کپڑوں کے کچھ ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی تھی انہوں نے ہر چند التجا کی کہ راستے کی ضرورت کے لیے چند چیزیں اور روپیہ ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے مگر دشمنوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ مرزا غیاث کی بیوی حمل کے آخری دنوں سے تھی۔ ظالموں نے اس کی حالت پر بھی رحم نہ کیا اور مرزا غیاث کو حکم دیا کہ وہ فوراً ہندوستان کی طرف چلا جائے۔

میرزا غیاث نے امیری میں پرورش پائی تھی۔ اس کی بیوی اور بچوں نے ساری زندگی آسائش و آرام سے بسر کی تھی۔ سواری کے سوا کبھی پا پیادہ چلنے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی، ہر وقت نوکر چاکر اور خدمتگار حاضر رہتے تھے مگر آج یہ عالم تھا کہ ایک پائی تک پاس نہ تھی۔ نہ کوئی سامان تھا اور نہ کپڑے۔ اس کس مپرسی کے عالم میں تین بچوں اور حاملہ بیوی کے ساتھ مرو سے روانہ ہو رہا تھا۔ منزل کا بھی کوئی پتہ نہ تھا۔

مظلوم قافلہ بے کسوں کا یہ مختصر قافلہ جب اپنے گھر سے نکلا تو ان کی تلاشی لی گئی۔ اگر کوئی شے نکلی بھی تو وہیں رکھوالی گئی۔ مرزا، اس کی بیوی اور تینوں بچے آنکھوں میں آنسو لیے شہر سے چلے اور جنگل کا رخ کیا۔ بعض لوگوں کو مرزا غیاث کے خاندان پر رحم آرہا تھا مگر شقی القلب انسانوں کے اقتدار کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے اور کوئی ان کی مدد کے لیے قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ جب یہ لوگ شہر سے خاصی دُور چلے گئے تو ایک نیک دل انسان نے ان کا پیچھا کیا اور کچھ روپیہ اور سواری کے لیے ایک گھوڑا مرزا کے حوالے کرتے ہوئے اُسے ہدایت کی کہ جلد از جلد مرو کی سرحد سے پار ہو جائے ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کو اس مدد کا پتہ چل جائے ورنہ اور مصیبت آئے گی۔

مرزا نے اتنی مدد کو ہی غنیمت جانا۔ حاملہ بیوی کو گھوڑے پر سوار کرایا، خود بچوں کی انگلیاں پکڑیں اور ساتھ ساتھ پیدل روانہ ہوا ؎

رواں ہے ایک عجب رُو میں رہروِ امروز
کبھی خیال میں فردا، کبھی نگاہ میں دوش

راستہ پہاڑی تھا، نشیب و فراز کے باعث نہ گھوڑے سے ٹھیک طرح چلا جا تا تھا اور نہ مرزا اور اُس کے بچے آسانی سے قدم اٹھا سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے دو چار میل کا فاصلہ طے کیا، وہ شہر سے نکل کر ویران سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ دُور دُور تک چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آدمی تو کیا جانوروں کا نام و نشان نہ تھا وہ پھر ڈھل چکی تھی، وہ بہت تھک چکے تھے۔ بالآخر ایک جگہ قیام کیا۔ رات آئی، جنگلی جانوروں کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ بچے تھک ہار کر زمین پر سو گئے۔ غیاث کی مصیبت زدہ بیوی بھی ایک طرف پڑ رہی۔ کھانے کو تھوڑا بہت جو ساتھ تھا اُسے کھانے سے گریز کرتے رہے تاکہ پھر کام آئے۔ خدا جانے کھانا ختم ہونے پر راستے میں کہیں سے ملے یا نہ ملے۔

المناک منظر دن کی روشنی نظر آئی تو یہ مصیبت زدہ قافلہ پھر روانہ ہوا۔ غیاث اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بچوں کی مصیبت ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ بیچارے باپ کی انگلی پکڑے روتے چلے جا رہے تھے۔ ادھر ماں کی حالت بھی دیکھی نہ جاتی تھی

عجب ماتمی نظر تھا۔ چلنے سے بچوں کے پاؤں زخمی ہو رہے تھے، وہ رک رک کر قدم اٹھاتے تھے۔ کہیں کہیں دم لینے کے لیے تھوڑی دیر رک جاتے پھر چلنے لگتے۔ غرض کئی منزلیں اسی طرح طے ہوئیں۔ یہاں تک کہ کھانے کی سب چیزیں ختم ہو گئیں اور جو روپیہ پاس تھا وہ بھی صرف ہو گیا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ "سات وقت صاف کڑاکے کے گزر گئے تھے جن میں ایک کھیل کا دانہ بھی اُڑ کے منہ میں نہ پڑا تھا۔ سنسنیوں پر سنسنیاں آ رہی تھیں اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کلیجہ بیٹھا چلا جاتا تھا اور بھوک سے ایک عجیب کیفیت تھی۔ کوئی گھر ان کے لیے نہ تھا کہ موسم کی ناملائمت سے اس میں پناہ لیتے اور کوئی ایسا ہاتھ نہ دکھائی دیتا تھا، جو انھیں اس بھوک کی سختی سے نجات دیتا۔ اگر یہاں سے ایران جاتے ہیں، تو ناممکن ہے اور جو آگے بڑھتے ہیں تو یقینی بربادی معلوم ہوتی ہے۔ یہ آفت، بھوک، ماندگی، خوف، ناامیدی۔ اور پھر قندھار میں مرزا غیاث کی بیوی کو درد لگے۔ تین دن اور دوپہر ہو گئے تھے کہ ایک چنے کا دانہ یا سوکھا ٹکڑا بھی نہ دکھایا تھا۔ اب وہ مصیبت زدہ خاتون درد میں لوٹ رہی تھی۔

نور جہان کی ولادت تین پہر کامل جانکنی کے بعد نور جہان پیدا ہوئی۔ اب خدا کے دین کو کیا کرتے۔ مجبوراً وہ زمین سے اٹھالی گئی۔ باپ نے اپنی گود میں ٹیاں ٹیاں کرتی ہوئی خوبصورت بچی کو لے کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ آسمانی نیلی چھت پر اپنی پُرنم آنکھیں اٹھائیں حسرت ناکی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سناٹے میں رہ گیا۔

اس فاقہ کشی اور تکان پر لڑکی چونچال موٹی تازی پیدا ہوئی۔ ادھر اپنی بے سروسامانی اور اُدھر شفقت پدری کا امنڈتا ہوا جوش دونوں دست و گریبان ہونے لگے۔

چاروں طرف ہلاکت زدہ امیر زادہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی مسافر کسی طرف سے آتا ہو مگر دُور دُور پرندے کی بھی پھڑپھڑاہٹ نہ معلوم ہوتی تھی۔ شام ہوتی جا رہی تھی اور سنسانی کی سلطنت کو وسعت ہو رہی تھی، ڈراؤنی شب کی بھیانک صورت دہشت انگیز لباس میں معلوم ہونے لگی تھی۔ یہ مقام وحشی درندوں کا بازگشت بنا ہوا تھا۔ نہ یہاں رہ سکتا ہے نہ کوئی تدبیر کر سکتا ہے۔ عجب کشمکش میں بچارے کی ستم رسیدہ جان پھنس گئی۔

ماں باپ کی بے چارگی

اسی مایوسی اور پریشانی کی حالت میں جھرجھری آواز سے مرزا نے اپنی بیوی سے دریافت کیا۔ اب کیا کروں تمھاری کیا صلاح ہے۔ کمزور فاقہ زدہ خاتون نے ہر چند جواب دینا چاہا مگر اس کی زبان نہ اٹھی کہ اپنے دل کا حال کہتی۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور خاموش ہو رہی، آنسوؤں کی قطار آنکھوں سے بہ رہی تھی۔ دھیمی دھیمی سسکیاں لے رہی تھی اور خاموش تھی۔ ان کے مجروح اور خستہ خیالات شکستہ پر پرند کی طرح بلند پروازی کرنا چاہتے تھے مگر پھڑپھڑا کے نیچے آ پڑتے تھے۔ آخر صبر کی وزنی سل چھاتی پر رکھے۔ میرزا غیاث اُٹھ بیٹھا۔ اپنے کپڑے سے جو وہ سر پہ باندھے تھا اپنی بیوی کی کمر باندھی اور تھکے ہوئے بھوکے پیاسے گھوڑے پر اُسے بٹھا دیا۔ پیچھے اپنی خورد سال لڑکی بٹھائی۔ بیٹوں کی انگلی پکڑی اور اب چلنے کی تیاری کی۔

بچی سپردِ خدا

یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اس نازک حالت میں اس نوزائیدہ بچی کو بھی سنبھال سکتا۔ باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا بہت کچھ اس نوزائیدہ معصومہ کو ہمراہ لے چلنے کی سفارش کر رہی تھی مگر موجودہ ناگفتہ بہ حالت کامیابی سے شفقت اور مامتا کی مستحکم قوتوں کو شکست دے رہی تھی۔ بڑی دیر کے جھگڑے کے بعد مؤخر الذکر کو کامیابی ہوئی اور وہ امید کے چمنستان کے نونہال کو وہیں تنہا چھوڑنے پر رضامند ہوئے۔

ادھر اُدھر سے پتے جمع کیے اور اس چمکتے ہوئے آفتاب کو ان سے ڈھانکا اور ایک درخت کے نیچے رکھ دیا، اور وہاں سے محزون و ملول والدین خاموشی سے سسکیاں لیتے اور روتے ہوئے آگے بڑھے۔

مٹیلڈا بیتم[1] لکھتا ہے کہ یہ تین دن سے بھوکے پیاسے تھے۔ اب ان کی مصیبت کی تکمیل کرنے کے لیے ان کے ہاں لڑکی بھی پیدا ہو گئی۔ دُور دُور کسی مسافر کا پتہ نہ تھا۔ رات

---

[1] BIOGRAPHICAL DICTIONARY OF THE CELEBRATED WOMEN OF EVERY AGE & COUNTRY P.541, 542.

بھاگوں بھاگ چلی آ رہی تھی۔ جنگلی درندوں کا بھی خطرہ پیدا ہو رہا تھا۔ ناچار میرزا غیاث نے اپنی بیوی کو گھوڑے پر بٹھایا اور بمشکل اپنے قدم اٹھاتے جو بالکل شل ہو چکے تھے اور ناطاقتی کے باعث چلتے وقت تھرتھراتے تھے۔ بچی کا لے چلنا ناممکن معلوم ہوتا تھا ماں میں بھی اتنی قوت نہ رہی تھی کہ وہ بغیر کسی سہارے کے گھوڑے کی پیٹھ پر قائم رہ سکتی۔ درمندی اور ضرورت میں بہت دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر ضرورت غالب آئی اور اپنی معصوم بچی کو بلند راستہ پر ڈال دینے کے لیے راضی ہو گئی۔

بچی کو پتوں میں لپیٹ کر درخت کے نیچے رکھ دیا اور آپ آزردہ دل روتے ہوئے آگے کی طرف روانہ ہوئے مگر جب وہ اس درخت سے جہاں انھوں نے اپنی معصوم بچی کو رکھا تھا قریباً ایک میل نکل گئے اور اب تک ممتا بھری ماں برابر اس درخت کی طرف گردن موڑ موڑ کر تک رہی تھی۔ یکایک اس کے دل پر اور بھی غم کا بھالہ لگا۔ وہ یہ کہتی ہوئی گھوڑے پر سے گر پڑی میری معصوم بچی! میری معصوم بچی! گر کر خاتون نے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکی۔ بیوی کی اس حالت نے غیاث کے دل کو بھی مسوس لیا۔ اس نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور وعدہ کیا کہ ابھی تیری لختِ جگر کو لا کر تیرے کلیجے سے لگا دیتا ہوں۔

خوفناک منظر یہ کہہ کر وہ اس درخت کی طرف واپس پھرا اور جونہی اس کی نظر اپنے کلیجے کے ٹکڑے پر پڑی، وہ خوف کے مارے کانپ اٹھا۔ اس نے ایک سیاہ سانپ کو اپنی بچی کے گرد حلقہ کیے ہوئے دیکھا۔ غیاث کو یقین ہو گیا اگر میں نے ذرا بھی تساہل کیا تو یہ ظالم اسے کھا لے گا۔ وہ فوراً غل مچاتا ہوا دیوانہ وار سانپ پر جھپٹا۔ سانپ اچانک غل کی آواز سن کر خوفزدہ ہو گیا اور سیدھا درخت کے خالی تنے میں چلا گیا۔ اس نے اپنی لڑکی کو صحیح و سالم اٹھا لیا اور لا کر ماں کی چھاتی سے لگا دیا۔ اور اس حیرت انگیز واقعہ کی ساری کیفیت بیان کر دی۔

اس اثنا میں چند مسافر بھی مل گئے جنھوں نے انھیں ان کی تمام ضرورتوں سے پورا سبکدوش کیا۔ وہ رفتہ رفتہ لاہور پہنچے جہاں شہنشاہ اکبر اس زمانہ میں موجود تھا۔ مرزا غیاث کی خوش قسمتی نے اس کی استمداد کی۔ میرزا شہنشاہی خواجہ سرا سے دور کا رشتہ

رکھتا تھا جس نے سفارش کر کے غیاث کو شہنشاہ کا سیکرٹری بنا دیا اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ غیاث اپنی قابل توصیف قابلیتوں اور اعلیٰ درجہ کی لیاقتوں سے وزیر خزانہ کے عہدے تک جا پہنچا[1]"

دن پھرتے ہیں میرزا غیاث کی رسائی اکبر کے دربار میں ہو گئی۔ مرزا بڑا صاحب کمال آدمی تھا۔ اس نے اچھے گھرانے میں اچھی تعلیم پائی تھی۔ بعض خداداد خوبیوں کا بھی مالک تھا۔ اعلٰے درجے کا شاعر بھی تھا۔ شاہی دربار میں اُسے اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقع ملا چنانچہ اکبر اس کے کمالات سے بہت متاثر ہوا اور جلد ہی مرزا غیاث اور اس کی بیوی شاہی گھرانے میں مقبول ہو گئے اور میرزا کی بیوی شاہی محلات میں آنے جانے لگی۔ بیگمات سے اس نے راہ و رسم پیدا کر لیے۔ شوہر کی طرح وہ بھی شاعر تھی اور مصوری میں مہارت رکھتی تھی۔ چنانچہ بیگمات اسے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ نور جہان بھی سیانی ہوتی جارہی

---

[1] ایلفنسٹن کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے وہ اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھتا ہے کہ سختی میں مبتلا ہو کے میرزا غیاث ایک کارواں کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ معہ اپنی بیوی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے قندھار پہنچا تو اور زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ قندھار پہنچتے ہی میرزا غیاث کی بیوی کے ہاں نور جہاں پیدا ہوئی اور آفت ناک حالت میں جس میں وہ مبتلا تھے، اپنی بچی کی آسائش کا سامان نہ کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے آئندہ شہنشاہ بیگم اس سڑک پر چھوڑ دی گئی جہاں سے دوسرے دن صبح کو قافلہ گزرنے والا تھا۔ کاروان کے ایک دولت مند سوداگر کی نگاہ اس بچی پر پڑی۔ محبت اور رحم سے اس کا دل پگھل گیا۔ لڑکی کی خوبصورتی اور بھولا پن اسے دل سے بھا گیا۔ اس نے اس معصوم بچی کو اٹھا لیا اور ارادہ کیا کہ اس کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کرے گا۔ اب مشکل یہ تھی کہ کارواں میں دودھ پلانے کے لیے کوئی انّا نہ ملتی تھی۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ شاید اس (نور جہاں) کی ماں ہی بطور انا کے دودھ پلانے کے لیے تجویز کی گئی ہوگی۔ اور اس طرح سے سوداگر کی توجہ اس کنبہ کی مصیبت پر یوں مبذول ہوئی ہوگی جس نے انھیں ان کی ضرورتوں سے سبکدوش کر دیا اور اپنے تجارتی کام میں انھیں شریک کر کے ان کی قسمتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ اسی تاجر کے وسیلہ سے اکبر کے دربار تک ان کی رسائی ہو گئی تھی

(باقی اگلے صفحہ پر)

تھی، وہ بھی ماں کے ساتھ محل میں آنے لگی، پھر ماں بیٹی یہیں رہنے لگے۔ نورجہان کو اس وقت مہرالنساء کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اکبر کے حکم سے محلات ہی میں نورجہان کی تربیت ہونے لگی۔ جہانگیر ان دنوں شہزادہ سلیم کے نام سے مشہور تھا اور اکبر کے بعد وہی سلطنت کا ولی عہد تھا۔

نورجہان بلا کی حسین تھی۔ حسن کے علاوہ ذہانت، مروت اور سادگی کے اوصاف سے بھی مزین تھی۔ جب بلوغت کو پہنچی تو اس کے جوہر ایک ایک کرکے نکھرنے لگے۔ سلیم کی والدہ کو اس سے بڑی محبت تھی۔ اور ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اس اثنا میں کبھی کبھی سلیم بھی وہاں آیا کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ناآشنا رہے۔

رومانی حادثہ | مہرالنساء اور سلیم کی محبت کے بارے میں ایک داستان مشہور ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ایک دن مہرالنساء مینا بازار میں پھر رہی تھی کہ جہانگیر بھی اس طرف آنکلا۔ وہ ان دنوں شہزادہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو کبوتر تھے۔ وہ پھول توڑنا چاہتا تھا، چنانچہ مہرالنساء سے مخاطب ہوکر کہا کہ "ذرا ان کبوتروں کو تو پکڑلو۔ میں پھول توڑلوں" مہرالنساء نے کبوتر پکڑ لیے۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر اس کے ہاتھ سے اڑگیا۔ جب شہزادہ واپس آیا تو پوچھا میرا کبوتر کیا ہوا۔ مہرالنساء نے جواب دیا وہ تو اڑگیا۔ پوچھا کس طرح۔ اس نے دوسرا بھی اڑادیا اور کہا "حضور! اس طرح"۔ مہرالنساء کے بھولے پن کی یہ ادا جہانگیر کو بھا گئی اور اس کے بعد سے جہانگیر مہرالنساء کی طرف مائل ہونے لگا۔[۱]

نہیں کہا جاسکتا کہ اس بارے میں نورجہان کا رویہ کیا تھا، اس لیے کہ تاریخوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ نورجہان بھی جہانگیر سے محبت کرنے لگ گئی

(بقیہ سابقہ) پہلے وہ ادنیٰ عہدہ پر مقرر ہوئے اور بعد ازاں اپنی قابلیت سے اعلیٰ مراتب پر پہنچ گئے۔ مارشمین، ویلر اور سٹوارٹ وغیرہ کئی دوسرے مصنفوں نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

[۱] بعض سوانح نگار اس واقعہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ تخت نشینی سے قبل جہانگیر نے نورجہان کو دیکھا ہی نہ تھا چنانچہ اسیر علی قلی خان کے قتل کا الزام غلط ہے۔ یہ تفصیلات آگے آئیں گی۔

تھی، تاہم جہانگیر نورجہان کے عشق میں پھنسنے لگا۔ یہاں تک کہ یہ بات پوشیدہ نہ رہی اور اکبر کے علم میں آگئی۔

اکبر کو بیٹے کا یہ انتخاب پسند نہ تھا۔ اس نے اس رومان کو ختم کرنے کے لیے نورجہان کو بیاہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ نورجہان کے والدین سے مشورہ کرنے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد علی قلی خان اور نورجہان کی شادی کر دی۔

علی قلی خان | علی قلی خان بہت بہادر، وجیہہ اور جوانمرد شخص تھا۔ فنِ سپاہگری اور پہلوانی میں خاص دسترس حاصل تھی۔ شاہ اسمٰعیل ثانی نے اس کی تربیت کی تھی۔ مروجہ علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ نہایت قوی اور شکیل تھا، قد لمبا، سینہ چوڑا، بازو چوڑے اور سڈول اور بدن کسرتی تھا۔ چہرے پر سرخی ہویدا تھی۔ خشخشی داڑھی اور سر کے بال لمبے تھے بڑا ہنس مکھ اور خوش طبع شخص تھا۔ ابتدا میں شاہ ایران کے نعمت خانہ کا داروغہ تھا۔ پھر جب بادشاہ کی وفات کے بعد ملک میں انقلاب آیا تو یہ ہندوستان چلا آیا۔ اصل وطن عراق عجم تھا۔ ہندوستان پہنچنے پر مرزا عبدالرحیم خانِ خاناں سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھ اسے بھی جنگ میں شریک کر لیا۔ علی قلی خان نے وہ مردانگی اور بہادری دکھائی کہ خانِ خاناں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ جب دربار میں واپس آیا تو اُسے بھی ساتھ لے آیا اور اکبر سے متعارف کرایا۔

اکبر مردم شناس تھا۔ اُسے نورجہاں کے رشتہ کے لیے یہی نوجوان پسند آیا۔ شادی کے وقت علی قلی خاں کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ شادی کے بعد اکبر نے اُسے بردوان کا صوبہ دار بنا کر بنگال بھیج دیا۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ جہانگیر کے لیے یہ ایک المناک سانحہ تھا۔ مگر اکبر کے ڈر سے وہ کچھ نہ کر سکا اور خاموش رہا۔

سلگتی چنگاری | اکبر کی وفات کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ اب مہرالنساء کے عشق کی چنگاری اس کے دل میں دوبارہ سلگنے لگی۔ شہنشاہیت کے زعم میں اب وہ نورجہان کو حاصل کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے علی قلی خاں کو قتل کرانے کی تجویز سوچی۔ مگر چاہتا تھا کہ یہ قتل اس طرح سے ہو کہ جہانگیر پر اس کا شبہ نہ کیا جائے

شیر افگن علی قلی خان کی دلیری اور بہادری ضرب المثل تھی۔ چنانچہ یہی آڑے کر جہانگیر نے ایک مست اور خونی ہاتھی سے اُسے لڑا دیا۔ مگر علی قلی خاں اپنی ہمت سے بچ گیا۔ دوبارہ اُسے ایک شیر سے لڑایا گیا۔ اُس نے بڑی بہادری اور صفائی سے شیر کو چیر کر رکھ دیا، جس سے جہانگیر کے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ اگرچہ علی قلی خاں کا یہ کارنامہ جہانگیر کے لیے رنج کا باعث تھا۔ تاہم مجبوراً اُسے "شیر افگن" کے خطاب سے نوازا۔ پھر اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

شیر افگن کا قتل مؤرخین لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے قطب الدین اپنے کوکہ کو بنگال کا صوبیدار مقرر کر کے بھیجا، اور اشارہ کر دیا کہ جس طرح بھی ہو شیر افگن کا کام تمام کر دیا جائے قطب الدین نے وہاں پہنچ کر شیر افگن کے آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ شیر افگن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اُسے جوش آگیا اور تلوار سونت کر حملہ آور ہوا۔ کوکہ مارا گیا۔ مگر کوکہ کے ساتھیوں نے شیر افگن کو بھی قتل کر ڈالا۔

جہانگیر نے شیر افگن پر بغاوت کا الزام لگا کر سرکاری قانون کے مطابق اس کے خاندان کو نظر بند کر دیا۔ چنانچہ نور جہاں شاہی قیدیوں کی طرح آگرہ آئی۔

ملکہ نور جہاں کہا جاتا ہے کہ کچھ مدت بعد جہانگیر نے نور جہاں کو شادی کا پیغام بھیجا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ جہانگیر نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ نور جہاں کو شادی کے لیے مجبور کرے۔ چنانچہ کامل چار سال کے بعد نور جہاں شادی پر آمادہ ہوئی اور مہرالنساء سے نور محل پھر نور جہان بن کر جہانگیر کے پہلو میں بیٹھی ؎

مدتوں دکھ سہے، بجا لیکن — دیکھ کتنا حسین ہے اپنا مال

نور جہاں کے ساتھ جہانگیر کے عشق اور شیر افگن کے قتل کے بارے میں غلام رسولؐ مہر لکھتے ہیں کہ "بنگال اگرچہ ۱۵۷۶ء میں فتح ہو چکا تھا، لیکن وہاں پورا امن قائم نہیں ہوا تھا، فتنوں کا بڑا سبب یہ تھا کہ پانی پت کی پہلی جنگ کے بعد افغان سردار سمٹ کر اس علاقے میں جمع ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے قطب الدین خان کوکہ کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا اور

لہ تاریخ پاکستان و ہند مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ص ۳۰۶ تا ۳۰۸

تاکید کردی کہ تمام فتنہ انگیزیوں کو سختی سے دبا دیا جائے وہاں کے جاگیرداروں میں ایک علی قلی استاجلو بھی تھا۔ اکبر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا۔ اچھی ملازمت مل گئی اور مرزا غیاث بیگ کی بیٹی مہر النسا سے شادی ہو گئی۔ شہزادگی کے زمانے میں علی قلی کچھ مدت جہانگیر کے پاس بھی رہا۔ ایک شیر کو مار کر شیر افگن خطاب پایا۔ جہانگیر نے اسے بردوان میں جاگیر دے دی۔ وہ بے چین طبیعت کا آدمی تھا۔ بنگال کی فضا سرکشی سے بھری ہوئی دیکھی تو خود بھی سرکشی کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کے رنگ ڈھنگ کی اطلاعیں دربار میں پہنچ چکی تھیں۔

قطب الدین خان کو بنگال میں بھیجتے وقت جہانگیر نے تاکید کردی تھی کہ شیر افگن کے خلاف جو شکایتیں ہیں ان کی چھان بین کی جائے اور درست ثابت ہوں تو اسے دربار میں بھیج دیا جائے۔

قطب الدین خان چند آدمیوں کو لے کر بردوان گیا تو شیر افگن بڑا پریشان ہوا غالباً اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اب سارے بھید کھل جائیں گے۔ قطب الدین خان نے کوئی سختی نہیں کی تھی۔ اُسے الگ لے جا کر باتیں کر رہا تھا۔ شیر افگن نے پہلے سے اپنے دل میں ایک منصوبہ بٹھا رکھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے تلوار کھینچ کر قطب الدین کے کاری زخم لگایا۔ خان کے آدمی دور کھڑے تھے، دوڑ کر شیر افگن پر حملہ آور ہوئے۔ ان میں سے بھی ایک مارا گیا اور شیر افگن بھی قتل ہو گیا۔

قطب الدین خان نے چند گھنٹے بعد وفات پائی۔ جہانگیر کو بے حد قلق ہوا وہ خود لکھتا ہے کہ اکبر کی وفات کے بعد مجھے سب سے بڑھ کر رنج قطب الدین خان اور اس کی والدہ کی وفات پر ہوا۔

شیر افگن کی بیوی مہر النساء کو لڑکی سمیت آگرے بھیج دیا گیا۔

شیر افگن کی بیوی مہر النساء آگرے پہنچی۔ جہانگیر کی والدہ نے اُسے اپنے پاس ملازمت دے دی۔ اس واقعہ پر پانچ برس گزر گئے۔ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے جشن کے موقع پر اُسے دیکھا، تو شادی کا فیصلہ کر لیا۔ شادی کے بعد پہلے نور محل، پھر نور جہاں خطاب دیا اور وہ

اسی وقت سے جہانگیر کے عہد کی سب سے ممتاز شخصیت بن گئی۔ یہاں تک کہ آج جہانگیر کے بغیر نورجہان اور نورجہان کے بغیر جہانگیر کا تصور بھی مشکل ہے۔

شادی کے وقت نورجہان کی عمر چونتیس برس کی تھی۔ جہانگیر اس سے آٹھ برس بڑا تھا اس سلسلے میں عجیب و غریب افسانے مشہور ہو گئے، لیکن جن مؤرخوں نے سارے حالات کی چھان بین کی ہے ان کا فیصلہ یہ ہے کہ سنہ ۱۶۱۱ء سے پہلے جہانگیر نے نورجہان کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر وہ شہزادگی کے زمانے میں اس سے شادی کرنا چاہتا تو اکبر خوشی سے اجازت دے دیتا۔ اس لیے کہ نورجہان کا باپ میرزا غیاث بیگ ایران کے اونچے گھرانے کا آدمی تھا اور ایرانیوں کو ویسے بھی تہذیب میں بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔

شیر افگن شادی کے بعد تقریباً تین برس جہانگیر کے پاس رہا بلکہ اُسے شیر افگن کا خطاب بھی جہانگیر ہی نے دیا تھا۔ اگر شہزادگی کے زمانے میں نورجہان سے جہانگیر کی محبت میں کچھ صلیت ہوتی تو شیر افگن کو ہرگز جہانگیر کے پاس نہ رکھا جاتا۔

نورجہان میدانِ سیاست میں

جب نورجہان ملکۂ ہند بن گئی تو اس کے خاندان کی قسمت جاگ اٹھی اس کے باپ میرزا غیاث کو اعتمادالدولہ کا خطاب ملا۔ جہانگیر کا مشیرِ خاص بن گیا۔ بیگم کے بھائی ابوالحسن کو آصف جاہ کا خطاب ملا۔ وہ بھی بادشاہ کا معتمد بن گیا اس کی بیٹی ارجمند بانو بیگم کی شادی شہزادہ خرّم سے ہو گئی جو جہانگیر کا تیسرا بیٹا اور سب سے قابل تھا۔ اسی کو ولی عہد بننا تھا چنانچہ بعد میں شاہجہان کے لقب سے بادشاہ بنا۔ غرض حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر نورجہان کے ہاتھ آ گئی۔ جدھر چاہتی اُسے موڑ دیتی تھی۔ خود جھروکے میں بیٹھ کر احکام صادر کرتی اور تمام منصب دار اپنی اپنی عرضداشتیں پیش کرتے۔

میرزا غیاث بیگ کی زندگی میں نورجہان اور اس کے بھائی آصف جاہ میں اتفاق رہا مگر باپ کے مرتے ہی دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ نورجہان نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم[1] کی شادی جہانگیر کے سب سے چھوٹے فرزند شہریار سے کر دی تھی، اور

---

[1] نورجہان کی یہ بیٹی شیر افگن سے تھی۔

چاہتی تھی کہ شہریار ہی ولی عہد بنے۔ چنانچہ بہن بھائی اپنی اپنی بیٹیوں کو تخت دلانے کے لیے کوشش کرنے لگے۔

نورجہان نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ خرم کے لیے دو ہی راستے باقی رہ گئے یا تو تخت سے محروم ہونا قبول کر لے یا میدانِ جنگ میں نکل آئے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

شہزادہ خرم سے جنگ

شہزادہ خرم نے بغاوت کر دی مگر شکست کھائی اور دکن چلا گیا۔ پھر بہار پہنچا اور رہتاس کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ الہ آباد کے شاہی افسروں نے دبایا تو پھر دکن آگیا۔ ناامید ہو کر باپ سے معافی چاہی۔ باپ نے اس شرط پر معافی دی کہ قلعے واپس کر دے اور اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو دربار میں یرغمال کے طور پر بھیج دے۔ تیسرا بیٹا شجاع پہلے سے جہانگیر کے پاس تھا۔ شہزادہ خرم نے یہ شرطیں قبول کر لیں اور ناسک چلا گیا۔

نئی آفت

خسرو مر چکا تھا۔ اب صرف پرویز باقی رہ گیا تھا اور اس کے لیے ولی عہدی کے امکانات موجود تھے۔ چنانچہ نورجہان نے اس کانٹے کو بھی راستے سے ہٹانا چاہا۔ پرویز برہان پور میں تھا۔ سلطنت مغلیہ کا سب سے مشہور سپہ سالار مہابت خان اس کے پاس تھا۔ وہ پہلے ہی سے نورجہان کے اقتدار کے خلاف تھا۔ چنانچہ نورجہان کو ایک نئی افتاد کا سامنا کرنا پڑا۔

مہابت خان کا ہنگامہ

مہابت خان کابلی سردار تھا۔ بہت بہادر اور ہوشیار فوجی افسر تھا۔ وزیر سلطنت آصف جاہ اور مہابت خان میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی، کیونکہ مہابت خان نے جہانگیر کی طرف سے شہزادہ خرم کے مقابلہ میں وفاداری اور جوانمردی کے خوب جوہر دکھائے تھے۔

نورجہان نے پرویز اور مہابت خان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرنے کے لیے حکم بھیجا کہ مہابت خان یا تو بنگال چلا جائے یا دربار میں چلا آئے۔ اس کے خلاف بعض الزامات تیار کر لیے گئے۔

مہابت خان اپنی شہ زوری اور جوانمردی کے سامنے آصف جاہ اور ملکہ دونوں کی

کوئی حیثیت نہ سمجھتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ پیغام دراصل اُسے ذلیل کرنے کا ایک طریقہ ہے چنانچہ وہ چار ہزار راجپوتوں کو جو اس کے نام پر سر کٹانے کو تیار تھے ساتھ لے کر برہان پور سے روانہ ہوا۔ جہانگیر ان دنوں کشمیر سے واپس ہو کر کابل جا رہا تھا، اور دریائے جہلم پر خیمہ زن تھا۔ تمام مال و اسباب، فوج اور افسر دوسرے کنارے پر تھے۔ بادشاہ دوسرے کنارے پر جانے ہی والا تھا کہ مہابت خان فوج لیے آپہنچا۔ اس نے دو ہزار سپاہیوں کو پُل پر کھڑا کر دیا کہ کسی کو گزرنے نہ دیں پھر بادشاہ کے خیمے کو گھیر لیا اور سواروں کے ساتھ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ حرم سرائے میں غل مچ گیا، بادشاہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ پوچھا مہابت خان کیا کہتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے جان بچا کر حضور کی پناہ میں آیا ہوں، بعد اس کے تین دفعہ تصدق ہوا اور اسی وقت پالکی اپنے سپاہیوں سے اٹھوا کر کندھا دیتا ہوا اپنے خیمہ میں لے گیا۔ نذریں دلوائیں اور بیٹوں کو تصدق کیا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ چال چوک گیا۔ بیگم کو ضرور لینا تھا۔ چنانچہ پھر بادشاہ کو سوار کر کے لایا مگر وہ اتنے عرصے میں پار اتر گئی تھی۔ ناچار شہریار کے پکڑنے کا خیال ہوا اس کے ڈیرہ میں آیا اور وہیں بادشاہ کو اتارا۔

اُدھر بیگم نے پار جا کر بھائی کے ساتھ تمام سرداروں کو بہت لعنت ملامت کی اور فوج کو تیار کیا۔ یہاں بادشاہ کو بیگم یاد آئیں۔ اور ہر چند حکم پہنچے کہ خبردار لڑائی کا ڈھنگ نہ ڈالنا مگر وہ باز نہ آئی۔

پہلے دن ایک سردار فوج لے کر اترا اور ناکام پھرا۔ دوسرے دن آپ ایک ہودج میں بیٹھی۔ شہریار کی چھوٹی سی بیٹی کو گود میں لے اور دو خواجہ سراؤں کو آگے پیچھے بٹھا کر سب سے پہلے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا اور فوج کو پایاب اتار کر میدان گرم کیا۔ بہت ترکش تیروں کے آپ خالی کیے۔ آخر ہزاروں آدمی ضائع ہوئے۔ لڑکی گود میں زخمی ہوئی اور بیگم خود اس کا بازو باندھتی ہوئی پار اتر گئی۔

نورجہان کے منحوس دن اُدھر مہابت خان سجدہ کر کے بادشاہ کے تصدق ہوتا تھا مگر قید

کرر کھا تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ دو تین دن کے بعد قول و قسم کر کے بیگم کو بلایا، لیکن الگ خیمے میں اتار کر قید کر دیا۔ اور جبراً و قہراً بادشاہ سے قتل کا حکم لکھوایا۔

بعد اس کے خواجہ سرائے کو بلایا اور بیگم کو پیغام موت سنایا۔ بیگم نے جب یہ حکم سنا تو ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ مگر تدبیر کے میدان میں ایک قدم نہ چوکی۔ نہایت بے پروائی سے کہا کہ خیر میرے مالک کا یہی حکم ہے تو ایسا مرنا مجھے جینے سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ اس کا دیدار دکھاؤ۔

مہابت خان نے بڑی تکرار سے مانا۔ مگر اس شرط پر کہ ملاقات میرے سامنے ہو۔ چنانچہ وہ نور جہان کہ جس کے پردے کے سامنے سے امرا دو زرار، پنجہزاری، ہفت ہزاری خلعت پہن کر چلے جاتے تھے نظر بندی کے خیمے سے سکھیاں سے ہٹ کر آئی۔ میلے کچیلے کپڑے چہرے پر ہوائیاں اڑتیں، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں پہنے، منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس انداز سے آکر کھڑی ہوئی کہ مایوسی اور بے اختیاری کی تصویر سامنے کھینچ دی۔

شاہی قیدیوں کی نجات

اس کی صورت دیکھتے ہی بادشاہ کا جگر پانی پانی ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ غرض مہابت خان کی منتیں کر کے جان بخشوائی اور تمام لشکر کابل روانہ ہو گیا۔

اب بیگم نے اندر ہی اندر پھر اپنے بندوبست شروع کیے۔ اُدھر آصف جاہ جو بھاگے ہوئے تھے وہ بھی صفائی کر کے آگئے۔ اور مہابت خان کی مہابت میں فرق آنے لگا۔ مگر راجپوت جنہیں سوا تلوار مارنے کے اور کسی بات کی عقل نہ تھی وہ بدستور زوروں پر چڑھے ہوئے تھے چنانچہ کابل میں ایک دن ان سے اور بادشاہی سپاہیوں سے کسی آپس کی بات پر تلوار چلی۔ کچھ تو ملک غیر تھا کچھ ہوا بدلی ہوئی تھی۔ غرض یہاں راجپوت کھنڈوں کھنڈت ہوئی بہت سے مارے گئے۔ اکثر بھاگ کر پہاڑوں میں ٹکرائے۔ بہتیرے خراسان و ترکستان میں غلام ہو کر بک گئے۔ مہابت خان کا زور اور بھی کم ہوا، اور نور جہان پھر اپنی چمک دمک دکھانے لگی۔ چنانچہ مہابت خان کو شاہجہان کی مہم کا بہانہ کر کے نکال دیا گیا کہ دشمن کے ہاتھ سے سانپ مرے اور دونوں طرف اپنا مطلب قائم رہے۔

جہانگیر کی موت

جہانگیر کشمیر کی سیر کو گیا ہوا تھا کہ وہاں اس کی طبیعت خراب ہوگئی پالکی میں لاہور روانہ ہوا۔ ۲۸۔اکتوبر ۱۶۲۷ء کو راستہ میں راجوری کے مقام پر وفات پا گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق لاش دریائے راوی کے کنارے نورجہان کے باغ میں دفن کی گئی۔

نورجہان کی بے نوری

جہانگیر کی وفات پر اس کی پیاری اور چہیتی بیوی ملکہ ہندوستان کی آنکھوں میں جہان تاریک ہوگیا۔ بھائی کی طرف سے جو باتیں خار کی طرح کھٹکتی تھیں اب نشتر بن کر چبھنے لگیں۔ مرد کے سامنے عورت ذات کی خواہ وہ کیسی ہی ہوشیار، مدبر اور چالاک کیوں نہ ہو، کیا پیش جا سکتی ہے۔ وہ آرزوئیں اور امیدیں جو شہریار کو تخت پر بٹھانے کے متعلق تھیں۔ تمام جاتی رہیں۔ اور اب تخت اور حکومت میں حصہ لینے کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئی۔ خفی خان جو عالمگیر کے زمانہ میں شاہی مورخ گزرا ہے۔ جہانگیر کے بعد نورجہان کی زندگی کی مختصر سی کیفیت ان حسرت ناک الفاظ میں تحریر کرتا ہے۔

شاجہان نے بادشاہ ہو کر پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر نورجہان کے لیے وقف کر دی اور نورجہان کی عزت اسی طرح قائم رکھی جس طرح اس کی ماں کی عزت کی جاتی ہے۔ ہاں ملکی معاملات میں نورجہان کو شاجہان نے کوئی حصہ نہ دیا۔

نورجہان کا ماتم

نورجہان نے رنگیلے شوہر کے بعد جواہرات، رنگین کپڑے، ہار سنگار اور تمام عیش و تفریح کے سامان ترک کر دیے ؎

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں

سوائے جہانگیر کے ورد و وظیفہ کے اور کوئی نام اس کی زبان پہ نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت اور ہر لحظہ پیارے خاوند کے ماتم میں گھُل گھُل کر جان دے دی۔ غرض جہانگیر کی وفات کے بارہ برس بعد کل دنیا کی حسین ملکہ چل بسی تھی۔ اور شاہدرہ (لاہور) میں اپنے خاوند کے قریب دفن ہوئی۔ یہ قبر نورجہان نے اپنی زندگی ہی میں بنوا رکھی تھی۔ نورجہان کے پاس ہی اس کا بھائی آصف جاہ، جہانگیر کا وزیر اعظم ایک ٹوٹے پھوٹے گنبد کے نیچے سویا پڑا ہے۔ اس سے تھوڑے

ہی فاصلے پر ہندوستان کا وہ مشہور شہنشاہ جس کے عشق و حکومت کے فسانے ہندوستان کے علاوہ سمندر پار یورپ تک مشہور ہیں۔ موت کی میٹھی نیند میں مست الست ہو کر دنیا و فیہا سے بے خبر ہے۔

نورجہان کی حاضر جوابی اور شاعری

نورجہان نہ صرف اعلیٰ درجہ کی مدبرہ اور منتظمہ تھی بلکہ نہایت ہی خوش مذاق، زندہ دل اور عالم فاضل خاتون تھی۔ شعر خود بھی کہتی تھی اور شاعروں کی قدر بھی کرتی تھی۔ ایک دن منہ پر نقاب ڈالے ہنستی بولتی مصاحبوں کے ساتھ باغ کی سیر کر رہی تھی کہ ایک شاعر نے جو باغ کے کنارے ایک کوٹھے سے اترا تھا اور جسے خبر نہ تھی کہ نورجہان یہی ہے بے تکلف یہ شعر پڑھا:

برقع بُرخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

نورجہان نے سُن کر حال دریافت کیا۔ پانچ سو روپیہ تو اسی وقت انعام دیا اور پھر بلا کر شعرائے دربار میں داخل کیا۔

سلیم شاعر نے ایک دفعہ یہ شعر پڑھا

ز شرم آب شدم کا ب را شکستی نیست
بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

نورجہان کی حاضر جوابی کے قربان جایئے فوراً مسکرا کر کہا کہ "یخ بستہ شکست" نورجہاں نے ایک دن طالب آملی سے کہ شعرائے دربار میں ملک الشعراء کے خطاب سے ملقب تھا کہا کہ حضور جہانگیر کی تعریف میں قصیدہ کہتے ہو، ہمارے لیے نہیں کہتے۔ اس حاضر جواب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ جسے دیکھتا ہوں اُس کی تعریف کیا کرتا ہوں۔

نورجہان کی بہادری

نورجہان گھوڑے پر خوب سواری کرتی تھی اور شکار تو ایسا کھیلتی تھی کہ جس کے نشانہ سے ہرن مارا تو کیا چیز ہے شیر و پلنگ کو پناہ نہ تھی۔ ایک دفعہ شیر کا شکار کیا تو کسی ظریف نے یہ شعر کہا جو دفعتہً عالم میں مقبولیت عام کا سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہوئے مشہور ہو گیا ؎

نورجہاں گرچہ بظاہر زن است
درصفِ مرداں زنِ شیر افگن است[1]

ایک دفعہ جہانگیر متھرا میں ایک فقیر کی زیارت کے لیے گیا جو جمنا کے کنارے پر مقیم تھا۔ فقیر سے ملنے کے بعد جہانگیر اپنے خیمہ میں واپس آگیا۔ چوبداروں نے اطلاع دی کہ پاس ہی جنگل میں ایک شیر ہے۔ نورجہاں کو شیر کے شکار کا شوق تھا، اُس نے جہانگیر سے شیر کا شکار کرنے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔

نورجہاں ہاتھی پر سوار ہو کر عماری میں بیٹھ کر جھاڑیوں میں پہنچی جہاں شیر چھپا ہوا تھا ہاتھی شیر کو دیکھ کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ مہاوت نے بڑی مشکل سے اُسے قابو میں کیا۔ نورجہاں کے برابر میں جہانگیر کا ہاتھی تھا۔ اس کے ساتھ میر زا رستم بیٹھا تھا جو نہایت بہادر اور اعلیٰ نشانے باز تھا۔

شیر دھاڑتا ہوا جھاڑی میں سے نکلا۔ نہایت خونخوار اور خوفناک تھا۔ جہانگیر کے حکم سے پہلے میر زا رستم نے گولی چلائی مگر نشانہ خطا گیا۔ دوسری گولی چلائی مگر یہ نشانہ بھی خطا گیا۔ تیسری بھی ناکام رہی۔ اب نورجہاں نے اسے نشانہ لگانے سے روک دیا اور ہاتھی کو آگے بڑھا کر شیر کے قریب ہوئی۔ شیر چاہتا تھا کہ جست کر کے نورجہاں پر آپڑے کہ نورجہاں نے پہلی گولی میں ہی اُسے ٹھنڈا کر دیا۔

دلدوز حادثہ نورجہاں کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی مشہور ہے جس میں جہانگیر کے عدل وانصاف[2] اور نورجہاں کی محبت کے درمیان ایک کشمکش نظر آتی ہے جو بڑے عجیب

---

[1] نورجہاں جہانگیر مصنفہ محمد دین فوق۔

[2] جہانگیر نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے زنجیر عدالت قائم کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔ جس کے متعلق وہ اپنی تزوک میں بھی لکھتا ہے کہ تخت نشینی کے بعد سب سے پہلا حکم جو میری طرف سے جاری ہوا وہ زنجیر عدل کا تھا۔ اگر قاضی کسی سائل کی دادرسی میں دیر کرتا تو وہ مظلوم اس زنجیر کو ہلاتا جس کی آواز سُن کر جہانگیر خود اس کی دادرسی کرتا۔ یہ زنجیر تیس گز لمبی تھی اور اس میں ساٹھ گھنٹے لگے تھے۔ سونے کی یہ زنجیر قلعہ آگرہ کے شاہ برج سے دریائے جمنا کے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔

انداز سے منتج ہوتی ہے۔

شبلی نعمانی اپنی کتاب جہانگیر اور توزک جہانگیری میں والۂ داغستانی کی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ " ایک دفعہ نور جہان بیگم مہتابی پر ٹہل رہی تھیں اتفاق سے کوئی رہرو ادھر سے گزرا اور اس نے نظر اٹھا کر نور جہان کی طرف دیکھا، نور جہان نے اس کو گولی مار دی جہانگیر کو خبر پہنچی فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کی جائے۔

جرم ثابت ہوا اور قاضی نے قصاص کا فتویٰ دیا۔ قلماقنوں کو حکم ہوا کہ محل میں جاکر نور جہان کو پکڑ لائیں، اور جلاّد کے حوالے کردیں۔ نور جہاں نے بہت کچھ روپے کا لالچ دیا لیکن سب جہانگیر کی انصاف پرستی سے واقف تھے کسی نے کچھ نہ سنی۔ بالآخر نور جہان نے مقتول کے ورثا کو راضی کیا کہ خونبہا لے لیں۔ چنانچہ دو لاکھ روپیہ خونبہا لے کر ان لوگوں نے دست برداری کی اور جہانگیر سے کہہ دیا کہ ہم کو کچھ دعویٰ نہیں۔

جہانگیر نے کہا شاید تم لوگوں پر بیگم کی طرف سے کچھ دباؤ پڑا۔ ان لوگوں نے یقین دلایا کہ نہیں ہم نے بہ خوشی ایسا کیا ہے۔ جہانگیر نے رہائی کا حکم دیا۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو محل میں گیا اور (عشق کی ادا دیکھو) نور جہاں کے پاؤں پر گر کر کہا ہائے بیگم، اگر ترا می کشتند من چہ می کردم۔

ملکہ الزبتھ کے رومان

ستر سال کی عمر میں اس کنواری بڑھیا نے وفات پائی۔ عمر بھر شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں کوئی جسمانی نقص تھا، مگر اس کی زندگی کی رومانی سرگرمیاں اس بات کی تصدیق نہیں کرتیں

آوارہ مزاج ملکہ

انگریزی تاریخ میں ہنری ہشتم کی بیٹی ملکہ الزبتھ کا زمانہ شاعری، بہادری، مہم جوئی اور رومان پروری کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ملکہ ۱۵۵۸ میں پچیس سال کی عمر میں انگلستان کے تخت پر بیٹھی اور ۴۵ سال تک بڑی شان سے حکومت کی۔ ملکہ نے ستر سال کی عمر پائی مگر ساری عمر شادی نہ کی۔ اس کی زندگی عجیب و غریب قسم کی رومانی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ متعدد بادشاہوں، شہزادوں اور رئیسوں نے اس سے محبت کی۔ اسے شادی کے پیغام دیے اور مختلف نوعیت کے تعلقات قائم کیے۔ ملکہ نے ہر مداح کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے اس طرز عمل نے اس کے کیریکٹر کو ایسا داغدار بنا دیا کہ اُسے انگلستان کی سب سے زیادہ آوارہ مزاج ملکہ کہا جاتا ہے۔

ملکہ کا حلیہ

وہ زیادہ خوبصورت نہ تھی البتہ اس میں کشش کے بعض اور پہلو پائے جاتے تھے۔ اس کے بال گنگھریالے تھے۔ چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ ہاتھ بہت لمبے تھے چہرہ لمبوترہ اور آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔

سیمور سے عشق

ہنری ہشتم کی آخری ملکہ کیتھرائن پار نے جس لارڈ سے شادی کی تھی اس کا نام سیمور تھا۔ الزبتھ اپنی سوتیلی ماں کے اس دوسرے شوہر (سیمور) سے بھی عشق کرنے لگی تھی۔ سیمور بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ الزبتھ کی عمر اس وقت پندرہ برس کی تھی۔ سیمور اور الزبتھ میں تعلقات قائم ہو گئے۔

جب ۱۵۴۸ء میں سیمور کی بیوی کیتھرائن مر گئی تو سیمور اور الزبتھ کے تعلقات کے پیش نظر عام خیال یہ تھا کہ ملکہ اس سے شادی کرے گی، مگر ایسا نہ ہوا، تاہم کیتھرائن کے مرنے

کے بعد سیمور اور الزبتھ میں تعلق اور گہرا ہو گیا جسے شاہی خاندان کے لوگ پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتے تھے اور چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔

لوگوں کا خیال تھا کہ سیمور ملکہ سے اس لیے شادی کرنا چاہتا ہے کہ تخت حاصل کر لے اور اسی لیے وہ ملکہ کو ورغلا رہا ہے لیکن درحقیقت ملکہ اس سے محبت کرنے لگ گئی تھی۔

خاص منظورِ نظر الزبتھ پر اس کی کئی رومانی سرگرمیوں کے باعث آوارہ مزاج عورت ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے اور یہ ہے بھی درست۔ اس نے سیمور کے علاوہ اور کئی رئیسوں سے ناطہ جوڑا۔ ان میں ایک کا نام ایسکس تھا۔ ملکہ اسے اکثر اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ آئرلینڈ میں اس سے بعض ایسے کام سرزد ہوئے کہ ملکہ اس سے ناراض ہو گئی اور اسے قید کر دیا گیا۔ جب رہا ہوا تو ایک سازش کے الزام میں پکڑا گیا، پھر مر گیا۔

ملکہ کے دوستوں میں ایک رابرٹ ڈڈلے بھی تھا، جو جان ڈیوک آف نارتھمبرلینڈ کا بیٹا تھا۔ ۱۵۸۵ء میں نیدرلینڈ کی برطانوی فوجوں کی کمان اس کے ہاتھ میں رہی۔

عام شہرت ملکہ کی رومانی داستانوں پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک کتاب پیرس سے شائع ہوئی جو ہیومر روزنی نے لکھی۔ خوشتر گرامی کے الفاظ میں "اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ الزبتھ بے حد حریص واقع ہوئی تھی اس نے کئی خاندانوں کا مال و اسباب ضبط کر لیا تھا اور بہت سے لوگوں کو محض اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ ان کی جائیداد قرق کی جا سکے۔ جب تک کوئی شخص بحقِ ملکہ نذرانے پیش نہ کرے، ملکہ اس سے ملنا گوارا نہ کرتی تھی، لیکن جو لوگ اس کے منظورِ نظر ہوتے تھے ان کو مالا مال کر دیتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے مداح اور محبوب لیڈر کو نہ صرف کینٹ ورتھ کا علاقہ عطا کر دیا تھا بلکہ پچاس ہزار پونڈ کی گراں قدر رقم بھی ایک سال کے اندر عنایت کر دی۔ جو آجکل کے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ کے برابر ہوتی ہے۔

ملکہ الزبتھ بے حد خود پسند تھی، اور اپنے حسن کی تعریف سن کر بہت خوش ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک لیڈی نے ملکہ الزبتھ کو لکھا:

الزبتھ اتنی خود پسند ہے کہ وہ اپنے آپ کو حسن کی دیوی اور جنت کی حور سمجھتی ہے

وہ لوگوں سے یہ سن کر بے حد خوشی محسوس کرتی ہے کہ اس کا چہرہ سورج کی طرح چمکدار ہے۔ اپنے حسن کے متعلق وہ خوشامد اور مبالغہ کو بہت پسند کرتی ہے ابھی اگلے روز میں اور لیڈی لینوکس اس کی ملاقات کو گئیں، باتوں باتوں میں لیڈی لینوکس نے بھی الزبتھ کو خوش کرنے کے لیے کچھ ایسے ہی کلمات کہہ دیئے بس پھر کیا تھا ملکہ پھول کر کُپّا ہو گئی، ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ ایک دوسری کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتی تھیں، مبادا نظریں ملتے ہی ہنسی ضبط کرنا ناممکن ہو جائے۔

مختلف رومان عمر کی پختگی کے ساتھ ملکہ کی خود پسندی اور غرور بھی بڑھتا گیا۔ خوشامد کرنے والوں کو بڑے بڑے عہدے اور خطابات عطا کیے جاتے تھے۔ لسٹر ملکہ کا بہت مداح تھا اور ملکہ بھی اس پر لٹو تھی۔ یہ دونوں بچپن کے دوست تھے اور مصیبت کے دنوں میں اکٹھے جیل میں رہ چکے تھے۔ اسے ملکہ کے مزاج میں بہت دخل حاصل تھا۔ اُس کے ایک اشارے کے مقابلے میں وہ ہیرنگٹن، والٹر ریلے جیسے مشہور اور باوقار لوگوں کے آنسوؤں کی بھی پروا نہ کرتی تھی۔ یہی ایک شخص تھا جس سے ملکہ شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس پر ملکہ کی خواب گاہ کے دروازے بھی بند نہ تھے۔

مثال کے طور پر محلوں کی خلوتوں میں جو کچھ ہوتا تھا پہلے اس کی اشاعت کی ممانعت تھی لیکن نوجوان سیمور اور الزبتھ جب خواب گاہ میں علانیہ ملاقاتیں کرنے لگے تو بہت سنسنی پھیلی اور ممانعت کا سوال اٹھ گیا۔

امیر البحر طامس سیمور بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔ جب ملکہ الزبتھ صرف چودہ سال کی تھی تو وہ اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایڈورڈ ہشتم کے بعد خود تخت پر بیٹھنے اور الزبتھ کو اپنی ملکہ بنانے کا خواہشمند تھا۔

اطالیہ کے مشہور مورخ لیٹی نے الزبتھ اور سیمور کے عاشقانہ خطوط شائع کیے ہیں۔ ان خطوں میں الزبتھ نے ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی اس زمانے میں اور اس عمر کی لڑکی سے کسی کو توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان تمام خطوط اور محبت بھری ملاقاتوں کے باوجود جب اس نے

شادی کا پیغام دیا تو ملکہ کی طرف سے ایسا روکھا جواب ملا کہ اس نے بددل ہو کر ہنری ہشتم کی بیوہ کیتھرائن پار کے ساتھ شادی کر لی۔

اس شادی کے بعد الزبتھ کئی مرتبہ کیتھرائن کے ہاں مہمان رہی، ادھر سیمور کی آتش عشق ابھی سرد نہ ہوئی تھی۔ اس نے پھر الزبتھ کو ورغلانا شروع کیا اور دونوں کے کئی کئی گھنٹے خوابگاہ کی تنہائی میں گزرنے لگے۔ آخر خلوت کی باتیں باہر نکل کر افسانہ بن گئیں۔ اور سیمور کو غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر ملکہ الزبتھ کے کمرے کے گرد بھی سخت پہرہ بٹھا دیا گیا تاکہ وہ مزید شرارت نہ کر سکے۔ اس اسیری کے دوران میں الزبتھ کو اطلاع ملی کہ اس کے عاشق کو غداری کے جرم میں سزائے موت کا حکم ہوا ہے۔

پھر ارل آف ڈیرن شائر نے الزبتھ کو شادی کا پیغام دیا۔ اس کے علاوہ دیگر یورپی ممالک کے بڑے بڑے نوابوں نے بھی التجائیں کیں، لیکن یہ معاملے بھی ملاقاتوں تک ہی محدود رہے اس دوران میں لوگ شرطیں بندھا کرتے تھے کہ ولیم پکرنگ یا رابرٹ ڈڈلے میں سے کوئی ایک ملکہ کو اپنی بیوی بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پکرنگ بہت خوبصورت نوجوان تھا وہ کئی ماہ تک خاص شاہی کمروں میں مقیم رہا۔ ملکہ اس کے ساتھ خاص مہربانی سے پیش آتی تھی اور اس کی سب سے زیادہ خاطر مدارات ہوتی تھی۔ لیکن وہ چونکہ زیادہ دولت مند نہ تھا۔ اس لیے اس کے تعلقات بھی شادی کی حد تک نہ پہنچ سکے اور آخر کار وہ بددل ہو کر اپنے علاقے میں چلا گیا۔

پراٹسٹنٹ فرقہ کے لیڈر سسل نے بھی ملکہ کے ساتھ ارل آف ایرن کے لیے ساز باز کی جو سکاٹ لینڈ کے تخت کا دعویدار تھا۔ اپنی اسیری کے دنوں میں ملکہ نے پراٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا تھا اس لیے سسل کو کامیابی کی امید تھی۔ ارل آف ایرن ان دنوں فرانس میں تھا۔ ہنری نے اسے مردہ یا زندہ گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا اس لیے وہ ایک تاجر کا بھیس بدل کر بھاگ گیا اور جنیوا میں پہنچ کر ایک کلیسا میں داخل ہو گیا۔ چند ماہ بعد وہ انگلستان پہنچا اور سسل کے گھر میں چھپا رہا۔

روزنی کے بیان کے مطابق اسے بارہا الزبتھ کی خوابگاہ میں راتیں بسر کرنے کا موقعہ ملا تھا اس پہ ملکہ کا منظور نظر لیسٹر اس قدر چراغ پا ہوا کہ اس نے کھانے میں زہر ملا کر ملکہ اور اپنے آپ کو

ہلاک کر دینے کی ٹھانی۔ لیکن آخر سسل کی کوششیں بھی ناکام رہیں۔

پھر لسٹر نے مشہور کر دیا کہ ملکہ آسٹریا کے آرچ ڈیوک[1] چارلس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جنگ میں آسٹریا فرانس کی مدد کرنے سے باز رہے۔ ادھر الزبتھ نے بھی دکھاوے کے لیے رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنے کا بہانہ کیا لیکن یہ تو محض لسٹر کی ایک چال تھی جو سسل کو زک دینے کے لیے چلی گئی تھی۔ اس لیے یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی

خود لسٹر کا انجام بھی بہت خوفناک ہوا۔ اس پر ملکہ سب سے زیادہ مہربان تھی اور وہ الزبتھ کی خواب گاہ میں بارہا سرافراز ہوتا رہا۔ لیکن آخر الزبتھ کو پتہ لگ گیا کہ لسٹر شادی شدہ ہے اور اس کا ایک نوجوان بیٹا بھی لندن میں موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے آئرلینڈ بھیج دیا گیا، مگر اس نے وہاں بھی چین نہ لیا۔

کچھ عرصہ بعد وہ تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر ملکہ الزبتھ کے محل پر چڑھ دوڑا۔ مگر اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ بغاوت کے جرم میں اسے بھی سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ جس روز اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا، اُس روز ملکہ الزبتھ نے اپنے محل میں ایک شاندار دعوت دی۔

آخری ایام | ملکہ کے عاشقوں میں اور بھی کئی رئیس اور افسر شامل تھے جنھیں وہ ہمیشہ نوازتی رہی ان میں سے اکثر کو وہ روپیہ سے مدد دیتی رہتی تھی۔ لوگ اس کی ان حرکات سے سخت نالاں رہتے تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ اسے سب سے زیادہ محبت ایسکس سے تھی جو ۲۵ فروری ۱۶۰۱ء میں مرگیا۔ اس کی وفات کے بعد ملکہ صرف دو سال تک زندہ رہ سکی۔

۱۶۰۳ء میں بعمر ستر سال اس "کنواری" بڑھیا نے وفات پائی۔ اس کے عمر بھر شادی نہ کرنے کی وجہ ایک یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس میں کوئی جسمانی نقص تھا، مگر اس کی رومانی کارگزاریاں اس بات کی تصدیق نہیں کرتیں ؎

جذبۂ دل میں کچھ کمی سی ہے — چڑھتے دریا مگر اتر سے گئے

---

[1] اس ڈیوک کے علاوہ ملکہ جن دوسرے لوگوں سے عشق کرتی تھی ان میں آرچ ڈیوک کا بھائی ڈان جان، ہنری آف انجو، اس کا بھائی فرانسس وغیرہ بھی تھے۔

نپولین کے رومان

نپولین نے بسترِ مرگ پر اپنے ڈاکٹر کو وصیت کی تھی کہ موت کے بعد میرا دل شیشے
میں اتار کر میری بیوی کے پاس لے جانا۔ جب ڈاکٹر ملکہ کے پاس پہنچا تو اسے ایک
کانے عہدہ دار سے تعشق کرتے پایا۔ ملکہ نے نپولین کا پیغام سن کر کہا "میں نے اس کی محبت
کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی اگرچہ میں یہ ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہوں کہ وہ میرے
لڑکے کا باپ ہے"۔

انسانی عظمت | پیرس کے گلی کوچوں اور بازاروں میں عجب افراتفری کا منظر تھا۔ بچے، عورتیں،
بوڑھے اور نوجوان پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ فوج اور
نیشنل گارڈ کے سپاہیوں کی ٹولیاں ہتھیاروں سے آراستہ گھومتی نظر آتی تھیں۔ کسی کسی وقت
بندوق اور توپ چلنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ غرض بدنظمی اور خوف و ہراس نے سارے
شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ——— رعایا اور فوج نے حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت
کر دی تھی اور شاہی محل کی طرف باغیوں کی پیش قدمی شروع ہو چکی تھی۔

فرانس کی قومی مجلس کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ قومی مجلس نے جس جرنیل کو فوج دے
کر باغیوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیجا وہ ناکام واپس لوٹا اور باغیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔
رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ قومی مجلس کو باغیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے پیشِ نظر
اپنی بدبختی اور بھیانک انجام کا نقشہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پہلے جرنیل کی ناکامی کے بعد انھوں
نے جنرل بیرس کو ساری فوجوں کا کمانڈر بنا کر باغیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ مگر بیرس نے بھی
اس معاملہ میں اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔

"میں آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو اس نازک وقت میں
ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بغیر اور کوئی شخص یہ کام انجام نہ دے
سکے گا" جنرل بیرس نے مجلس کے اراکین سے مخاطب ہو کر کہا "وہ کارسیکا کا بہادر فوجی

افسر ہے ـــــــ نپولین بوناپارٹ ـــــــ تمام فوجوں کی کمان اس کے سپرد کر دی جائے"
قومی مجلس کے اراکین نپولین سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ ابھی تک نپولین ایک معمولی فوجی افسر تھا۔ چنانچہ اراکین مجلس کا خیال تھا کہ جنرل بیرس جیسے قابل اور تجربہ کار جرنیل نے اپنی جگہ جس شخص کا نام پیش کیا ہے وہ یقیناً کوئی پرانا اور بوڑھا تجربہ کار جرنیل ہوگا، لیکن جب نپولین کو بلایا گیا تو انھوں نے دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا نوجوان ان کے سامنے کھڑا ہے۔ نپولین کی عمر اس وقت پچیس سال کے قریب تھی مگر شکل وصورت سے بمشکل سترہ اٹھارہ سال کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ سمجھے جنرل بیرس نے ان سے مذاق کیا ہے چنانچہ مجلس کے صدر نے نپولین سے سوال کیا:
"کیا تم اس نازک وقت میں مجلس کے تحفظ کا ذمہ لے سکتے ہو؟" نپولین نے نہایت متانت اور اطمینان کے ساتھ اثبات میں جواب دیا۔
"کیا تم نے اس کام کی اہمیت اور گرانباری کا اندازہ کر لیا ہے؟" صدر نے دوبارہ سوال کیا۔
"جناب عالی! میں نے آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ کر اور اس کام کا پورا پورا اندازہ کرنے کے بعد اس کی ذمہ داری قبول کی ہے اور میرا یہ اصول ہے کہ جس کام کا ذمہ لیتا ہوں اُسے پورا کر کے دکھاتا ہوں" نپولین نے جواب دیا۔
نپولین نے صدر مجلس کی باتوں کا جواب ایسی متانت سے دیا کہ سب کی دلجمعی کر دی اور نپولین کے چہرے اور اس کی عمر کے اندازے سے اراکین کو جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دُور ہو گئی، چنانچہ مجلس نے پورے اختیارات دے کر فوجوں کی کمان اس کے سپرد کر دی۔
نپولین نے پانچ ہزار جنگجو سپاہیوں کی کمان ہاتھ میں لی اور چالیس ہزار باغیوں کو جن کی کمان بوڑھے اور تجربہ کار جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی پیس کر رکھ دیا۔ نئی حکومت بن گئی۔ نپولین

ے جنرل بیرس بعض جنگی معرکوں میں نپولین کے ساتھ شریک رہا تھا اور اس کی جنگی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نپولین اس وقت پیرس میں ہے۔

کو اس عظیم خدمت کے صلہ میں فرانس کی داخلی فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ اور ترقی کا یہ پہلا بڑا زینہ تھا جس پر نپولین نے قدم رکھا۔ بعد ازاں اٹلی کی مہم میں اس نے جو حیرت انگیز معرکے سر کیے، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس نے فرانس کی عزت کے پرچم کو اتنا بلند کر دیا کہ ملک کا ہر فرد اس پر جان تک نثار کرنے کو تیار تھا۔ یورپ اس کے نام سے لرزہ براندام رہنے لگا ——— یہ تھی نپولین کی انسانی عظمت!

اخلاقی نامرادی جب ہم دنیا کے اس عظیم جرنیل کی اخلاقی زندگی یا جنسی سرگرمیوں پر غور کرتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ انسان کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دنیا کی ساری لکاوٹوں کا تن تنہا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی۔ کہیں وہ کارولین کولوبیا نام دوشیزہ سے عشق لڑاتا ہے تو کہیں وہ اپنی جوانی کے دنوں میں ایک ادھیڑ عورت میڈم پرمون پر لٹو ہو کر اس سے بیاہ کرنے کی فکر کرتا ہے۔ کبھی میڈم پولین، میڈم ڈی اسٹائل، مسز اربل اور متعدد دوسری عورتوں کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھاتا ہے۔ غرض اس کے کئی معاشقوں کی داستانیں کتابوں میں موجود ہیں۔ جرمنی میں "نپولین اور اس کی دوست عورتیں" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں اس کی عاشقانہ بوالہوسیوں کی تمام داستانیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ ان میں جوزیفین اور میری لوئیس خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ انہیں دو عورتوں سے نپولین نے شادی کی اور یہی اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں، "اٹھارویں صدی میں نپولین بوناپارٹ کا ظہور انسانی اُولوالعزمی کا ایک عظیم ظہور تھا۔ شاید ہی یورپ کے کسی انسان کی نسبت دنیا نے اس قدر کہا اور سُنا ہو جس قدر اس غیر معمولی انسان کی عجیب و غریب دماغی قوتوں کی نسبت کہہ سُن چکی ہے تاہم انسانی عظمت کی اخلاقی نامرادی کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے کہ یہی نپولین جب میدانِ جنگ سے باہر اپنے گھر کی محفوظ زندگی میں دیکھا جاتا ہے تو اس میں اتنی قوت بھی نظر نہیں آتی، کہ نہایت ادنیٰ درجہ کی اخلاقی کمزوریوں سے اپنے آپ کو باز رکھے۔

محبت کے باب میں نپولین کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ محبت کاہل آدمی کا

دل بھلاوا ہے۔" ممکن ہے نپولین نے یہ اس وقت کہا ہو جب وہ پاک دامن تھا، لیکن بعد میں اگر مخالف مؤرخین کی روایت تسلیم کر لی جائے تو اس نے اس قول کی بنا پر حسن و ہوس کی زندگی سے اجتناب نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی حسینہ سے وابستہ رہا۔[1]

پہلا عشق آغازِ شباب میں نپولین مارسیلز اور پیرس کی سڑکوں پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھرا کرتا تھا۔[2] نہ اس کی ہیئت سے کسی کو دولت مندی کا شبہ ہو سکتا تھا نہ اس میں ظاہری حسن و جمال ہی کچھ ایسا غیر معمولی تھا کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی بکثرت عورتیں اس پر عاشق ہو گئی تھیں، کیونکہ اس میں فی الواقع کوئی ایسی نامعلوم کشش موجود تھی جو دلوں کو لبھا لیتی تھی۔ ممکن ہے اس کا شرمگین انداز اور اس کے پُر نور چہرہ کی عجیب اداسی اس کے دیکھنے والوں میں محبت پیدا کر دیتی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین سولہ برس کی عمر میں جب والنسا میں رہتا تھا تو وہاں کی بہت سی حسین عورتیں اس پر فریفتہ ہو گئی تھیں مگر خود اسے بجز ایک کے کسی سے دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس دوشیزہ کا نام کارولین کولومبیا تھا۔ وہ نہایت نازک اندام اور خوبصورت تھی۔ ایک مرتبہ خود نپولین نے اس لڑکی کے متعلق کہا تھا " اس وقت دنیا میں کوئی دو شخص ایسے خوش نصیب نہ تھے جیسے ہم دونوں تھے۔ ہم ایک ایسی پاک محبت کے مزے لوٹ رہے تھے جیسی خواب میں بھی کسی انسان نے نہ دیکھی ہو گی . . . . . اکثر ہم دونوں باغوں میں چلے جاتے اور درختوں پر چڑھتے اُترتے۔ بارہا ہم دن دن بھر مخلوق کی نظروں اور شہر کے

---

[1] نپولین کا ایک قول یہ بھی ہے کہ " میں اجتماعی مصلحتوں کی بنا پر اور فرد کی سعادت کے لیے محبت کو مضر سمجھتا ہوں۔ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔" (ارمان)

[2] اس زمانہ میں نپولین کی غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اس کی چھوٹی بہن پولائن نے اس سے ٹوپی کی فرمائش کی اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے میرے پاس ایک ہی ٹوپی ہے جو میں اور میری بہن دونوں باری باری سے پہنتی ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں اکٹھی باہر نہیں جا سکتیں۔ مگر نپولین اتنا غریب تھا کہ اپنی بہن کے لیے ٹوپی بھی نہ خرید سکتا تھا۔

شور و غل سے دُور بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے "۔

دوسرا عشق لیکن امتدادِ زمانہ نے نپولین کے دل سے اس دوشیزہ کی یاد محو کر دی اور اُسے اپنی ایک ہم وطن لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نپولین شروع ہی سے سخت گیر تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو سختی سے حکم دے دیا تھا کہ اس کے سوا کسی کو بھی مسکرا کر نہ دیکھے۔ لڑکی کے دل میں اس جابرانہ حکم سے نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے پنجہ سے نکلنے کے لیے اس نے ایک دن شراب میں زہر ملا دیا اور نپولین مرتے مرتے بچا۔

تیسرا عشق اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد نپولین کو ایک ادھیڑ عورت میڈیم پرمون سے محبت ہو گئی اور اس قدر بڑھی کہ ایک لمحہ بھی اس کی جدائی گوارا نہ کی۔ ایک دن نپولین نے اس سے باضابطہ شادی کر لینے کی درخواست کی۔ عورت نے اس خواہش پر زور سے قہقہہ لگایا "تم بے وقوف ہو گئے ہو، مضحکہ بننا چاہتے ہو۔ بھلا لوگ کیا کہیں گے۔ بیوی ہونے کے بجائے میں تمھاری ماں بننے کے زیادہ قابل ہوں "۔

نپولین پر یہ بات نہایت ناگوار گزری اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

نپولین کا طریقِ عشق ایک مؤرخ کا بیان ہے کہ نپولین نے بے شمار عورتوں کا دل توڑا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ تعلقات بڑھائے جاتا تھا اور جب عورت اس کے دامِ محبت میں پھنس جاتی تو بے اعتنائی سے بالکل چھوڑ دیتا تھا۔ چنانچہ میڈیم ولسکا پولینڈ کی ایک حسینہ کا واقعہ اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ نپولین نے اس عورت کو دیکھا اور لبھانا چاہا۔ مگر اس نے سخت نفرت کا اظہار کیا۔ نپولین نے اسے قبضہ میں لانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ برابر بیزار رہی۔ آخر ایک دن غضب ناک ہو کر چلایا "تو دیکھ لے گی میں تجھے کس طرح زیر کرتا ہوں تجھے میرے ارادہ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ دیکھ یہ میرے ہاتھ میں گھڑی ہے۔ جس طرح میں یہ گھڑی چُور چُور کیے ڈالتا ہوں اسی طرح پولینڈ کا ملک بھی پاش پاش کر کے پھینک دوں گا "۔

اس نے یہ کہا اور گھڑی زور سے دیوار پر مار دی۔ اس حرکت کا عورت پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر نپولین کے قدموں پر گر پڑی۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی نپولین نے اکتا کر اسے چھوڑ دیا۔

محبت میں استبداد عشق و محبت کے میدان میں بھی اس شخص کے ظلم و استبداد کے قصے مشہور ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ غربت کے زمانہ میں جب نپولین اور اس کا بھائی مارسیلز کے بازاروں میں پھرا کرتے تھے، اتفاق سے ریشم کے ایک سوداگر فرانسوا کلاری کے خاندان سے ان کا تعارف ہو گیا۔ اس تاجر کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام جولیا تھا، چھوٹی کا ڈیزیرا۔ نپولین نے شروع میں جولیا کو پسند کیا اور اس کے بھائی نے ڈیزیرا کو تھوڑے دن بعد نپولین اپنی محبوبہ سے سیر ہو گیا اور بھائی کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب یہ چاروں عاشق و معشوق جمع تھے، نپولین نے تحکمانہ انداز میں کہا "جوزف! تم اور تمہاری محبوبہ دونوں غیر مستقل مزاج ہیں لیکن مجھ میں اور میری محبوبہ میں استقلال ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تم مبادلہ کر لیں تاکہ تمہارا نقص جولیا پورا کر دے۔ اور میں ڈیزیرا کی کمی پوری کر دوں۔"

یہ عجیب و غریب فلسفہ بیان کر کے اس نے اپنے بھائی کی محبوبہ کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور کسی کو بھی مخالفت کی جرأت نہ ہوئی، لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد نپولین نے محسوس کیا کہ عزت و عظمت کی راہیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں۔ لہذا ڈیزیرا کو یک قلم چھوڑ دیا۔

چوتھا عشق اس کی طبیعت کچھ ایسی بے چین واقع ہوئی تھی کہ ایک ہی حالت پر چلے جانا اسے پسند نہ تھا۔ سابق محبت سے دستبردار ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ جوزیفائن[1] پر فریفتہ ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں جب نپولین بام عزت کی ابتدائی

---

[1] نپولین کی طرح جوزیفائن بھی ایک جزیرے کی رہنے والی تھی۔ وہ جزائر غرب الہند کے ایک جزیرہ مارتی نیق کی باشندہ تھی۔ یہ جزیرہ فرانس کے زیر نگین تھا۔ جوزیفائن نپولین کی پیدائش سے چھ سال قبل ۲۳ جون ۱۷۶۳ء کو پیدا ہوئی۔ اس کا باپ بڑا جاگیردار تھا۔ جوزیفائن نے زندگی کی سترہویں منزل میں قدم رکھا تھا کہ ایک انیس سالہ فرانسیسی نوجوان الیگزانڈر بیوہارنائس اس پر فریفتہ ہو گیا اور ۱۳ دسمبر ۱۷۷۹ء کو اسی جزیرہ میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ پھر اپنے شوہر کے ہمراہ پیرس چلی گئی۔ مگر میاں بیوی کے درمیان جلد ہی کشمکش شروع ہو گئی۔ اور روز بروز تلخیاں بڑھتی گئیں۔ اس دوران میں ان کے دو بچے پیدا ہوئے۔ بڑا بچہ یوجین ۱۷۸۱ء میں پیدا ہوا۔ چھوٹی ارتنس ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئی۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

سیڑھیوں پر تھا۔ اس کے پاس ایک کم عمر لڑکا آیا اور اپنے باپ کی تلوار مانگی۔ یہ لڑکا فرانس کے مشہور سپہ سالار الیگزانڈر بیوہارنائس کا بیٹا تھا جسے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ نپولین بچے کی جرأت اور فصاحت سے بڑا خوش ہوا اور اس کی درخواست منظور کر لی۔ دوسرے دن اس کی ماں شکریہ ادا کرنے آئی۔ یہی جوزیفائن تھی۔ نپولین پہلی ہی نظر میں اس پہ عاشق ہو گیا۔

جوزیفائن سے شادی

دوسرے دن خود نپولین جوزیفائن کے چھوٹے سے مکان پر گیا۔ جوزیفائن واقعی بہت خوبصورت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ عقلمند بھی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ نپولین اس کی چشم و ابرو کا شکار ہو گیا ہے۔ چونکہ اسراف کی وجہ سے سابق شوہر کی تمام دولت خرچ کر کے مقروض ہو چکی تھی[۱]۔ اس لیے اس نے بھی اس نئی دعوتِ عشق کا پوری سرگرمی

(بقیہ سابقہ) ۱۷۸۷ء میں جوزیفین کی ماں مارتی نیق میں بیمار پڑ گئی۔ جوزیفین نے بڑے لڑکے کو پیرس ہی میں چھوڑ دیا اور بچی کو ساتھ لے کر مارتی نیق چلی گئی۔ جوزیفین کے جانے کے بعد اس کے شوہر نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔

جب فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو مارتی نیق بھی اس کی زد سے نہ بچ سکا۔ جس مکان میں جوزیفین رہتی تھی وہ بھی باغیوں نے تباہ کر دیا۔ اور جوزیفین اپنی بچی کے ساتھ بھاگ کر پیرس آگئی۔ اور ایک ہوٹل میں ٹھہری۔ بعد ازاں شوہر کے گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد اس کا شوہر نائب سپہ سالار کی حیثیت سے شمالی فرانس چلا گیا۔ پھر اس پر ملک دشمنی کا الزام لگا اور وہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ جوزیفین نے اسے رہا کرانے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنے شوہر کی مدد کرنے کے جرم میں جیل میں بند کر دی گئی۔ پھر کچھ دنوں بعد جوزیفین کو اطلاع ملی کہ اس کے شوہر کو پھانسی دے دی گئی۔ جب فرانس کی حکومت بدلی تو جوزیفین کو بھی رہا کر دیا گیا۔ مگر اس کی ساری جائداد چھین چکی تھی۔ اور جس مکان میں وہ رہتی تھی وہ بھی ہاتھ سے جا چکا تھا۔ جوزیفین کی سہیلیوں نے اس موقع پر اس کی مدد کی اور وہ اس مدد کے سہارے زندگی کے دن گزارنے لگی۔

[۱] بعض مؤرخین جوزیفائن کے مقروض ہونے کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس کی جائداد انقلاب کے دنوں میں تباہ کر دی گئی تھی یا چھین گئی تھی اس لیے جیل سے رہا ہونے کے بعد اسے اپنے جان پہچان کے لوگوں کا سہارا اور ان سے مالی مدد لینی پڑی۔ چنانچہ وہ مقروض ہو گئی۔

سے استقبال کیا اور تعلقات بڑھانا شروع کر دیے۔ چند ماہ کی آمد و رفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۷۹۶ء[1] میں جنرل بوناپارٹ اور جوزیفائن کی شادی ہو گئی۔ دلھن کی عمر دولھا سے سات سال زیادہ تھی، مگر نکاح نامہ میں اس کی عمر انتیس برس لکھی گئی اور نپولین کی چھبیس برس۔"

طولِ فراق شادی کو دو ہی دن گذرے تھے کہ نپولین کو اٹلی کے محاذ پر جانا پڑا۔ ۱۷۹۶ء میں یہ مہم شروع ہوئی اور کامل ایک سال تک جاری رہی۔ اس مہم میں نپولین نے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ اگلے سال (۱۷۹۵ء) میں اُسے کمانڈر انچیف بنا دیا گیا[2]۔

یہ پہلا موقع تھا جس میں نپولین نے اپنی عظیم الشان جنگی ہنرمندیوں اور خداداد صلاحیتوں کا بہترین عملی نقشہ پیش کیا۔ یورپ کی بہت سی طاقتیں اس کے خلاف جمع تھیں اور وہ اکیلا صرف پینتیس ہزار سپاہ کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اٹلی کی فوج میں بیسیوں پرانے اور تجربہ کار بوڑھے جرنیل تھے مگر ان کے مقابلہ میں نپولین ناتجربہ کار اور کم عمر تھا۔ زیادہ سے زیادہ چھبیس سال کی عمر ہو گی تاہم اس لڑائی میں اس نے قوموں اور ملکوں کی تقدیروں کے فیصلے کر دیے۔ کامل ایک سال تک اس محاذ پر لڑتا رہا۔ اس کی مصروفیت بہت زیادہ تھی مگر اس کے باوجود جوزیفائن کی یاد ہر دم تازہ تھی۔ جنگ کے دوران وہ ہر منزل سے جوزیفائن کو محبت بھرے خطوط لکھتا بلکہ قاصد ساتھ بھیجتا تاکہ اپنی حالت سے اُسے آگاہ رکھے۔ میدانِ جنگ

---

[1] یہ سن غلط ہے، ۱۷۹۶ء ہونا چاہیے۔ (ارمان)

[2] ابوالکلام آزاد نے اوپر کے بیان میں نپولین اور جوزیفائن کی شادی کی تاریخ مارچ ۱۷۹۶ء لکھی ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ شادی کے دو دن بعد نپولین کو اٹلی کے محاذ پر جانا پڑا۔ حالانکہ مستند تاریخوں اور پیرز انسائیکلوپیڈیا کے مطابق نپولین ۱۷۹۴ میں اٹلی کے محاذ پر گیا۔ اور اگلے سال کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہوا۔ اگر شادی اٹلی کے محاذ پر جانے سے دو دن پیشتر ہوئی تو شادی کا سن ۱۷۹۴ ہونا چاہیے نہ کہ ۱۷۹۶ء۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اپنی کتاب "جوزیفین" میں شادی کا سن ۱۷۹۶ء بتاتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "شادی سے چند روز پیشتر نپولین کو اس فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا جو جمہوریہ فرانس کی جانب سے اٹلی پر حملے کے لیے مامور تھی۔" (ارمان)

سے جوزیفائن کے نام اس نے جو خطوط بھیجے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ یہ خطوط عبدالرحیم شبلی بی کام کی کتاب" دنیا کے چوبیس مشاہیر کے رومان "سے من وعن نقل کیے جاتے ہیں۔

محبّت نامے | شبلی لکھتے ہیں" نپولین کو ابھی کمانڈر انچیف بنے دو ہی دن گزرے تھے کہ اُسے میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ باہر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی لیکن اس کے اپنے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا۔ اس کا اظہار اس نے جوزیفین کے نام ایک خط میں کیا جس کا ہر ایک لفظ عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ہے، اس نے لکھا :

"میری محبوبہ دلنواز!

مجھے تم سے اچانک جدا ہونا پڑا جس کا مجھے از حد قلق ہے۔ تم میری کشتیٔ حیات کی ناخدا ہو۔ میری بے قرار روح کے لیے سرمایۂ تسکین ہو۔ میرے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ میں تم سے محبّت کرتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمھیں اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کر لوں اور ہر وقت تمھاری جوانی کے جرعاتِ آتشیں سے مخمور رہا کروں، لیکن مجھے اس راہ میں بعض خدشات بھی محسوس ہوتے ہیں۔ خدا کرے میرا یہ خیال وہم ہی ہو، لیکن میری پیاری میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ جس روز تم نے دلنوازی میں کمی کی وہ میری محبت کا آخری دن ہوگا۔ کاش میں اتنا فراخ حوصلہ ہوتا کہ محبت کا جواب محبت میں لینے کے بغیر بھی تم سے عشق کر سکتا۔ الغرض میرا دل جو تمھاری مئے الفت سے سرشار ہے کچھ خدشات بھی محسوس کر رہا ہے اور اسی لیے میں بہروں مغموم رہتا ہوں ‘ ——

الوداع‘ اے میری حسین محبوبہ —— الوداع —— !!"

ایک دوسرے موقع پر نپولین نے اپنی ملکہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"میری جوزفین —— ،

تمھیں کیا خبر کہ اس وقت ہزاروں میل دُور ہونے کے باوجود میرے

ؔلہ یہ بیان درست نہیں۔ ملاحظہ ہو سابقہ نوٹ۔ (ارمان)

دل میں تمہارے متعلق کیا کیا جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں باوجود اس قدر فاصلہ کے اپنے آپ کو تمہارے بہت نزدیک محسوس کر رہا ہوں۔ میری عزیز ترین ہستی! تمہیں کیونکر بتاؤں کہ تمہاری پیاری، لذیذ اور شیریں یاد سے میرے دل میں کیا کیا کیفیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری حالت کا علم ہوگا، مگر دلِ بے تاب! آہ دلِ بے تاب! کسی پہلو بھی چین نہیں لیتا۔

مَیں اپنے اس مختصر خط کے ساتھ تمہیں تین بوسے بھیج رہا ہوں۔ ایک تمہارے دل کے لیے جس کی طرب انگیز دھڑکیں میری زلیست کو برقرار رکھنے کے لیے شیریں ترین نغمہ ہیں۔

ایک تمہارے لبِ لعلیں کے لیے جن پر ہر وقت سحر و فسوں کاری کا ہجوم رہتا ہے۔

اور ایک تمہاری نشیلی آنکھوں کے لیے جو ہر لمحہ میری روح میں ایک ناقابلِ فراموش خلش پیدا کرتی رہتی ہیں۔"

ایک خط میں لکھا:

"جوزیفین پیاری!

نہ معلوم کیا بات ہے اس وقت تم سے ملنے کو بے حد جی چاہتا ہے۔ کئی ہفتوں کے بعد چند ایسے لمحے میسر آتے ہیں جنھیں فی الحقیقت فرصت کے لمحے کہہ سکتا ہوں۔ جوزیفین پیاری جانتی ہو اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے، لیکن میری فوج کے چہروں پر مایوسی کے آثار ہویدا ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس جنگ میں فتح پانا ایک غیر ممکن بات ہے، مگر میری اپنی جوزیفین! مجھے پوری امید ہے کہ فتح و نصرت میرے ہی قدم چومے گی۔ لوگ لاکھ مایوس ہوں، مگر میں مایوس نہیں ہو سکتا۔ میرے افسر لاکھ بار مجھے شکست کا یقین دلائیں لیکن میرے دل میں اس کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا۔ میری جوزیفین! جس کی زندگی کے افق پر تمہاری پیاری اور شیریں یاد کا آفتاب چمک رہا ہو، کبھی مایوس ہو سکتا ہے؟

ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں " جوزیفائن کی تصویر ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ جب کہیں پڑاؤ ڈالتا تھا، تصویر نکال کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ جب کوچ کرتا تھا تصویر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہنسی میں اس کے ہاتھ سے تصویر کا آئینہ چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔ اسے اس نے فال بد سمجھا۔ قریب تھا کہ جوزیفائن کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا مگر اس نے فوراً خط لکھا " کاش تمھارے پر ہوتے اور تم اڑ کر میرے پاس آجاتیں "۔

محبوبہ کی بے پروائی

لیکن جوزیفائن اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھی۔ نپولین کی اسے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اب اسے پایۂ تخت میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ اچھے اچھے لوگ اس کی خوشامد میں لگے تھے۔ چند ہفتہ کے اندر نپولین نے اٹلی میں عظیم الشان فتوحات حاصل کر لیں۔ اور اطمینان پا کر جوزیفائن کو بلا لینا چاہا لیکن وہ برابر حیلے حوالے کرتی رہی۔ آخر نپولین نے سختی سے لکھا کہ فوراً چلی آؤ۔ اس مرتبہ اس نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ میں سفر نہیں کر سکتی کیونکہ حمل سے ہوں۔ نپولین کو اس جھوٹی خبر سے بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً خط لکھا " جوزیفائن! میں نے سخت غلطی کی۔ کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کروں۔ میں نے ناحق شک کیا، حالانکہ تم بیمار تھیں۔ سچ ہے محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ . . . . . .
کاش ایک ہی دن کے لیے میں تمھارے پہلو میں ہوتا "۔

نیز اپنے بھائی کو لکھا " جوزیفائن کی علالت نے میرے ہوش اڑا دیے ہیں۔ کاش میں اسے لکھ سکتا۔ اس کی محبت جنون کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدانخواستہ اگر وہ مر گئی تو زندگی میں میرے لیے کوئی لطف باقی نہیں رہے گا "۔

لیکن چند ہی دن بعد نپولین کو معلوم ہو گیا کہ جوزیفائن نے دھوکہ دیا تھا، وہ بالکل اچھی ہے اور پیرس میں ضیافتیں دے رہی ہے۔ اب اس کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی اس نے فوراً تلخ لہجہ میں خط لکھا اور حکم دیا کہ بلا کسی عذر کے روانہ ہو جائے۔

ملاپ

جوزیفائن با دلِ ناخواستہ روانہ ہو گئی۔ میدان میں نپولین نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ مگر چند ہی دن بعد اُسے پھر میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ کیونکہ فوج ایک خطرہ میں پھنس گئی تھی۔ خطرہ دور کر کے اس نے پھر اُسے طلب کیا۔ خط میں لکھا تھا " جدائی کے وقت تمھارے

آنسوؤں نے میرے دل کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ میری عقل جاتی رہی تھی۔ اب یہاں میرے پاس آجاؤ تاکہ مرنے سے پہلے ہم کہہ سکیں کہ ہم نے بھی چند دن خوشی کے دیکھے ہیں۔"

مؤرخ میسن کا بیان ہے کہ نپولین جوزیفائن کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا تھا گویا کسی مقدس دیوی کے حضور میں کھڑا ہے۔

نپولین کا رقیب جوزیفائن اپنے شوہر کے حسب الحکم جنگی پڑاؤ میں آگئی۔ یہاں چارلس نام فوج میں ایک کم رتبہ افسر تھا، کم عمر اور خوبصورت تھا، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ نپولین کی فوج میں اس سے زیادہ حسین آدمی کوئی نہ تھا۔ جوزیفائن دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی۔ یا تو فوج میں رہنے سے بیزار تھی یا اب فوج سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ دونوں میں شناسائی ہوئی، تعلقات بڑھتے اور اتنے بڑھے کہ خود نپولین نے محسوس کر لیا۔ وہ نہایت غصہ ہوا مگر ضبط سے کام لیا۔ اتنا ضرور کیا اپنے رقیب کو فوج سے نکال کر پیرس بھیج دیا اور حکم دیا کہ آئندہ احکام کا منتظر رہے۔

اپنے شوہر کی اس کارروائی سے جوزیفین کو سخت صدمہ ہوا، مگر مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کو ایک خط میں لکھتی ہے "زندگی سے اکتا گئی ہوں، موت کی تمنائیں کرتی ہوں"

لمحاتی مسرت جنگِ اٹلی سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی شان و شوکت سے پیرس لوٹے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نپولین کو پھر جوزیفائن سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہ مصر کی مہم پر روانہ ہو گیا اور بیوی سے وعدہ لے لیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی مصر چلی آئے گی۔ مگر ابھی وہ مالٹا ہی پہنچا تھا کہ اس عیش پسند عورت نے خاوند کو یک قلم بھلا دیا اور جلسے شروع کر دیے۔ نپولین اب فرانس میں اس قدر ہردلعزیز ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کی آزادیوں پر تمام پیرس ملامت کر رہا تھا۔ مگر خود اسے کچھ پروا نہ تھی۔ بہت جلد نپولین کو تمام روئداد معلوم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں اُسے سب سے پہلے جوزیفائن کو طلاق دینے کا خیال پیدا ہوا۔

عشق کی برہمی جوزیفائن سمجھی تھی کہ نپولین شاید کبھی واپس نہ آئے گا۔ یا بہت مدت بعد آئے گا۔ اس لیے بالکل بے باک ہو گئی تھی۔ مگر دفعتاً اسے خبر ملی کہ اس کا شوہر مصر سے آگیا ہے اور عنقریب پیرس پہنچنے والا ہے۔ بہت خوفزدہ اور پریشان ہوئی۔ ایک طرف اپنی بے اعتدالیوں کا خوف تھا دوسری طرف سخت مقروض بھی ہو گئی تھی۔ حیران تھی شوہر کو کیا جواب دے گی؟ مگر

تھی چالاک فوراً پیرس سے استقبال کے لیے روانہ ہوگئی۔ نپولین کو بھی اس کی خبر مل گئی تھی۔ اس نے بالکل مختلف راستہ اختیار کیا اور محل میں آکر تمام دروازے بند کر لیے۔ جوزیفائن اپنی تدبیر میں ناکام ہو کر سرعت سے لوٹی اور سیدھی محل کی طرف روانہ ہو گئی۔

جوزیفائن کی عیاری

جوزیفائن محل کے دروازہ پر کھڑی دستک دیتی رہی مگر نپولین نے کوئی شنوائی نہیں کی۔ پھر اس نے اپنے گھٹنوں پر جھک کر پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا، مگر اس پر بھی سپہ سالار نے مطلقاً پروا نہ کی۔ اس حالت پر پورا دن گزر گیا، مگر دروازہ نہیں کھلنا تھا نہیں کھلا۔ اب جوزیفائن بالکل تھک گئی۔ ناامید ہو کر واپس جانے والی تھی کہ اس کی ایک سہیلی اس کے دونوں بچوں" اوجین" اور" ہارتنس" کو لے کر آئی۔ انھوں نے رکوع کر کے اپنے سوتیلے باپ کو پکارنا اور ماں کے لیے رو رو کر سفارشیں کرنا شروع کیا۔ معصوم بچوں کی آواز سن کر نپولین کا دل نرم پڑ گیا اور دروازہ کھول دیا۔ پھر جوزیفائن کو اٹھایا، آنسو پونچھے، معاف کیا اور اس کا بیس لاکھ فرانک قرضہ بھی ادا کر دیا۔" ؎

بجا نہیں ہے کچھ ان کی خنک دلی کا گلہ !
یہ دل ہیں ان کو غمِ آرزو کی آنچ دکھاؤ

نپولین اور جوزیفائن اب زندگی کے نئے دَور میں داخل ہوئے۔ نپولین فرانس کا شہنشاہ بن کر تخت پر بیٹھا تو جوزیفائن نے بھی ملکہ بن کر تاج سر پر رکھا۔ اب اگرچہ جوزیفائن کے حالات کسی حد تک سدھر چکے تھے مگر نپولین کے ذہن میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اُسے اپنے بعد اپنے جانشین کی فکر ہوئی، مگر جوزیفائن بانجھ تھی۔ نپولین جانتا تھا کہ وہ اولاد پیدا نہیں کر سکتی چنانچہ وہ جوزیفائن کو طلاق دینے پر مجبور ہو گیا۔

جوزیفائن کو طلاق

جوزیفائن کو بھی نپولین کے اس ارادے کا علم ہو چکا تھا مگر ابھی تک نپولین نے اس پر اس ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آخر اظہار کا وقت آ گیا۔ ۲۔ نومبر ۱۸۰۹ء کی منحوس رات جوزیفائن کے لیے یہ خوفناک پیغام لے کر آئی۔ نپولین اور جوزیفائن کمرے میں تنہا تھے۔ نپولین نے جوزیفائن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھا اور کہا :

پیاری جوزیفین ! تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے ، زندگی میں خوشی

کی جو چند گھڑیاں میسر آئیں وہ صرف تیری ہی آغوش میں، اور اس کے لیے
میں تیرا بہت احسان مند ہوں۔ مگر تقدیر میرے ارادوں سے زیادہ مضبوط
ہے۔ میں مجبور ہوں کہ اپنی عزیز ترین دولت کو ملک کی بہتری اور بھلائی کے
لیے قربان کر دوں۔"

جوزیفائن یہ سنتے ہی غش کھا کر گر پڑی۔ دیر تک بے ہوش رہی۔ شاہی طبیب بلایا
گیا، جس نے بڑی کوشش کے بعد اسے ہوش دلایا۔ اب وہ رو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نپولین کیفیت دریافت کرنے کے لیے اندر آیا۔ فرطِ محبت سے جوزیفائن
کے ہاتھ اس کی طرف بڑھے مگر پھر رک گئے۔ اشکبار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "جب مجھے
شاہی تاج پیش کیا گیا تھا تو میں اُسے سر پہ رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ آج ثابت ہو گیا کہ میری یہ
جھجک بجا تھی۔"

نپولین جواب دیے بغیر باہر نکل گیا —— جوزیفائن کو طلاق مل چکی تھی۔

پانچواں عشق جوزیفائن کے بعد نپولین نے آسٹریا کی شہزادی ماری لوئیس سے شادی کی۔
علاوہ ازیں میڈم میتھس نام ایک اطالوی حسینہ سے بھی اس کی محبت کا تذکرہ ملتا ہے
شبلی اپنی مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں " جوزفین کی بے رخی دیکھ کر نپولین دل برداشتہ ہو گیا آخر
طلاق کی نوبت آئی۔ کچھ عرصہ بعد نپولین ایک اور حسینہ سے گتھ گیا، جس کا نام میڈم میتھس تھا
یہ عورت اطالیہ کی رہنے والی تھی۔

نپولین نے میتھس کے نام اپنا پہلا محبت نامہ . . . بھیجا ان دنوں وہ جنگ کر یلیا
میں روسیوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور اسے شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ ایک طرف نپولین اپنے
دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، دوسری طرف اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے جو خطوط
لکھے وہ کس درجہ حسرت افزا اور دردناک ہوں گے۔ اس کے پہلے خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"پیاری میتھس!

جنگ پورے زوروں پر ہے۔ باہر کوہ شکن توپوں اور گولوں کی گرج
سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ آج میں بہت مضمحل ہوں اور اس وقت

اپنے خیمے میں بالکل تنہا اور اداس بیٹھا ہوں۔ میرا کوئی ہمراز نہیں ہے۔ اس تصور کے سوا جو میں تمہاری نشیلی آنکھوں، تمہارے چمکتے ہوئے آنسوؤں اور تمہارے شیریں بوسوں کا اس وقت کر رہا ہوں۔ آہ! باوجود اتنے فاصلے کے میں اپنے آپ کو تمہارے کس قدر قریب محسوس کر رہا ہوں، لیکن شاید تمہیں میرا خیال تک نہیں ہے۔ کیا تم ناراض ہو؟ کیا تم غمگین بیٹھی ہو؟ کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ کاش اس وقت میں تمہارے پہلو میں ہوتا اور تمہاری گداز رانوں پر اپنا سر رکھ کر تمہاری آنکھوں کے سرور انگیز شراب خانوں کی طرف دیکھتا دیکھتا اور مست و بے خود ہو جاتا۔ اچھا خوش رہو، تمہیں ہزاروں بوسے بھیجتا ہوں ـــــ بلکہ تمہارے کتے کو بھی ـــــــ!

دفتر شکایات لیکن جوزیفائن کی طرح میڈم میتھس بھی نپولین کے ساتھ دلی ہمدردی نہ رکھتی تھی۔ وہ شہنشاہ کی بیوی اور خدمت گزار بن کر تو رہنے کے لیے تیار تھی مگر معشوقہ اور محبوبہ بننے پر رضامند نہ تھی۔ اس سے قدرتی طور پر شہنشاہ کی خلش میں اور اضافہ ہوا اور وہ ہر وقت مغموم رہنے لگا۔

آخر تنگ آکر اس نے اپنی بہن شہزادی پالین بورگینز کو لگاتار چالیس پچاس خطوط لکھے جس میں میڈم میتھس کی بے اعتنائی اور بے پروائی کی شکایت کی تھی اور درخواست کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس الھڑ دوشیزہ کو راہ راست پر لائے۔

چند سال ہوئے ان میں سے قریباً ۳۰ خطوط پیرس میں نیلام کیے گئے۔ یہ شہنشاہ کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ذیل میں چند خطوط کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

(۱)

"پیاری ہمشیرہ!

خدا تمہیں خوش رکھے۔ میں تم سے ذکر کر چکا ہوں کہ میتھس کا سلوک آجکل مجھ سے اچھا نہیں ہے۔ میں نے تو اس سے محض اس امید پر شادی کی تھی کہ وہ میری پژمردہ سطح میں زندگی پیدا کر سکے گی، لیکن افسوس کہ میری توقعات غلط

ثابت ہوئیں اور میری مشکلات میں اور اضافہ ہوگیا۔

پیاری بہن! تم ہی بتاؤ کہ میں میتھس کو کس طرح سمجھاؤں کہ مجھے خادمہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک رفیقۂ حیات درکار ہے، جو زندگی کے ہر نشیب و فراز میں میری حقیقی غمگسار ہو ——— ! میتھس میرے بچے کی ماں تو بننے کے لیے تیار ہے، لیکن افسوس کہ میں اُسے اپنا ہم راز اور ساتھی نہیں بنا سکتا دوسرے الفاظ میں وہ میرے جسم کو لذت تو پہنچا سکتی ہے، لیکن میری روح کی تسکین کا سامان مہیا نہیں کر سکتی۔"

(۲)

"بہن پالین!

تمھاری ہمدردی کا ممنون ہوں، آج ہی مجھے میتھس کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ہے۔ اب تو اس نے مجھے نہایت مشفقانہ انداز میں مخاطب کیا ہے۔ شاید وہ صحیح راستے پر آ رہی ہے۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ وہ نمائشی

محبت کی قائل نہیں۔ اصل عشق وہی ہوتا ہے، جو قلب کی گہرائیوں سے اٹھے اور جس کا اظہار آنکھیں کر رہی ہوں، ممکن ہے اس کا یہ نظریہ درست ہو، لیکن جب تک میرے سینے کی آگ فرو نہیں ہوتی مجھے کیونکر یقین آئے کہ میتھس فی الواقع مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تاہم میں خوش ہوں کہ اس کے طرزِ عمل میں کچھ تو فرق آیا۔"

(۳)

"بہن!

مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ میتھس مجھ سے محبت نہیں کرنا چاہتی۔ وہ صرف دوست بن کر رہنا چاہتی ہے، لیکن کیا فائدہ؟ دوست تو میرے اس دنیا میں بہت ہیں، لیکن افسوس روح نواز اور سچا غمگسار کوئی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میتھس اس خلا کو پورا کرے جو زیفین کے بعد میرے دل میں پیدا ہوگیا ہے

لیکن افسوس میری خواہش پوری نہ ہوئی۔ تم جانتی ہو، میتھس بہت خوبصورت ہے۔ اس کے سینے پر زندگی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیف ومستی کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کے عارضِ گلگوں پر شباب مچل رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زندگی، اس کیف ومستی اور شباب میں سے کچھ مجھے بھی حصّہ ملے۔ لیکن شاید قدرت کو میرے زخموں کا اندمال منظور ہی نہیں ہے۔ اچھا بتاؤ اس مجبوری میں اب دو چار آنسو بہا لینے کے سوا میں کیا کر سکتا ہوں؟"

(۴)

"میں تو اس روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آگیا ہوں۔ افسوس! مجھے اس دنیا میں کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ تم کہتی ہو۔ تمام اقوام عالم میرے اشارے پر ناچنے کو تیار ہیں۔ لیکن پیاری بہن! یہ تو بتاؤ کیا میتھس بھی میرا کہنا ماننے پر آمادہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ملکوں اور تاجوں کو روند ڈالا۔ مشرق سے مغرب تک میری سلطنت کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کس درجہ ماتم انگیز حقیقت ہے کہ میں ایک عورت کے دل کو فتح نہ کر سکا۔ اچھا خدا حافظ بہن! میں بہت جلد تم سے آکر ملوں گا۔"

چھٹا عشق جوزیفائن کو اس کی جس کمی کے باعث نپولین نے طلاق دی تھی وہ ماری لوئیس نے پوری کر دی یعنی اس سے بچہ پیدا ہوا جسے اسی دن "شاہ روما" بنا دیا گیا۔ مگر یہ شادی بھی ناکامیاب رہی۔ زمانے کے حالات کے ساتھ یہ ملکہ بھی نپولین سے الگ ہی رہی اور اس کے لیے ذہنی پریشانیوں کا باعث بنی رہی۔

"نپولین نے روس پر حملہ کیا جہاں اس کی فوج تباہ ہو گئی۔ واپس آیا تو جرمنی اور برطانیہ نے اس کے خلاف جتھا بنا لیا۔ جس میں آسٹریا اور روس بھی شامل ہو گئے۔ نپولین نے مقابلہ شروع کیا، لیکن اب اس کے پاس کاروان فوج بہت کم رہ گئی تھی اور دشمن سیل کی طرح فرانس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آخری مقابلہ کے لیے روانگی سے پہلے اس نے ماری لوئیس کی صدارت میں ایک نیابتی

کونسل بنادی۔ جب دشمن فرانس میں داخل ہو گئے، تو عام سراسیمگی پھیل گئی۔ نپولین مختصر سی فوج کے ساتھ بجلی کی تیزی سے یکے بعد دیگرے غنیم کے مختلف حصّوں پر گرتا اور شکستیں دیتا رہا۔ لیکن اس طوفان کو متفرق کوششوں سے روکنا ممکن نہ تھا۔ اور اجتماعی کوشش کی صورت نہ بنی۔ اس گردشِ تقدیر کو دیکھ کر نپولین کے بعض جرنیل اور ذمہ دار افسر بھی فاتحوں کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لینے کے خیال سے غداری کے مرتکب ہوئے۔

لڑائی کے ساتھ ساتھ صلح کی گفتگو بھی شروع ہو گئی۔ ماری لوئیس مجلسِ نیابت کی صدر تھی۔ اس کا فرض تھا کہ ہر شے کو شوہر کے مفاد حفاظت کے لیے وقف کر دیتی، جو اس کے بچے کا بھی مفاد تھا، لیکن وہ بالکل بے عزم اور کمزور دل عورت تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ حالات بگڑ رہے ہیں تو سب کچھ چھوڑ کر پیرس سے نکلی اور اپنے باپ کی پناہ میں جانے کے لیے تیار ہو گئی، یہاں تک کہ نپولین سے اجازت بھی نہ لی۔ ہارتنس نے ہر چند روکا، بڑی کوشش کی کہ وہ اپنی جگہ پر جمی رہے، لیکن اس نے ایک نہ سُنی اور نپولین کی ہر امید کا دامن تار تار ہو کر رہ گیا[1]

دبی چنگاری | اتحادی جنگ میں کامیاب ہوئے۔ نپولین نے کسی شرط کے بغیر تخت چھوڑ دیا اور جلا وطن ہو کر ایلبا جانا منظور کر لیا۔ میری لوئیس کے دل میں نپولین کے لیے ہمدردی باقی نہ رہی تھی، چنانچہ اس موقعہ پر اس نے شوہر کے لیے کچھ نہ کیا۔ اس کے برعکس جوزیفائن نپولین کو نہ بھول سکی۔ اس نے نپولین کے ایلبا جانے کی خبر سُنی تو ہارتنس سے روتے ہوئے کہا:

> "آہ ہارتنس! نپولین اس وقت سخت مصیبت میں ہے اور میں اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔ اُسے ایلبا بھیجا جا رہا ہے۔ آہ! اگر اس کی بیوی راستے میں حائل نہ ہوتی تو میں بھی اس جلا وطنی میں اس کے ساتھ رہتی"

۱۴- اپریل ۱۸۱۴ء کو نپولین تخت سے دستبردار ہوا اور کچھ دن بعد ایلبا روانہ ہو گیا۔ جس طرح جوزیفائن کو ابھی تک نپولین نہ بھولا تھا اسی طرح نپولین بھی جوزیفائن کی یاد دل میں بسائے ہوئے تھا۔

---

[1] "جوزیفین" مصنفہ غلام رسول مہر

نپولین نے جوزیفائن اور ماری لوئیس کو ایلبا سے متعدد خطوط لکھے۔ جوزیفائن اس کے خطوط پڑھ کر تڑپ اٹھی، مگر ماری لوئیس کے ہوتے ہوئے وہ نپولین کے پاس نہ جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس ماری لوئیس نے کمال بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا رویہ ایسا ہو گیا گویا نپولین سے اس کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔

جوزیفائن اور نپولین کی خط و کتابت

نپولین نے جلاوطنی کے موقع پر جوزیفائن کے نام ایک خط میں لکھا:

"میری افتادگی بڑی خوفناک ہے، لیکن جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، ممکن ہے یہ مفید ثابت ہو۔ میں گوشہ نشینی میں تلوار چھوڑ کر قلم سنبھال لوں گا۔ اپنے عہدِ حکومت کی تاریخ لکھوں گا۔ جو بڑی عجیب ہو گی۔ دنیا کی نظر ابھی تک میرے چہرے کے صرف ایک حصہ پر پڑ سکی ہے۔ اب میں اصل صورت میں مکمل سامنے آؤں گا۔ مجھے بہتیرے حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھانا ہے۔ بہت سے آدمی ہیں جن کی قدر کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ میں نے ہزاروں ناشکروں کے لیے فوائد کے انبار لگا دیے، لیکن ان سب نے مجھے تباہ کیا۔ ہاں سب نے، لیکن نیک دل اوجین اس مجمع سے مستثنیٰ ہے، جو میرے اور تمہارے لیے باعثِ فخر ہے۔

خدا حافظ! پیاری جوزیفین! صبر کر، جس طرح میں صبر کیے بیٹھا ہوں اور اسے (نپولین کو) بھول نہ جانا، جس نے کبھی تجھے نہیں بھلایا اور کبھی نہیں بھلائے گا۔ جوزیفین! الوداع!!!"

جوزیفین نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا، تو آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا۔ پھر اس نے اپنے بچوں سے کہا:

"اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ شاہنشاہ کو میری رفاقت کی ضرورت ہے۔ یہ فرض مجھ سے بڑھ کر ماری لوئیس پر عائد ہوتا تھا، لیکن اب شاہنشاہ اکیلا ہے۔ اسے سب چھوڑ گئے ہیں۔ میں اسے تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ جب اس پر راحت، مسرت اور شادمانی کا دور تھا تو میں الگ رہ سکتی تھی، لیکن اب مجھے یقین ہے کہ اُسے میرا انتظار ہے۔"

جوزیفین نے نپولین کو لکھا:

"طلاق کی مصیبتوں کا صحیح اندازہ مجھے اب ہوا ہے۔ اب مجھے از سر نو اس بات کا ماتم کرنا پڑا کہ میں آپ کی رفیقہ حیات نہیں بلکہ صرف اشک بہا سکتی ہوں۔ آہ میں اڑ کر آپ کے پاس نہیں پہنچ سکتی اور آپ کو یہ یقین نہیں دلا سکتی کہ جلاوطنی صرف ان لوگوں کے لیے خوفناک ہے جن کے دل پست ہیں۔ ایک پُر خلوص تعلق کو مصیبت کمزور نہیں کر سکتی بلکہ زیادہ مضبوط اور مستحکم بنا دیتی ہے۔

میں فرانس کو چھوڑ کر آپ کے پاس آنے کے لیے سر تن تیار ہوں، تاکہ جس زندگی کے لیے آپ نے زینت کے اتنے سامان بہم پہنچائے اس کے باقی ماندہ سانس آپ ہی کی خدمت میں بسر ہوں۔ صرف ایک مصلحت اب تک عنان گیر ہے۔ اور وہ آپ کو معلوم ہے۔ اگر میں جان لوں کہ صرف مجھے ہی یہ فرض انجام دینا ہے تو کوئی شے میرے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے گی۔ میں فوراً اس مقام پر پہنچ جاؤں گی جو میری خوشی کا آخری ماویٰ ہے اور آپ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاؤں گی جبکہ آپ تنہا ہیں، اور تکلیف میں ہیں۔ آپ کا حکم پہنچتے ہی میں چل پڑوں گی۔ خدا حافظ!" [1]

اس خط میں جوزیفائن کا اشارہ ماری لوئیس کی طرف تھا۔ کیونکہ وہ نپولین کی بیوی تھی اور اس کا فرض تھا کہ وہ نپولین کا ساتھ دیتی۔ جوزیفائن اس سے قانوناً علیٰحدہ ہو چکی تھی لہٰذا ماری لوئیس کی موجودگی میں اس کا وہاں جانا پریشان کن ہوتا۔

اپنے جلنے کی تو خیر ایسی کوئی فکر نہیں!
تیرے پھنکنے پہ مگر آنکھ ہے تر دل ہے حزیں!

ماری لوئیس کا خط!

جوزیفائن اس بات کی منتظر تھی کہ اگر ماری لوئیس نہ پہنچی تو وہ خود وہاں چلی جائے گی، مگر لوئیس تو نپولین کو بالکل ہی بھلا چکی تھی۔ یہ حقیقت نپولین کے

---

[1] "جوزیفین" از غلام رسول مہر

نام میری لوئیس کے اس آخری خط سے ظاہر ہے۔ میری لوئیس لکھتی ہے:

"آپ کو خط لکھے ہوئے ایک صدی گزر گئی ہے۔ آپ کا بھی کوئی خط ایک طویل عرصے سے نہیں آیا۔ آپ کا خط مؤرخہ ۲۰ نومبر میرے والد نے مجھے ابھی ابھی بھیجا۔

یہ سُن کر آپ کی صحت اب اچھی ہے میرے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوگیا ہے۔ یہ پڑھ کر مجھے یک گونہ مسرت بھی ہوئی ہے کہ آپ میرے جذبات کے متعلق بدظن نہیں ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ جب آپ ایک لمبے عرصے تک میری اور اپنے پیارے بچے کی خیریت کی خبر نہ پاتے ہوں گے تو آپ پر کیا گزرتی ہوگی۔ ایک طویل عرصہ تک آپ کی خیریت کی کوئی خبر نہ پاکر مجھ پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ سال آپ کے لیے خوشی کا سال ثابت ہوگا اور آپ اپنے جزیرہ میں خوشی سے زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اور ان لوگوں کو بھی خوش رہنے دیں گے جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔

آپ کا بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے۔ اس نے آپ کو نئے سال کی مبارکباد بھی بھیجی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ آپ کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتا ہے۔ اب تو وہ بڑا بھی ہوگیا ہے اور گہری توجہ سے اپنا سبق یاد کرتا ہے۔ وہ اطالوی اور جرمن دونوں زبانیں سیکھ رہا ہے۔ ابا اسے بہت چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہمیں خوش و خرم رکھیں اور اس رنج و غم کو بالکل بھول جائیں، جو آپ کی جدائی سے ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے۔ ایک بار پھر نئے سال کی مبارک باد قبول ہو۔

(لوئیس)

اس بار خلافِ معمول میری لوئیس نے اپنے خط کو "آپ کی وفا شعار لوئیس" یا "آپ کی پیاری لوئیس" کے الفاظ سے ختم نہیں کیا بلکہ صرف لوئیس لکھ دیا۔ چنانچہ اس سرد مہری کو نپولین نے

بھی محسوس کیا، اُدھر اتحادیوں کے جو معاہدے ہوئے تھے وہ ایک ایک کر کے فسخ ہو رہے تھے اب اُسے وہ رقم نہیں مل رہی تھی جس کا وعدہ اتحادیوں نے اس سے کیا تھا۔ اور نہ ہی اتحادیوں نے اُسے اس کے ذاتی جواہرات اور دوسرا سامان لوٹایا۔ جس کا وعدہ اتحادیوں نے اس سے کیا تھا۔

شہنشاہیت کا دوسرا دَور

لیکن نپولین کو سب سے زیادہ رنج اپنی بیوی اور بچے کی جدائی کا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح ان سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر ڈرامائی طور پر جزیرہ ایلبا سے پیرس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور فرانس کا تاج و تخت چشم زدن میں نپولین کے قدموں میں تھا۔

نپولین کی واپسی نے یورپ کے تاجداروں کو جو اس وقت ویانا میں جمع تھے، سراسیمگی میں ڈال دیا۔ اس کی واپسی کی خبر میری لوئیس کو یکم مارچ ۱۸۱۵ء کو پہنچی۔ وہ خبر سنتے ہی سکتہ میں آ گئی۔ اور اپنے آپ کو ایک کمرہ میں مقفّل کر لیا۔ اس نے سوچا نپولین کی واپسی ایک خونریز جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ نپولین کے واپس آ جانے سے ایک بار پھر یورپ کا امن و امان تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے اور اپنے بچے کو نپولین کے حوالے نہیں کرے گی۔ اور اس نے یورپ کے تمام تاجداروں کو لکھا کہ وہ نپولین کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں۔ اور اپنی باقی ماندہ زندگی اپنے باپ شاہ آسٹریا کے پاس گزارنا چاہتی ہے۔

بزدلی کی حد

یہی نہیں، اس نے اپنے عملے کے تمام فرانسیسی ممبروں کو علٰحدہ کر دیا اور نپولین کے خطوط پڑھنے سے انکار کر دیا۔ جن میں میری لوئیس سے کہا گیا تھا کہ وہ بچے کو لے کر پیرس واپس آ جائے لیکن میری لوئیس پر ان خطوط کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ ان فوجوں کو ایک تماشائی کی طرح دیکھتی رہی جو نپولین کو شکست دینے کے لیے چاروں طرف سے اُمڈ آئی تھیں۔

نپولین نے اس امر کی سر توڑ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے اور اپنی بیوی سے مل لے۔ لیکن ماری لوئیس نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔[1]

فرق فرق

جوزیفائن کا دل آخر دم تک نپولین کی یاد اور اس کے لیے ہمدردی سے بھرا رہا

[1] "میری لوئیس کے خطوط" ترجمہ از عمر عامر (" تنویر" پشاور ۱۹ فروری ۱۹۵۶ء)

رہا۔ چنانچہ وہ اس کی جلاوطنی ہی کے دوران ۲۹ مئی ۱۸۱۴ء کو دکھے دل کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کے برعکس ماری لوئیس آخر دم تک نپولین سے بیزار رہی، یہاں تک کہ جب ماری لوئیس کو نپولین کے دوبارہ گرفتار ہونے کی خبر ملی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

گردش کے دن

۹۔ اگست ۱۸۱۵ء کو نپولین دوبارہ گرفتار کر کے سینٹ ہلینا بھیج دیا گیا اکتوبر ۱۸۱۵ء میں وہ وہاں پہنچا۔ اور کامل چھ سال تک اسیری کی تکلیفیں اٹھاتا ہوا ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔

کس مپرسی کے عالم میں بستر مرگ پر اس نے اپنے ڈاکٹر کو وصیت کی تھی کہ موت کے بعد میرا دل شیشے میں اتار کر میری بیوی (ماری لوئیس) کے پاس لے جانا۔ جب ڈاکٹر ملکہ کے پاس پہنچا تو اسے ایک کانے عہدہ دار سے تعشق کرتے پایا۔ ملکہ نے نپولین کا پیغام سُن کر کہا "میں نے اس کی محبت کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی، اگرچہ میں یہ ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہوں کہ وہ میرے لڑکے کا باپ ہے۔"

وہ سینٹ ہلینا میں دفن ہوا، پھر انیس برس بعد ۱۸۴۰ء میں اس کا تابوت فرانس لے جا کر پیرس کے عین وسط میں دریائے سین کے کنارے دفن کیا گیا اور اس پر شاندار مقبرہ تعمیر ہوا۔

پولائن کے رومان

نپولین اپنی دلفروش بہن کے معاشقوں سے پریشان ہو گیا، اس کا غصہ بھڑک اٹھا، وہ گرج کر بولا "پولائن! تو ایک سنگتراش کے سامنے کیسے ننگی کھڑی ہو گئی؟"
پولائن نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا "میرے پیارے بھائی اس کے کمرے میں آگ جل رہی تھی مجھے سردی نہیں لگی۔"

انتخاب | شام کا وقت تھا، سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ تاہم آنے والی تاریکی کے خوف سے پرندے اپنے اپنے آشیانے کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے اچانک ایک ساتھ کئی بندوقیں چلنے کی آواز آئی۔ لوگ آواز کی طرف لپکے۔ یہ فوجی سپاہیوں کا ایک سوار دستہ تھا جو ہوا میں گولیاں چلاتا پیرس کے بازاروں میں گھومتا پھرتا تھا۔ یہ دستہ ایک بہت بڑی دکان کے قریب سے گزرا۔ راہگیر بدستور ان فوجیوں کو سہمی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک دکان میں سے ایک نوخیز لڑکی چمڑے کا ایک تھیلا لیے باہر نکلی۔ اس کے حسن میں بلا کی کشش تھی۔ عمر چودہ برس سے زیادہ نہ ہوگی مگر اس کے چلنے اور دیکھنے کے انداز بتا رہے تھے کہ اس عمر میں ہی وہ اپنی جوانی کا بہت کچھ اندازہ کر چکی ہے۔ دکان سے باہر آ کر اس نے فوجیوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور انھیں کوئی اہمیت دیے بغیر بے پروائی سے چلی گئی۔

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اسے جلدی کہیں پہنچنا ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسے موڑ پر پہنچی جس کے سامنے ایک وسیع میدان تھا، اور اس کے گرد لوہے کے تاروں کی باڑ لگی تھی۔ وہ تاروں کے اوپر سے گزر کر میدان میں داخل ہوئی جہاں ایک خوش پوش دراز قامت شخص کھڑا تھا، عمر ہوگی کوئی چالیس کے قریب۔ اس نے لڑکی کو دور سے آتا دیکھا تو مسکرایا۔ لڑکی نے بھی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا۔ اور قریب پہنچنے پر دونوں بڑے پرتپاک طریقہ سے ملے۔ لڑکی نے بیگ کھول کر اس میں سے ایک نہایت خوبصورت خنجر نکالا اور اس شخص کو تحفہ کے طور پر پیش کیا اور پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے

ایک طرف کو نکل گئے۔

اس نوخیز لڑکی کا نام پولائن تھا جو دنیا کے مشہور جرنیل نپولین بونا پارٹ کی بہن تھی نپولین بونا پارٹ جس کی سطوت و ہیبت سے کبھی سارا یورپ کانپتا تھا۔

جس شخص کو پولائن نے خنجر تحفہ کے طور پر پیش کیا وہ اس کا محبوب فریرون تھا جو پیرس کا ایک ذی اقتدار اور با اثر شخص تھا۔ اگرچہ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی مگر پولائن چودہ سال کی عمر میں ہی اُسے دل دے بیٹھی تھی اور اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔

آوارگیٔ حسن | پولائن کارسیکا[1] کی رہنے والی تھی جو بحر اوقیانوس کا ایک جزیرہ ہے اور فرانسیسیوں کے ماتحت تھا۔ پھر اپنی ماں کے ہمراہ مارسیلز چلی آئی، جو فرانس کے جنوبی ساحل پر مشہور بندرگاہ ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں پولائن کی بے باکی اور آوارگی کا یہ عالم تھا کہ بندرگاہ پر ملاحوں اور ماہی گیروں کے سامنے برہنہ نہایا کرتی اور اگر کوئی اسے اس فعل پر ٹوکتا بھی تو وہ مطلق پروا نہ کرتی۔ اس زمانہ میں نپولین نے ابھی زیادہ شہرت حاصل نہ کی تھی تاہم وہ فوج میں افسر کا عہدہ حاصل کر چکا تھا۔ جب اُسے اپنی بہن کے متعلق ایسی خبریں پہنچیں تو اس نے اُسے سخت سُست کہا اور اس بے حجابی پر اُسے ٹوکا، پولائن نے وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ ایسا نہ کرے گی مگر اس کی آوارگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

آرامِ جاں | دورِ دہشت میں پولائن اور اس کی ماں مارسیلز سے پیرس چلے آئے۔ یہاں آکر پولائن کی آوارہ طبیعت نے نیا رنگ اختیار کیا۔ وہ فریرون سے عشق کرنے لگی تھی۔ اس کی اپنی عمر چودہ برس سے زیادہ نہ تھی اور اس کے مقابلہ میں فریرون پختہ سن میں داخل ہو رہا تھا۔ فریرون کے ساتھ وہ اکثر سیر کے لیے جایا کرتی تھی اگرچہ اُس کی ماں نے متعدد مرتبہ اُسے ٹوکا مگر وہ فریرون کی طرف اتنی زیادہ مائل ہو چکی تھی کہ اس بارے میں کسی کے اعتراض کو سننا پسند نہ کرتی تھی۔ نپولین کو بھی اس کا علم تھا اور اس نے بھی پولائن کو بہت سمجھایا کہ اس کی یہ حرکتیں نپولین کے لیے بدنامی کا باعث ہیں مگر وہ اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اپنی روش

---

[1] رقبہ ۳۳۶۷ مربع میل۔ آبادی پونے تین لاکھ۔ نپولین بھی اسی جگہ پیدا ہوا تھا۔

نہ ہل سکی۔ وہ بدستور فریروں کے ساتھ گھومتی پھرتی، اور اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور یہ تعلقات عشق کی حد تک پہنچ گئے۔

فریروں بھی پولائن سے حد درجہ عشق کرتا تھا اور دہ جانے اپنے مستقبل کے بارے میں فریروں سے پولائن کی کیا کیا امیدیں وابستہ تھیں کہ اچانک اسے پتہ چلا کہ فریروں کسی دوسری لڑکی سے بھی محبت کرتا ہے۔ اس انکشاف نے پولائن کے دل پر ایک ضرب لگائی اور وہ اداس ہو گئی مگر فریروں ہمیشہ اسے یقین دلاتا کہ وہ صرف اسی کو اپنے دل کی دنیا میں بسائے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی اس کے لیے کشش نہیں رکھتی چنانچہ ایک مدت تک دونوں کے گہرے تعلقات قائم رہے۔

نپولین کا دردِ سر ان دنوں نپولین ترقی کے مدارج طے کرتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی سارے ملک میں اس کی شہرت ہونے لگی تھی۔ فرانس میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے اس نے جو اقدامات کیے تھے ان کے صلہ میں اُسے فرانس کی داخلی فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا، پیرس اس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

ان حالات میں نپولین نے محسوس کیا کہ پولائن کی یہ نازیبا سرگرمیاں تمام لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ فرانسیسی فوجوں کے سپہ سالار کی بہن ایک معمولی اور ادنیٰ آدمی سے یوں عشق لڑائے اور اس کے ساتھ آوارہ پھرے۔ اس سے نہ صرف نپولین کی بدنامی ہی ہوتی تھی بلکہ یہ نپولین کی آئندہ ترقی کے راستے میں بھی رکاوٹ کا باعث تھی۔ چنانچہ نپولین نے بڑی سختی سے اس قباحت کو روکنے کی کوشش کی اور کسی حد تک پولائن کی سرگرمیاں کم بھی ہو گئیں، مگر نپولین کو اکثر جنگی مجبوریوں کے تحت پیرس سے باہر رہنا پڑتا تھا اس لیے وہ پولائن اور فریروں کی ملاقاتوں کو یکسر ختم نہ کر سکا۔ بلکہ نپولین کو یہ اطلاع بھی ملی کہ پولائن اب فریروں کے علاوہ بعض دوسرے افراد کے ساتھ بھی رنگ رلیاں مناتی ہے۔ چنانچہ پولائن کا مسئلہ نپولین کے لیے ایک مستقل دردِ سر کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

نپولین کا عروج فرانس کے لوگوں نے بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کر لی تھی اگر

فرانس کے آس پاس کی بیشتر سلطنتیں جمہوریت کی دشمن تھیں۔ اٹلی کا شمالی حصہ آسٹریا کے قبضہ میں تھا۔ ایک حصے پر پوپ کا تسلط تھا۔ کچھ حصہ نیپلز کے قبضہ میں تھا اور باقی حصوں میں چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم تھیں۔ یہ سب حکمران جمہوریت کے دشمن تھے۔ اور دوسرے استبداد پرستوں کے ساتھ مل کر فرانس کے مقتول بادشاہ کے وارثوں کو تخت پر بیٹھا کر بادشاہت کو بحال کرنے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ جمہوریہ فرانس کو ان سب کے خلاف اقدام کرنا پڑا۔

اس مقصد کے لیے فرانس نے نپولین کو سپہ سالار مقرر کیا اور اس نے اٹلی پر حملہ کر دیا۔ نپولین کی عمر اس وقت ۲۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔ نپولین نے مختلف محاذوں پر شاندار فتوحات حاصل کیں اور ایک سال کے اندر اندر شہنشاہ آسٹریا سے شرطیں منوا کر واپس پیرس پہنچا۔

اس مہم کے بعد سارے یورپ میں نپولین کی شہرت پھیل گئی اور جلد ہی دنیا اس کی عظمت کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئی۔ ان حالات کے تحت اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی بہن کے متعلق بدنامی کی باتیں سن سکے۔ چنانچہ اس نے قوتِ بازو سے اس مسئلے کو حل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پولائن کی شادی کر دے گا۔

پولائن کی شادی

جب اٹلی کا معرکہ سر کرنے کے بعد آسٹریوں کو مغلوب کر کے ان سے صلح کی شرائط منوائی جا رہی تھیں، پولائن کو حکم ملا کہ وہ فوراً میلان پہنچے۔ حکم ملتے ہی وہ میلان پہنچی۔ اس کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی۔ نپولین نے اُسے اس غرض سے بلایا تھا کہ اس کی پسند کے مطابق وہیں اس کی شادی کر دے۔ ابھی نپولین نے اس ضمن میں کوئی اقدام نہ کیا تھا کہ اچانک اسے پتہ چلا کہ پولائن ایک افسر وکٹر ایونل لکرک سے محبت کرنے لگی ہے۔ نپولین نے اس بات کی تصدیق کرنے کے بعد فوراً دونوں کی شادی کر دی۔

کچھ مدت بعد ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ لکرک اور پولائن کو زیادہ مدت تک اکٹھا رہنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اس لیے کہ پھر جلد ہی نپولین نے لکرک کو میدان جنگ میں بھیج دیا اور پولائن پیرس چلی آئی۔

سعی ناکام

چونکہ پولائن کی ابتدائی زندگی آوارگی میں گذاری تھی اور تعلیم میں دلچسپی نہ لی تھی اس لیے نپولین کی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل نہ کر سکی تھی۔ اب نپولین چاہتا تھا کہ اُسے

زیورِ تعلیم سے آراستہ کر دے۔ چنانچہ اُس نے اُسے پیرس کے ایک سکول میں داخل کرایا۔

پولائن اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ باوجود کڑی نگرانی اور پابندی کے وہ تعلیم میں دلچسپی لینے سے عاری تھی۔ سکول کے ڈسپلن کی بھی مطلق پروا نہ کرتی تھی۔ متعدد مرتبہ نپولین کو اس کے متعلق شکایات بھیجی گئیں اور نپولین نے ہر بار اسے سرزنش کی مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی تھی۔ تعلیمی اوقات کے بعد وہ پیرس کے بازاروں میں سیر کرنے نکل جاتی اور مختلف لوگوں کے ہمراہ گھومتی۔ شادی اور بچہ جننے کے بعد بھی اس کی طبعی آوارگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

بدنامی کا تصور اس کے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ چنانچہ وہ کھلے بندوں اپنے دوستوں سے ملتی۔ پیرس کے لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے مگر وہ ان سب سے بے پروا اپنی دھن میں لگی رہتی۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ وہ قہوہ خانوں میں جاتی تو لوگ اُسے دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ ناچ گھروں میں بھی وہ سب لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی رہتی۔ بعض اوقات تھیٹروں میں بھی کام کرتی۔ غرض جہاں بعض لوگوں کے لیے وہ قابلِ نفرت تھی وہاں بہتوں کے لیے ایک دلچسپ شخصیت بھی تھی۔

پولائن کی بیوگی نپولین کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ پولائن کی ان حرکات سے دل ہی دل میں برہم ہو رہا تھا بالآخر اس نے پولائن کو کسی دور دراز جگہ پر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ اس کے شوہر لکرک کو ہیٹی[1] کے جزیرہ میں ایک بڑا عہدہ دے کر بھیج دیا اور پولائن کو اس کے ساتھ جانے کو کہا۔

پولائن اپنے شوہر کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ اسے پیرس اتنا پسند تھا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا چاہتی تھی ـــــ نپولین نے اس پر سختی بھی کی مگر وہ کسی طرح نہ مانی بالآخر اُسے مختلف قسم کے لالچ دیے گئے اور آخر کار وہ ہیٹی جانے پر آمادہ ہو گئی۔

---

[1] جنوبی امریکہ کے مشرق میں بحر اوقیانوس میں جزائر غرب الہند کا ایک جزیرہ۔ جو فرانس کے قبضہ میں تھا۔

بشٹی میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکا تھا کہ لکرک مرگیا اور پولائن واپس پیرس چلی آئی

نیا راستہ لکرک کی موت کے بعد پولائن پھر اپنے پرانے مداحوں اور شناساؤں کے شہر میں پہنچ گئی۔ اس کی شوخ طبعی اب پرانے ماحول میں نئے راستے تلاش کرنے لگی۔ شوہر کی موت سے اُسے صدمہ پہنچا تھا یا نہیں بہرحال اس کی موت کے بعد جلد ہی وہ اپنے بھائی کے جرنیلوں اور دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ کلیلیں کرنے لگی۔ تھیئٹروں سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ کئی ایکٹروں سے بھی اس نے سلسلہ دوستی قائم کر رکھا تھا ان میں سے لفان نام ایک ایکٹر پر وہ بہت مہربان تھی۔ پرنس بورگنیز سے بھی محبت کا دم بھرتی تھی، غرض ایک ہی وقت میں متعدد افراد سے دوستی اور محبت کا دعویٰ کرتی تھی اور اس کا عملی ثبوت دینے میں بھی اُسے کوئی باک نہ تھا

نیا بندوبست پولائن کو دوبارہ ان کارگزاریوں میں مگن دیکھا تو نپولین نے اس بے راہروی سے بچانے کے لیے پرنس بورگنیز سے اسے بیاہ دینے کی ٹھان لی۔ پولائن اس سے پہلے شادی کا تلخ تجربہ کر چکی تھی۔ اور جانتی تھی کہ شادی اس کی آزاد مزاجی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ چنانچہ اس نے شادی کی مخالفت کر دی۔ نپولین نے زبردستی اُسے بورگنیز سے بیاہ دیا اور وہ شہزادی گلسینا کہلانے لگی۔

نپولین نے اس کے شوہر کو اٹلی میں ایک بہت بڑی جائداد دے دی۔ علاوہ ازیں پیرس میں بھی ایک محل انھیں رہنے کے لیے دیا اور دونوں اس محل میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔

فطرت اٹل ہے نپولین کو یقین تھا کہ اب پولائن راہِ راست پر آجائے گی اور آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے گی جس سے اس کی اپنی یا نپولین کی بدنامی کی صورت پیدا ہو۔ مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے پولائن کی رنگین مزاجی میں سرِ مو فرق نہ آیا اور وہ روز بروز زیادہ سے زیادہ دلیر ہوتی گئی۔ فوجی افسروں اور تھیئٹر کے ایکٹروں کے ساتھ اس کی شوخیاں اور رنگ رلیاں اسی طرح قائم رہیں۔ یہاں تک کہ ایک موقعہ پر جب ایک مشہور سنگ تراش نے اپنے ایک بت کے لیے پولائن کو نمونہ بنانا چاہا تو وہ اس کے کمرے میں اس کے سامنے کپڑے اتار کر نمونہ بن کر کھڑی ہو گئی۔

نپولین کو اس واقعہ کا علم ہوا تو غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ اُس نے گرج کر پوچھا "پولائن! تو ایک سنگتراش کے سامنے کیسے ننگی کھڑی ہو گئی؟" پولائن نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا "پیارے بھائی، اس کے کمرے میں آگ جل رہی تھی، مجھے سردی ذرا محسوس نہیں ہوئی۔"

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب نپولین کا آفتابِ اقبال غروب ہونے والا تھا۔

غروب آفتاب ایک زمانہ تھا کہ یورپ کی ساری سلطنتیں نپولین کے قدموں میں تھیں، پھر وہ وقت آیا کہ دشمن فرانس میں داخل ہوئے اور نپولین نے کسی شرائط کے بغیر تخت چھوڑ دیا اور اتحادیوں کی تجویز کے مطابق جلاوطن ہو کر ایلبا[1] جانے پر مجبور ہو گیا۔ ابتری کے ان ایام میں پولائن کے دل میں بھائی کی محبت غالب رہی اور وہ اسے ہر طرح سے مدد دیتی رہی یہاں تک کہ خود بھی اس کے ساتھ جلاوطنی قبول کی۔ نو ماہ کی جلاوطنی کے بعد جب نپولین ایلبا سے بھاگ کر دوبارہ فرانس آیا تو پولائن بھی ساتھ تھی۔ جب دوبارہ نپولین کو سینٹ ہلینا[2] میں نظر بند کر دیا گیا تو اس وقت پولائن بیمار تھی اور اس کی صحت بہت گر چکی تھی چنانچہ وہ انتہائی خواہش کے باوجود اس کے ساتھ نہ جا سکی۔

نپولین کی جلاوطنی کے تھوڑے ہی دنوں بعد پولائن ناسور کے مرض میں مبتلا ہو گئی، جو اس کا خاندانی مرض تھا اور اسی مرض سے وفات پائی۔

بلاشبہ وہ فرانس کی خوبصورت ترین عورت تھی خود نپولین نے ایک مرتبہ یہ الفاظ کہے تھے کہ "پولائن فرانس کی سب سے حسین لڑکی ہے"۔ پولائن خود بھی اس حقیقت سے واقف تھی اور آخر دم تک اپنے حسن پر فخر کرتی رہی چنانچہ اپنے مرنے کے دن اس نے آئینہ سامنے رکھا اور خاصی دیر تک اپنے حسن کا مطالعہ کرتی رہی پھر بولی "خدا کا شکر ہے میں اب بھی خوبصورت ہوں" اور تھوڑی دیر بعد مر گئی۔

---

[1] اٹلی کے قریب بحیرہ روم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے ۱۸۱۴ء میں نپولین جلاوطن ہو کر اس جزیرہ میں پہنچا۔

[2] افریقہ کے مغربی ساحل سے قریباً ۱۲ ہزار میل کے فاصلہ پر بحر اوقیانوس کا ایک جزیرہ۔ رقبہ ۴۷ مربع میل۔ آبادی ۵ ہزار کے قریب۔ نپولین اس جزیرہ میں ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۱ء تک نظر بند رہا ۱۸۲۱ء میں وفات پائی۔ پھر ۱۸۴۰ء میں اس کا تابوت پیرس لا کر دفن کیا گیا۔

شہنشاہِ روس پیٹر اعظم کا رومان

شہنشاہ نے کیتھرائن پر ایک افسر سے ناجائز تعلقات کا الزام لگایا۔ اس الزام کے ساتھ ہی شہنشاہ کی محبت نفرت میں بدل گئی تھی اور افسر کو سرِ شام قتل کرا دیا گیا۔ کیتھرائن کو اپنے نعل کا ڈر تھا۔

پیٹر اعظم کون تھا؟

پیٹر اعظم روس کا بڑا پُرشکوہ شہنشاہ گزرا ہے، جسے زارِ روس[1] بھی کہتے ہیں پیٹر اعظم نہایت قابل اور صاحب جبروت بادشاہ تھا۔ ۱۶۷۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۵ء میں ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے روس کی بحری اور بری فوج کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا۔ اس نے خود جہاز سازی کا فن سیکھا تھا۔ سینٹ پیٹرزبرگ کا شہر اُسی نے بسایا تھا ۱۷۰۳ء میں اُس نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ شہر اب سٹالن گراڈ کے نام سے موسوم ہے۔ پیٹر اعظم بہت قابل جرنیل بھی تھا۔ اس نے لوونیا، فن لینڈ، پومرانیا وغیرہ فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیے اور روس کی سرحدیں دُور دُور تک پھیلا دیں۔

ابتدائے عشق

پیٹر اعظم کی زندگی گوناگوں مصروفیات کی زندگی تھی۔ اس کا اکثر وقت ملکی نظم و نسق کی برقراری اور مہمات میں صرف ہوتا اسے اپنے پایۂ تخت میں قیام کرنے کے لیے بہت کم فرصت ملتی۔ پھر اس کے عادات و خصائل اور اس کی طبیعت ایسی تھی کہ اس کے متعلق یہ قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی عورت پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ تاہم پولٹووا کی جنگ نے اس کے لیے رومانی زندگی کا ایک دروازہ کھول دیا اور سویڈن کی ایک حسین دوشیزہ اس کی محبت کا مرکز بن گئی۔ اس دوشیزہ کا نام کیتھرائن تھا۔

---

[1] "زار" روس کے بادشاہوں کا عام لقب تھا۔ زار کو مذہبی اور دنیوی دونوں لحاظ سے اپنی رعایا کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ اور دربار و کلیسا دونوں جگہ ان کے سامنے سر جھکانا ضروری تھا۔ زاروں کی حکومت مطلق العنان شاہی کی بدترین قسم تھی۔ اور روس کے لوگ ایسے بادشاہوں سے نالاں تھے۔

محبوبہ کون تھی؟ کیتھرائن کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ پولٹویا کی جنگ میں جو قیدی پیٹر کے ہاتھ لگے ان میں کیتھرائن بھی تھی جو سویڈن کے ایک فوجی کی بیوی تھی۔ یہ فوجی اس جنگ میں مارا گیا تھا۔ پیٹر اُسے دیکھ کر دل ہار بیٹھا اور اُس سے شادی کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر وہ چونکہ معمولی درجہ کی عورت تھی، اس لیے اسے ملکہ بنانا آسان کام نہ تھا چنانچہ پیٹر اُسے اپنے ساتھ سینٹ پیٹرزبرگ لے گیا اور بعدازاں اس سے شادی کر لی اور ملکہ کا اعزاز بخشا۔ مگر ایک اور بیان کے مطابق وہ سویڈن کے ایک گاؤں بریرن برگ کی رہنے والی تھی۔ مگر والدین کے مرنے کے بعد ایک پادری کے پاس رہنے لگی۔ اس پادری کا نام مسیحی کاف تھا۔ مسیحی کاف کا بیٹا کیتھرائن کی طرف مائل ہونے لگا اور اُس سے چھیڑخانی کرنے لگا تو وہ ایک دن گھبرا کر اس کے گھر سے نکل گئی۔ جب پادری کو پتہ چلا تو اس نے پیچھا کیا اور اُسے واپس گھر لے آیا۔ مگر کیتھرائن کا یہاں جی نہ لگتا تھا۔

لیوونیا کی سنسان سڑک پر دو ساتھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلے آ رہے تھے۔ مسیحی کاف سوچ رہا تھا کہ کیتھرائن کو پا لینے کی امنگ ہر نوجوان دل میں تڑپتی ہے۔ میری ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود لڑکا کیتھرائن پر مٹا ہوا ہے۔

"وہ بھی تو نزدوش ہے" مسیحی کاف کے ہونٹ ایک لمحہ کے لیے کانپے اور دونوں سائے منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ملاقات برف پگھلنے لگی تھی اور آمدِ بہار نے دلوں کو گرما دیا تھا۔ لارڈ مسیحی کاف کے مکان کو پھولوں سے سجایا جا رہا تھا، کیونکہ پیٹر اعظم شہنشاہ روس اس مکان میں نزول اجلاس فرمانے والے تھے۔ محل کے پاسبان زرق برق لباس پہنے چست و چوبند نظر آ رہے تھے۔ لیکن کیتھرائن اپنے حسن کی سحر خیزیوں کو یکسر بھولی ہوئی تھی۔ شہنشاہ کی آمد سے اُسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں بھولی تھی کہ اس کے ضعیف باپ نے دوا نہ ملنے کی وجہ سے دم توڑ دیا تھا۔ ماں کا جھریوں سے بھرا چہرہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے گھومتا تھا۔

محل کے پاسبان ایک ایک کر کے پیٹر اعظم کے سلام کے لیے لائے گئے۔ کیتھرائن مجرموں کی طرح گردن جھکائے ملازمین کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ لوگ پیٹر اعظم کو سلام کر چکے تو کیتھرائن ڈھیلے

ڈھاسے لباس میں آ گئے بڑھی اور پیٹر اعظم کو سامنے پاکر غیر ارادی طور پر گردن جھکا دی۔

"سلطانِ عالم! یہ کیتھرائن ہے۔" مسیچی کاف کیتھرائن کے بھولے پن پر مسکرا دیا۔ پیٹر اعظم ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھے چلا جا رہا تھا۔

مسیچی کاف نے گھبرا کر پیٹر اعظم کی طرف دیکھا۔

"آج سے کیتھرائن کی تربیت شاہی پیمانہ پر ہونی چاہیے۔"

"سلطانِ عالم!" مسیچی کاف کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"یہ ہمارا حکم ہے" پیٹر اعظم نے کیتھرائن کا ہاتھ تھام لیا۔

بات بڑھتی ہے کیتھرائن اور پیٹر کے عشق و محبت کے چرچے تمام روس میں ہونے لگے۔ روس کے سیاسی حلقے کیتھرائن کی محبت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن پیٹر اعظم کیتھرائن کو پہلو میں بٹھا کر تخت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ کیتھرائن کی عمر اس وقت تیس سال تھی لیکن روس کی تمام مجالس میں اس کے حسن و شباب کے چرچے تھے۔ شادی کو کئی سال بیت گئے۔ روس میں قیامت خیز ٹھنڈی ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ کیتھرائن فرکوٹ پہنے سنگِ مرمر کے فرش پر خاموش بیٹھی تھی۔ آنسو آنکھوں میں امڈ آتے تو رومال سے پونچھ ڈالتی نگاہیں سڑک پر لگائے وہ کچھ سوچ رہی تھی، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

رات بیت رہی تھی، کیتھرائن بے حد غمگین نظر آ رہی تھی۔ پیٹر اعظم کی طرف سے اس پر ایک افسر سے ناجائز تعلقات کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس الزام کے ساتھ ہی پیٹر اعظم کی محبت نفرت میں بدل گئی تھی اور سرِشام افسر کو قتل کرا دیا گیا تھا۔ اور کیتھرائن کو اپنے زوال کا ڈر تھا

اس نے نظر اٹھا کر سڑک کو گھورا۔ سڑک بدستور سنسان اور خاموش تھی۔ اس نے رومال سے آنکھوں کو صاف کیا اور اٹھ کر باغیچے میں ٹہلنے لگی۔ دُور سڑک پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ سایہ بوجھل قدم اٹھاتا آ بڑھنے لگا۔ آخر سایہ سڑک کے موڑ پر آ کر رک گیا۔

"کیتھرائن! کیتھرائن!! تم کہاں ہو؟" کئی سال پہلے کی طرح ایک آواز خوابیدہ جمود میں کانپی۔

"میں یہاں ہوں آقا!" کیتھرائن نے روتے ہوئے کہا۔

سایہ اس کے اور قریب آگیا۔ کیتھرائن کو وہ رات یاد آگئی جب وہ بے سہارا لیبودینا کی سنسان سڑک پر کھڑی تھی اور مسیحی کاف نے پیار بھری آواز میں اسے پکارا تھا۔

"کیتھرائن کیتھرائن! تم کہاں ہو؟" اس نے جوشِ عقیدت میں مسیحی کاف کے ہاتھ چوم لیے۔

مسیحی کاف ایک لمحہ کے لیے کیتھرائن پر جھکا اور سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔

"میرے دوست! میرے ہاتھ بہت نازک ہیں" کیتھرائن رونے لگی۔

"انسان اپنی عزت کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرتا" مسیحی کاف نے اپنا فرکوٹ اٹھایا اور چل دیا۔

ایک صبح جب سورج کی کرنوں نے محل میں نصب سینٹ پال کے مجسمہ کو چھوا تو محل "کیتھرائن اعظم زندہ باد!" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ یہ پیٹر اعظم کی موت کا اعلان تھا اور کیتھرائن اعظم روس کی واحد ملکہ تھی۔ لوگ پیٹر اعظم کی موت پر حیران و ششدر اور محل کے آس پاس ایک نحیف سایہ بدستور منڈلا رہا تھا۔"[1]

حمد شکر ہم بھی مٹ کے ترا نقشِ پا بنے
حاصل ہوا کمال یہ الفت کی راہ میں!

(عظیم لاہوری)

---

[1] "سنگم اور سایے" مصنفہ عبدالعزیز رشک

شاہ الفونسو کا رومان

۱۴ اپریل ۱۹۳۱ء کی ہیبت ناک رات دو محبت بھرے دلوں کے لیے المناک جدائی کا پیغام لے کر آئی۔ الفونسو کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ملکہ اپنے وطن کو چلی گئی وقت کے ساتھ ساتھ محبت کے نقوش بھی مدھم ہوتے گئے اور حسن و عشق کی روح پرور داستان اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کیف و غم کا امتزاج بن گئی۔

ناخوشگوار ماحول ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا، مراکش کے مسلمانوں میں فرانس اور سپین کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جرمنی کا قیصر ولیم طنجہ[۱] میں اترا ہوا تھا۔ اس نے سلطان مراکش کو یقین دلایا کہ وہ فرانس اور سپین کے خلاف اس کی مدد کرے گا۔ اس سے پیشتر قیصر نے امریکہ کے صدر کو خط لکھا تھا کہ فرانس اور سپین مل کر مراکش کو آپس میں تقسیم کر لینا چاہتے ہیں اور اپنے سوا باقی ساری دنیا کو اس علاقے کی تجارتی منڈیوں سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں تاہم وہ کسی ایک قوم کے قبضہ اختیار میں نہ جائے اور دنیا کی سب قومیں اس کی منڈیوں سے یکساں فائدہ اٹھائیں۔

سپین کے پاس مراکش کا جو علاقہ تھا اس میں ریف کے مقام پر بربر قوم رہتی ہے۔ یہ بہت جنگجو اور بہادر لوگ ہیں۔ انھوں نے سپین سے آزادی حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور شورشیں کرنے لگے۔ سپین کا بادشاہ انھیں دبانے میں ناکام رہا، جس کے نتیجہ میں اہل سپین اس کی مخالفت کرنے لگے اور اس پر نااہلی اور سستی کے الزام لگائے جانے لگے۔

دوہری مصیبت میڈرڈ[۲] کے شاہی محل میں سپین کا بادشاہ الفونسو[۳] سر جھکائے بیٹھا تھا۔

---

[۱] مراکش کا ایک تجارتی شہر۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ [۲] ۱۵۶۰ء سے سپین کا صدر مقام چلا آتا ہے۔ رقبہ ۲۰۰۹ مربع میل ہے، آبادی ساڑھے اٹھارہ لاکھ کے قریب ہے۔ [۳] واضح رہے کہ اس بادشاہ سے پہلے بھی سپین میں الفونسو نام ایک بادشاہ گزرا ہے (۱۲۲۱ - ۱۲۸۴ء) جو علم نجوم میں ماہر تھا۔ اُسے دانا سلطان کہتے تھے۔ اُس کے بیٹے سانچو نے ۱۲۸۲ء میں اسے تخت سے اتار دیا تھا۔

وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ معلوم ہوتا تھا مراکش کے حالات نے اس کی رعایا کے دلوں میں بے اطمینانی کی جو لہر دوڑا دی ہے اس نے اُسے فکرمند بنا دیا ہے۔ اگرچہ بادشاہ کی پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی مگر اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے اُسے متفکر بنا رکھا تھا چند ماہ پیشتر وہ انگلستان سے ہو کر واپس لوٹا تھا۔ اور واپسی کے بعد سے ہی اس کی حالت میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ آزردہ اور فکرمند رہنے لگ گیا تھا۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ حکومت کے معاملات کو انجام دینے میں پہلے سی سرگرمیاں نظر نہ آتی تھیں ——— انگلستان کی حسین و جمیل اور نوخیز شہزادی اس کے دامن صبر و قرار میں آگ لگا چکی تھی اور وہ ہر وقت اسی کے خیال میں گم رہنے لگ گیا تھا۔

جس میں کوئی تارا ٹوٹے جس میں کوئی جگنو چمکے
میرے مقدر کی راتوں میں ایسی کوئی رات نہیں

دُور افتادہ محبوبہ شہزادی اینا انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ الفونسو سے اس کی ملاقات بکنگھم محل میں ہوئی جہاں وہ ایک موقع پر دعوت میں شریک تھا۔ اینا کا حُسنِ بےنظیر دلوں کو موہ لیتا تھا۔ وہ ماں کے دل کا چین اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ الفونسو نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ شہزادی کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی اور الفونسو عمر کی انیسویں منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔ الفونسو سپین واپس آ گیا مگر اپنا دل انگلستان ہی میں چھوڑ دیا۔ اینا کی موہنی صورت اس کے دل پر نقش ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں جا بجا شہزادی کی تصویریں آویزاں کر رکھی تھیں۔ جب بھی کمرے میں آتا انھیں دیکھ دیکھ کر اپنا جی بہلاتا۔

شادی کی کٹھن راہیں الفونسو نے شہزادی کی ماں بیٹرس سے اس بارے میں سلسلہ جنبانی کیا اور اینا کے ساتھ شادی کی درخواست کی۔ بیٹرس آمادہ ہو گئی مگر اس شادی کے سلسلے میں مذہب رکاوٹ بن گیا۔ اینا پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتی تھی اور الفونسو رومن کیتھولک تھا۔ اگرچہ دونوں عیسائی تھے مگر فرقوں کی یہ تخصیص اپنی جگہ بہت اہم تھی۔ انگلستان کے لوگ یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کی شہزادی کیتھولک مذہب کے شخص سے

شادی کرے۔ اس طرح اہل سپین کو بھی یہ قبول نہ تھا کہ الفونسو غیر مذہب کی شہزادی سے نکاح کرے۔ یہ بہت بڑی مصیبت تھی۔ الفونسو ہر حالت میں شہزادی سے نکاح کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملک کے لوگ اس کے خلاف ہو جائیں گے اور شاید بدامنی پھوٹ نکلے۔ چنانچہ وہ بہت افسردہ رہنے لگا۔

اگرچہ شادی کے راستے میں بہت سے خطرات تھے۔ شہزادی کی ماں کو بھی پوری طرح علم تھا کہ انگلستان کا چرچ اُسے اس شادی کی اجازت نہ دے گا مگر بالآخر معاملہ طے ہو گیا۔ سردی کے موسم میں شہزادی اینا اپنی ماں کے ہمراہ سپین آئی ہوئی تھی۔ یہ دونوں مارسکوٹ[1] کے گاؤں میں مقیم تھے۔ الفونسو کو اطلاع کی گئی۔ وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ سعی اٹھائے نہ رکھا۔ اس اثنا میں شہزادی کی ماں اور بادشاہ کے درمیان شادی کے تمام پہلوؤں پر باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر طے ہو گیا کہ نکاح کر دیا جائے۔ الفونسو نے شہزادی کی والدہ کو حوصلہ دلایا کہ وہ لوگوں میں شورش نہیں پھیلنے دے گا اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ سختی سے اسے دبا دے گا۔ اینا بھی الفونسو سے محبت کرنے لگ گئی تھی اس نے اس سمجھوتے پر خوشی کا اظہار کیا اور ماں سے کہہ دیا کہ وہ الفونسو کے لیے ہر قسم کی مصیبت برداشت کرے گی۔

الفونسو اور اینا کا نکاح ہو گیا۔ دونوں ملکوں میں اس نکاح کے خلاف آوازیں اٹھیں مظاہرے ہوئے۔ لوگوں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ اہل انگلستان اور اہل سپین دونوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا مگر بالآخر یہ بدامنی دبا دی گئی۔

نکاح کے بعد شاہ الفونسو متعدد مرتبہ انگلستان گیا اور شاہی مہمان کی حیثیت میں رہتا رہا چنانچہ شاہی خاندان سے اس کے گہرے روابط قائم ہو گئے۔ شہزادی اینا بھی اپنی والدہ کے ہمراہ ایک دو مرتبہ سپین آئی اور بادشاہ کے مہمان رہے۔ بالآخر رخصتی کا دن آ پہنچا۔

شادی کا سانحہ | انگلستان اور سپین دونوں ملکوں میں سرکاری طور پر اس شادی کی خوشیاں

---

[1] سپین کی شمالی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں لوگ سیر و تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔

منائی گئیں۔ میڈرڈ کے بازار اور گلی کوچے خوب سجائے گئے۔ اگرچہ بیشتر لوگ خصوصاً مذہبی حلقے اس شادی سے مطمئن نہ تھے اور اسے مذہباً جائز قرار نہ دیتے تھے تاہم شاہی دبدبے کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ دولہا اور دلھن شاہی گاڑی میں محل سے روانہ ہوئے ۔ گاڑی گرجے کے سامنے جاکر رکھی۔

شرپسند گروہ جو دل سے اس شادی کے خلاف تھا مگر بہ ظاہر کچھ نہ کہتا تھا۔ اس موقعہ پر حرکت میں آیا۔ شاہی گاڑی پر بم پھینکا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ بچ گئے مگر بہت سے دوسرے بے گناہ مارے گئے۔ بیس سے زیادہ لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ خوشی کی محفل اچانک غم میں ڈوب گئی۔ ہر شخص کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ شاہی محافظ دستوں نے لوگوں کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔ اور بادشاہ اور ملکہ کو گاڑی میں بٹھاکر بہ حفاظت تمام محل میں واپس لایا گیا۔ اس حادثے سے جہاں دوسرے لوگ متوحش اور مغموم تھے وہاں بادشاہ اور ملکہ کے چہروں پر فکر کی کوئی علامت نہ تھی بلکہ وہ مسکرا رہے تھے ——— شاید اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے۔

"دنیا دو دلوں کی محبت کو گوارا نہیں کر سکتی اینا" الفونسو نے محبت بھری نگاہوں سے ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بادشاہ درست فرماتے ہیں۔ فتنہ پرور لوگوں کو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے" ملکہ بولی۔

"تمہارے ملک کے لوگ شورشیں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ حکومت کے کاموں میں خلل پیدا کرکے بادشاہ کو سختی کرنے پر مجبور کرنا تو ان کا مشغلہ تھا ہی اب بادشاہ کے ذاتی معاملات میں بھی دخل دینے لگ گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں اینا۔ چند مذہبی لوگوں نے میرے خلاف باتیں کرنی شروع کر رکھی ہیں، اور جب سے انھیں پتہ چلا ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس وقت سے فضا اور خراب ہو گئی ہے۔ تمھیں یاد ہوگا میں نے مارسکوٹ میں تمھاری والدہ کو یہ ساری باتیں تفصیل سے بتائی تھیں اور میں نے تم سے اور تمھاری والدہ سے بیان کیا تھا میں اس مخالفت کو سختی سے دباؤں گا۔ مجھے ان سرکردہ آدمیوں کا بھی علم ہے جو اس مسئلہ سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اطمینان سے ہی دن گزار لیں، پھر

ان سے نبٹ لوں گا۔" الفونسو نے کہا۔

رات کو میڈرڈ کے شاہی محل میں سرکاری مہمانوں کی دعوت ہوئی۔ شاندار جشن منایا گیا۔ اگرچہ بم سے مارے جانے والوں کے لیے شہر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی، مگر شاہی محل ماتمی فضا سے یکسر پاک تھا۔ وہاں رات بھر شراب و کباب کی محفل منعقد رہی۔ ملکہ اور بادشاہ بھی خوشی کے عالم میں رات بھر جاگتے رہے۔ دوسرے دن دونوں کچھ دنوں کے لیے کسی نامعلوم مقام پر چلے گئے اور ایک ماہ تک سیر و تفریح کرنے کے بعد واپس میڈرڈ لوٹے۔

عیش کے دن شاہ نے باغیوں اور مشتبہ لوگوں کی فہرست بنائی اور انھیں گرفتار کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ کئی مشتبہ لوگ دھر لیے گئے۔ بم کے سلسلے میں تحقیقات اسی وقت شروع ہو گئی تھیں چنانچہ پولیس نے کئی لوگوں کو گرفتار کیا۔ ان سب کو سخت سزائیں دی گئیں۔ شر پسندوں کے مرکز تباہ کر دیے گئے۔ اس تشدد کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں امن و سکون نظر آنے لگا اور بادشاہ اور ملکہ اس پُر امن فضا میں عیش کے دن گزارنے لگے۔

خوشی کا وقفہ ابھی تک سپین کی عام حالت اچھی نہ تھی۔ بے روزگاری عام تھی۔ کساد بازاری زوروں پر تھی۔ رشوت، فریب کاری اور جعل سازی کے واقعات کثرت سے ہو رہے تھے۔ صنعت کاروں، مزدوروں اور کاشتکاروں کی حالت ابتر تھی۔ غرض عوام خستہ حالی کا شکار تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کے خلاف لوگوں میں بددلی پیدا ہو چکی تھی۔ بادشاہ کی شادی کے موقع پر جو افسوسناک واقعات رونما ہوئے، وہ بھی دراصل انھیں حالات کا نتیجہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بادشاہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اگر عوام مشتعل ہو کر حکومت کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں، تو انھیں تشدد سے دبایا تو جا سکتا ہے مگر نہ ہی عوام کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہو سکتا ہے اور نہ ہی بادشاہ چین پا سکتا ہے۔ سپین کے حالات ابھی تک ایسے ہی تھے۔ الفانسو اپنی محبوبہ کو حاصل کر لینے کے بعد ایک نئی اطمینان بخش زندگی کے دور سے گزر رہا تھا۔ تاہم ملک کے عام حالات بادشاہ اور ملکہ دونوں کے لیے تکلیف کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اچانک وہ دور بھی آگیا جس نے بادشاہ اور ملکہ کی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو دوبالا کر دیا یعنی ۱۹۱۴ کی جنگ عظیم

چھڑ گئی جو دنیا بھر کے لیے تباہی کا پیغام لے کر آئی تھی مگر سپین پر خوش بختی کے دروازے کھولنے کا موجب بنی۔

اس جنگ میں سپین غیر جانبدار رہا۔ اس غیر جانبداری نے سپین کو بہت فائدہ پہنچایا جنگ کی تمام متحارب طاقتوں نے سپین سے مال منگوانا شروع کر دیا۔ جس سے سپین کی صنعت و حرفت اور تجارت چمک اٹھی۔ سینکڑوں نئے نئے کارخانے کھل گئے۔ بے روزگاروں کو روزگار مہیا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ملک میں ڈھونڈے بھی کوئی بے کار شخص نظر نہ آتا تھا۔ کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں دن رات کام ہونے لگا۔ مرد اور عورتیں دن رات کام کرتے نظر آتے۔ یورپ کے کونے کونے سے لاکھوں فرمائشیں آتیں اور کروڑوں روپے کا مال تیار ہو کر باہر جاتا۔ اسپین کے صنعت کار اور کارخانہ دار منہ مانگی اجرت اور قیمت وصول کرتے۔ غرض لوگوں کی خوابیدہ قسمت جاگ اٹھی اور ہر طرف اطمینان و سکون نظر آنے لگا۔

پھر وہی افتاد جنگ چار پانچ سال تک جاری رہی اور اس اثنا میں اہل سپین نے خوب روپیہ کمایا۔ لوگوں کی توجہ کاروبار کی طرف مبذول رہی جس کے نتیجہ میں کئی دن کی شورشیں ختم ہو گئیں۔ بادشاہ اور ملکہ بھی آرام اور سکھ کے دن بسر کرتے رہے۔

مگر خوشی کا وقفہ عارضی اور بہت مختصر تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر تجارتی فرمائشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جس تیزی سے جنگ کے دوران نئے نئے کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں کھلی تھیں اب اسی تیزی کے ساتھ بند بھی ہونے لگیں۔ لوگ بے کار ہوتے گئے، کاروبار اکھڑ گئے۔ اور پھر وہی بے اطمینانی پیدا ہونے لگی۔ بے کاروں اور بے روزگاروں کی بڑھتی ہوئی فوج نے ملک میں اودھم مچا دیا۔ ہڑتالیں اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ سکھ چین کے قلیل عرصہ کے بعد بادشاہ اور ملکہ کے لیے پریشانی کا طویل دور شروع ہو گیا۔ ے

حیات کے مسئلوں کو سلجھا رہا ہوں لیکن یہ سوچتا ہوں
کہ ان کے الجھاؤ میں بھی شاید تیری ہی زلفوں کا پیچ و خم ہے

غم ہی غم الفانسو جب سے تخت پر بیٹھا تھا اسے امن و سکون سے رہنا نصیب نہ ہوا تھا۔ بادشاہت کے ابتدائی دنوں ہی سے اسے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ شادی سے

قبل بادشاہت کے زمانہ میں وہ اینا کے فراق میں تڑپتا رہا تھا۔اس کے بعد جب شادی ہو گئی تو ملکی ہنگاموں نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔لوگ پہلے ہی سے تنگ آئے ہوئے تھے پھر اس کی شادی کے مسئلے نے مخالفوں کے دل کی آگ کو اور بھڑکایا۔اور انھوں نے بادشاہ کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔وہ اپنی ملکہ کے ہمراہ آزادی سے گھوم پھر بھی نہ سکتا تھا اس لیے کہ اُسے اپنی اور ملکہ کی جان کا خطرہ تھا۔جنگ عظیم کے دوران اسے تین چار سال کے لیے سکون کا موقع ملا تھا۔مگر اب پھر وہی حالات درپیش تھے؛ وہ اپنی قسمت کا شاکی ہو گیا۔

محبوبہ کو مشورہ

"پیاری اینا" اس نے ایک دن ملکہ سے مخاطب ہو کر کہا "مجھے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ میں تمھاری خوشیوں میں اضافہ نہ کر سکا۔میں جانتا ہوں کہ تم میرے لیے ہر قسم کی مصیبت اٹھانے کو تیار ہو۔مگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ تم خواہ مخواہ میرے لیے پریشان رہو۔تم جانتی ہی ہو ملک کے حالات اچھے ہونے میں نہیں آتے۔اگر تم چاہو تو کچھ مدت کے لیے اپنے والدین کے پاس انگلستان جا سکتی ہو، میں وہیں تم سے ملنے آجایا کروں گا۔تمھارے یہاں رہنے میں مجھے تمھاری جان کا خطرہ نظر آتا ہے۔"

"پیارے سرتاج" ملکہ نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ مجھے انگلستان جانے کا مشورہ کیوں دیتے ہیں۔میں نے آپ کی خاطر انگلستان چھوڑنا قبول کیا اور آپ کی خاطر سب دکھ سہنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"نہیں پیاری" بادشاہ نے کہا "تم میرے لیے اپنی جان کو عذاب میں نہ ڈالو۔میری رعایا مجھ سے شاکی رہتی ہے۔میں تو یہ کر نہیں سکتا کہ شاہی خزانے سے ہر شخص کے لیے وظیفہ مقرر کر دوں، ہاں یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ ان پر تلوار کے زور سے حکومت کرتا رہوں اور مجھے یقین ہے کہ لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ میری سختی کے جواب میں بعض عناصر اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئیں گے جس کے لیے میں ہمیشہ تیار رہا ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ (اینا کا بوسہ لیتے ہوئے) میری پیاری ملکہ کو کوئی نقصان پہنچے۔"

"عزیز از جان بادشاہ! بادشاہوں کو ایسے معاملات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔مجھے ان باتوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی اور نہ ہی میں ان سے خوف کھاتی ہوں۔میری ساری تکلیفیں ختم

باقی ہیں جب آپ کے آغوش محبت میں جگہ پاتی ہوں۔ آپ سے دُور رہ کر میں شاید زندہ بھی نہ رہ سکوں" ملکہ نے کہا۔

" ملکہ پیاری! جب انسان بیکار ہو جاتا ہے تو اسے طرح طرح کی شرارتیں اور بدمعاشیاں سوجھتی ہیں۔ ہمارے ملک نے جنگ کے دوران گلچھڑے اڑائے ہیں۔ لوگوں نے جی بھر کر روپیہ کمایا ہے اور عیش کیا ہے۔ اب لوگ بے کار ہو گئے ہیں اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ سیاستدان بنا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اگر انھیں کام مہیا کر دیا جائے تو سب ٹھیک ہو جائیں" بادشاہ نے کہا[1]

" لیکن کام کس کس کو مہیا کیا جائے نصف سے زیادہ آبادی بے کاری کی مریض ہے۔ اتنے لوگوں کے لیے کوئی بڑا منصوبہ ہی بنایا جائے" ملکہ نے کہا

" میں نے منصوبہ سوچ لیا ہے" بادشاہ بولا " میں نے تمام بے کار لوگوں کے لیے کام تجویز کر لیا ہے۔ اب یہ لوگ مصروف ہو جائیں گے"

" وہ کونسا منصوبہ ہے" ملکہ نے پوچھا۔

" عنقریب آپ دیکھ لیں گی ملکہ!" بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بوسہ دیا۔ بادشاہ اور ملکہ دونوں خوش تھے۔

نیا کام | مراکش کا جو حصہ سپین کے قبضے میں تھا اس میں مدت سے بدامنی چلی آتی تھی ۱۸۹۳ء میں یہاں پہلی مرتبہ بغاوت ہوئی تھی۔ جو فرانسیسی مراکش کی بغاوت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کے

---

[1] مراکش کا بادشاہ بہت فضول خرچ تھا چنانچہ وہ اپنی عیاشیوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کے باعث فرانس کا مقروض ہو گیا۔ اور فرانس کو مراکش میں قبضہ جمانے کا موقع مل گیا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ طے پا چکا تھا کہ مراکش کے جس حصے پر فرانس کا غلبہ ہے اُسے فرانس کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ یعنی اس پر فرانس کی سرپرستی ہے اور شمال مغرب کے چھوٹے سے ساحلی علاقے میں جہاں سپین نے پنجے جما لئے ہیں۔ ان پر سپین کی سرپرستی قبول کر لی جائے۔ طنجہ کا ساحل دو سو مربع میل رقبہ تھا اہم تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اسے بین الاقوامی قرار دیا گیا تاکہ دنیا کے تمام ممالک اس علاقے کی کاروباری منڈیوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ۱۹۱۴ء کے اسباب جنگ میں بخملہ دیگر وجوہ کی بنا پر مراکش کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بغاوتیں ہوتی رہیں۔ سپین نے اس علاقے کو پوری طرح
فتح کرنے کی کئی کوششیں کی تھیں مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ مراکش میں ریف نام ایک
علاقہ ہے۔ اس کوہستانی علاقے کے باشندے بربر کہلاتے ہیں وہ بہت زیادہ دلیر اور جنگجو
واقع ہوئے ہیں ۱۹۱۹ء میں کوہستان ریف کے ایک بہادر اور منچلے قومی لیڈر غازی عبدالکریم
کی سرکردگی میں اس علاقے کے لوگوں نے زبردست بغاوت کی۔ غازی عبدالکریم ...
فوجی کمانڈر تھا۔ شمالی افریقہ کی جدوجہد آزادی میں اس کی شخصیت خاص ممتاز نظر آتی ہے
اگرچہ غازی کے سپاہی اسلحہ سے ناواقف اور محروم تھے تاہم وہ سپین جیسی سلطنت کے
خلاف نبرد آزما نظر آتے تھے۔ الفونسو کے لیے یہ ایک نادر موقع تھا اس نے ملک کی توجہ کو
ہٹانے کے لیے مذہب کے نام پر عیسائیوں کو غازی کے خلاف ابھارا اور اہل وطن کو اس
جنگ میں جھونک دیا اور انھیں مصروف رکھنے کے لیے کام مہیا کر دیا۔

ادھر بربر قوم نے اسپین سے بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اُدھر الفونسو
نے سپین کے قدیم مذہبی تعصبات کو مشتعل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے سوچا
کہ قرطبہ و غرناطہ کے بادشاہوں کے ان نام لیواؤں کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا جائے
تو کچھ مدت کے لیے لوگ اس طرف مصروف ہو جائیں گے اور وہ آرام اور چین کی زندگی بسر
کر سکے گا۔ سپین کے بھوکے اور بے روزگار عوام کے ہنگاموں اور ان کی شورشوں سے نجات
مل جائے گی۔ چنانچہ صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ کلیساؤں میں مسیحی جنگ کے بگل بجنے لگے
مسیح کی عظمت اور انجیل کے نام پر اسپین کے لوگ سر کٹانے کے لیے میدان میں نکل آئے۔
۱۹۲۱ء میں ریف پر یلغار کر دی گئی۔

نئی صلیبی جنگ ہسپانوی فوج مجاہدوں سے کئی گنا زیادہ تھی پھر جدید اسلحہ جنگ بھی
میسر تھا۔ سپین کے پاس سینکڑوں ایسے مقبوضات تھے جن میں کروڑوں انسان بستے تھے چنانچہ
ایک جم غفیر مراکش کے حدود میں داخل ہو گیا۔ ریف کی کل آبادی جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں
بھی شامل ہیں چھ سات لاکھ سے زیادہ نہ تھی، مزید یہ کہ اٹلی، فرانس اور انگلستان نے سپین
کو دھڑا دھڑ اسلحہ بھیجنا شروع کر دیا۔ اس کے برعکس ریف کو سامان جنگ دینے سے انکار

کردیا۔ زور شور کی جنگ شروع ہوگئی۔ سپین نے وہ تمام مظالم کیے جو ممکن ہو سکتے تھے۔ بم برسائے گئے، توپیں چھوڑی گئیں۔ زہریلی گیس استعمال کی گئی۔ پُرامن آبادیوں کو تباہ کیا گیا۔ بوڑھوں عورتوں اور بچوں تک کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ غرض کیا کچھ نہ کیا گیا۔ ریف کے باشندوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے ہر قوت حرکت میں لائی گئی، مگر ریف کو قدرتی مدد نے بچا لیا۔ یہ ایک ایسا پہاڑی علاقہ ہے جہاں بہت سے محفوظ غار اور خندقیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ انھیں کے طفیل دشمن کو منہ کی کھانی پڑی۔ سپین کو زبردست شکست ہوئی۔ دس ہزار سے زیادہ سپاہی قتل ہوئے، پندرہ ہزار گرفتار کیے گئے، سپینی کمانڈر نے خودکشی کر لی اور تمام سامانِ جنگ پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔

ہولناک انجام | یہ شکست اتنی ہولناک اور تباہ کن تھی کہ اہل سپین حواس کھو بیٹھے۔ اس ناکامی نے اہل سپین کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ چونکہ وہ مجاہدین ریف کے سامنے اب کھڑے نہ ہو سکتے تھے اس لیے سارا غصہ اپنے ہی بادشاہ پر نکالا جانے لگا۔ الفونسو گھبرا گیا اور ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر اس کی مخالفت بڑھتی گئی۔ ملک کے اخبارات میں بادشاہ کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے۔ لوگ بادشاہ کو معزول کرنے کے درپے ہو گئے اس صورتِ حال نے ملکہ اینا کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا اسے اپنی اور بادشاہ کی جان کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

محبت کی تلخیاں | سپین کے ایک علاقے میں شدید شورش برپا ہوئی۔ فوج اور عوام کے درمیان جھڑپ ہوئی جس میں کچھ آدمی مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ الفونسو خود وہاں پہنچا۔ سیاہ جھنڈیوں سے لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔ اور اس کے خلاف نعرے لگے۔ فوج نے نعرہ لگانے والوں کو گرفتار کر لیا۔ بادشاہ کو آج پختہ یقین ہوگیا کہ تخت اس کے ہاتھ سے چلا جائے گا۔

جب محل میں واپس آیا تو ملکہ کو متفکر پایا۔

"میں نہ کہتا تھا تم انگلستان چلی جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھ تم بھی کسی خرابی میں مبتلا ہو جاؤ۔" بادشاہ نے کہا۔

ملکہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے اپنے شوہر کے ابتلا کا زمانہ قریب نظر آرہا تھا "مگر میں آپ کو کبھی چھوڑ کر نہ جاؤں گی خواہ حالات اس سے بھی بدتر ہو جائیں" وہ بولی۔

"پیاری ملکہ" بادشاہ نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تاج و تخت سے خود ہی دستبردار ہو جائیں اور یہ دستبرداری اس طرح عمل میں لائی جائے کہ ہمارے شاہی وقار پر بھی حرف نہ آئے پھر ہم کسی پُرسکون جگہ پر جا کر زندگی کے باقی دن گزاریں"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بادشاہ نے ٹیلیفون اٹھایا۔ فوج کا کمانڈر اطلاع دے رہا تھا "ریف کے معرکے میں ہمارے جو آدمی بربریوں کی قید میں چلے گئے تھے انھیں قتل کر دیا گیا ہے"۔

"کیا یہ مصدقہ خبر ہے؟"

"ہاں حضور! میں نے اس کی تحقیق کر لی ہے اور اس خبر نے عوام کو اور زیادہ مشتعل کر دیا ہے۔ لوگ حضور کے خلاف الزام تراشی کر رہے ہیں۔ حکومت کو فوراً سخت اقدامات کرنے چاہئیں"۔

"تم فوراً یہاں پہنچو" بادشاہ نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

شام ہونے سے قبل کمانڈر شاہی محل میں پہنچ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ بند کمرے میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کمانڈر نے بادشاہ کو بتایا کہ ری ویرا کو لوگوں نے اپنا رہبر بنا لیا ہے اور اس کے ساتھ خفیہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ لہذا اسے فوراً گرفتار کر لینا چاہیے، مگر بادشاہ نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔

ری ویرا فوجی تربیت یافتہ تھا۔ مراکش کی جنگ میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جس کے صلہ میں اسے لفٹننٹ جنرل بنا دیا گیا تھا۔ وہ بہت الوالعزم اور بہادر تھا۔ عوام اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ مراکش میں شکست کھانے کے بعد سپین میں بادشاہ کے خلاف جو رو بہ نکلی تھی ری ویرا نے اس رو سے فائدہ اٹھایا اور ان لوگوں کا ہمنوا بن گیا جو بادشاہ کے خلاف تھے یوں عوام پر اپنی ہر دلعزیزی کا سکہ بٹھا لیا۔

تخت سے علیحدگی الفونسو کو ری ویرا کی طاقت کا بخوبی احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ

بادشاہ کے خلاف ہو چکے ہیں اور ری ویرا ان میں بہت مقبول ہے۔ اگر اُسے گرفتار کیا گیا تو ملک میں فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ چنانچہ اس نے مصلحت اسی میں جانی کہ تخت خود ہی چھوڑ دے۔ مگر اس طرح کہ اس پر بزدلی کا الزام بھی نہ آئے۔ اس نے سوچا کہ اگر ری ویرا کو ڈکٹیٹر بنا دیا جائے تو بہتر رہے گا۔ چنانچہ ری ویرا کی ڈکٹیٹری کا راستہ ہموار کرنے کے لیے یہ چال چلی، کہ وزیر جنگ سے استعفےٰ دلا دیا۔ پھر وزیر خارجہ کو کسی نہ کسی طرح رضامند کر لیا کہ وہ ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ جب دونوں شخصیتیں حکومت سے الگ ہو گئیں تو اس نے پارلیمنٹ کو ملتوی کر دیا اور برابر ملتوی کرتا رہا۔ ان حالات نے ری ویرا کو سلطنت پر چھا جانے کا موقع فراہم کر دیا۔

چنانچہ اس نے میدان خالی پا کر اپنی فوجی طاقت کے زور سے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈکٹیٹر بن گیا۔ الفونسو تخت سے علیحدہ ہو گیا۔ مگر اپنی ملکہ کے ساتھ سپین ہی میں رہا۔

محبوبہ کی رخصت

تخت سے علیحدگی کے تھوڑے عرصہ بعد ملکہ کو خبر ملی کہ اس کی ماں انگلستان میں سخت بیمار ہے، وہ جب سے ملکہ بنی تھی، ایک دن کے لیے بھی شوہر سے جدا نہ ہوئی تھی اس لیے کہ اسے شوہر سے بے پناہ محبت تھی اور جس طرح وہ اس کی جدائی گوارا نہ کر سکتی تھی اسی طرح الفونسو بھی اس سے علیحدگی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ملکہ کے اس طرز عمل میں ابھی تک کوئی فرق نہ آیا تھا مگر الفونسو اب پہلے سا نہ رہا تھا۔ اس کے دل میں ملکہ کی محبت آخر تک رہی مگر اس محبت میں فرق آ چکا تھا۔ شاید اس لیے کہ زندگی کے ان دنوں میں اسے مسلسل تکلیفوں اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ملکہ کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس کا شوہر اب بہت بدل چکا ہے۔ چنانچہ جن دنوں الفونسو نے ملکہ کو انگلستان جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ملکہ کچھ متردد سی ہو گئی تھی اسے شوہر کی محبت پر شبہ ہونے لگا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ بادشاہ بہت پریشان رہتا ہے اور شاید اسی لیے وہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ اب تخت سے علیحدہ ہونے کے بعد بادشاہ کی طبیعت میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ یہ تبدیلی اس کی ازدواجی زندگی کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہی اور اب جبکہ دونوں سلطنت کے کاروبار سے الگ ہو کر تنہائی کے لمحے گنا رہے تھے۔ بادشاہ کے جذبات محبت بھی سرد پڑ چکے تھے۔ اینا کو شوہر کی اس روش سے بہت دکھ پہنچا تھا اور وہ اداس رہنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ انگلستان چلی جائے

مگر کہہ نہ سکتی تھی، جب اچانک اسے ماں کی بیماری کی اطلاع ملی تو اُسے معقول وجہ ہاتھ آگئی، اور وہ انگلستان چلی گئی۔ الفونسو اپنی زندگی کا ماتم کرنے کے لیے اکیلا باقی رہ گیا۔

نیا حاکم۔ ری ویرا سپین کے سیاہ وسفید کا مالک بن چکا تھا۔ وہ سات سال تک ملک کا ڈکٹیٹر بنا رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ملک کی حالت سنوارنے کے لیے چند ایک کوششیں کیں مگر بے نتیجہ رہیں۔ عوام کو اس سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ ۱۹۲۶ء میں جب لوکارنو پیکٹ کے بعد جرمنی کو لیگ کی مجلسِ عاملہ کا ممبر بنانے کا فیصلہ ہوا تو ری ویرا نے مطالبہ کیا کہ سپین کو بھی یہ اعزاز بخشا جائے مگر اس کا مطالبہ رد کر دیا گیا۔ اس پر ری ویرا برہم ہو گیا اور لیگ میں سپین کے نمائندے کو حکم دیا کہ وہ واک آؤٹ کر جائے۔

بعد ازاں اس نے طنجہ[1] کے لیے مطالبہ کیا کہ یہ علاقہ سپین کو دیا جائے، مگر یہ مطالبہ بھی مسترد کر دیا گیا۔ صرف ایک کام اس نے کیا اور وہ یہ کہ ۱۹۲۶ء میں فرانس کی مدد سے دوبارہ ریف پر چڑھائی کر دی اور غازی عبدالکریم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

بہرحال ری ویرا کو ملک کی اندرونی حالت بہتر بنانے میں مطلق کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ حالات اور زیادہ خراب ہوتے گئے۔ عوام اس کے بھی خلاف ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ الفونسو کی طرح اسے بھی ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ پیش بندی کے طور پر اس نے کلیسا کے اربابِ اختیار کو اپنا حامی بنا رکھا تھا تاکہ وہ لوگ آڑے وقت میں کام آئیں، مگر

---

[1] طنجہ کا علاقہ بین الاقوامی نگرانی میں ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اس علاقے کے متعلق ایک بین الاقوامی معاہدہ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ کوئی بھی ملک یہاں فوجی استحکام نہیں کر سکتا۔ طنجہ کا انتظام ایک بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد ہے جس کے ۲۷ ممبر ہیں۔ اس اسمبلی کا صدر سلطان مراکش کا نمائندہ ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب لوٹ مچی تو سپین نے طنجہ پر اپنا قبضہ جما لیا (۱۹۴۰ء) اور سلطان مراکش کے نمائندے کو لینے سے انکار کر دیا، لیکن ۱۹۴۲ء میں اتحادیوں نے طنجہ کی پہلی صورتِ حال بحال کر دی۔

مصیبت پڑنے پر وہ کسی کام نہ آئے۔ کیونکہ اب اہل سپین کے مذہبی رجحانات بدل چکے تھے۔ پہلے وہ کلیسا کے ہر حکم پر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے مگر اب کلیسا کی پہلی سی حقیقت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ جب ری ویرا نے اہل کلیسا کو عوام پر مسلط کرنے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہا تو ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تجویز کو واپس لینا پڑا۔ آخر ۱۹۲۹ء میں بادشاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور ری ویرا سے استعفٰے طلب کر لیا اور اسے اپنے تاج و تخت کی فکر لاحق ہو گئی۔

حکومت دوبارہ الفونسو کے قبضہ اختیار میں آ گئی۔ اس اثنا میں ملکہ اینا بھی انگلستان سے واپس آ چکی تھی۔ بادشاہ کے حامی اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ مگر عالمی کساد بازاری نے سپین کی حالت تباہ کر دی تھی۔ اس لیے الفونسو بادشاہت کو دوبارہ حاصل کر لینے سے خوش نہ تھا۔ اسے اب بھی یہی خطرہ تھا کہ وہ پھر محروم نہ کر دیا جائے۔ اب کمیونسٹوں کا زور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

بادشاہ کی بوکھلاہٹ

ملک میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے تشدّد کا حربہ استعمال کیا۔ جمہوریت پسندوں کا گروہ طاقت پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ شاہی نظام کے ہی مخالف تھے اور کسی قیمت پر بادشاہ کی بحالی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ الفونسو نے سخت گیری سے کام لیا اور جمہوریت پسندوں کو سخت سزائیں دیں۔ ہزاروں آدمی جیلوں میں ٹھونس دیے گئے مگر ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ گویا جتنی زیادہ سختی کی جاتی ہنگامہ اتنا ہی زیادہ پھیلتا جاتا۔

جمہوریت پسندوں نے انقلابی قدم اٹھایا انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایوان پر دھاوا بول دیا جائے اور حکومت کے کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ اس حملہ کے لیے ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء کا دن مقرر ہوا۔ لیکن یہ سازش ظاہر ہو گئی اور حکومت نے اسے سختی سے کچل کر رکھ دیا۔

جمہوریت پسندوں نے دوبارہ ۱۵ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ ان کی طاقت بہت مضبوط تھی اس لیے کامیابی یقینی تھی مگر بدانتظامی کے باعث ان کے گروہ نے مقررہ دن سے تین روز قبل ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔ چونکہ ان کی طاقت تھوڑی تھی اس لیے انھیں آسانی سے

دبا لیا گیا۔ تمام باغی گرفتار کر لیے گئے اور بعد ازاں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائیں گئیں۔ انقلابی پروگرام ناکام رہا۔

نوشتۂ تقدیر اب سپین کے طول و عرض میں بغاوت کی آگ پھیل چکی تھی۔ ہزاروں لوگ جیلوں میں بند تھے انھوں نے جیل کے اندر ایک انقلابی پروگرام بنایا جو جیل پروگرام کے نام سے مشہور ہے۔ الفونسو کے لیے یہ سخت مصیبت کا وقت تھا۔ ملکہ الگ پریشان تھی۔ بالآخر بادشاہ نے انقلابی جدوجہد سے گھبرا کر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور رہائی کے فوراً بعد پارلیمنٹ کے انتخاب کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ جمہوریت پسندوں کو عروج حاصل ہو چکا تھا اور وہ بڑی بھاری اکثریت میں تھے اس لیے پارلیمنٹ میں بھی انھیں کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ جب ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء کو پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ سپین کی بادشاہت ختم کی جاتی ہے اور اس کی جگہ جمہوری نظام قائم کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ اسے جلاوطن کر دیا جائے ؎

نہیں سلجھتا تو اکثر گمان گزرتا ہے
مرا نصیب ترے گیسوؤں کا خم ہوگا

نازک وقت پارلیمنٹ کا اجلاس ختم ہوا۔ بادشاہ محل میں آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ملکہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز تھی۔ وہ ماضی کے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے اور شاید اس کی اور بادشاہ کی قسمتوں کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ وہ بڑی شدت سے اجلاس کے فیصلہ کا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی بادشاہ نے اس کے کمرے میں قدم رکھا وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا اور دل میں بے چینی۔ وہ اپنی اور بادشاہ کی تقدیر کا فیصلہ سننے والی تھی۔ الفونسو نے اپنے رنج و کرب کو چھپانے کی لاکھ کوشش کی اور مصنوعی مسکراہٹ کا اظہار کیا مگر ملکہ نے محسوس کر لیا کہ بادشاہ اندوہگین ہے۔ وہ فوراً بول اٹھی "پارلیمنٹ نے کیا فیصلہ کیا مجھے جلد بتائیے"۔

"بیٹھ جاؤ اینا" بادشاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ کچھ دیر تک دونوں کے لبوں پر سکوت رہا۔ ملکہ کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو رہی

تھی" بتاتے کیوں نہیں آپ"؟ اس نے بادشاہ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ الفونسو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ملکہ سے بات چھپا نہ سکتا تھا مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی زبان سے اس کے سامنے بیان کرے۔ اسے ڈر تھا کہ ملکہ کو فیصلہ سن کر شدید صدمہ پہنچے گا اور نہ جانے کیا ہو جائے مگر چار و ناچار اسے کہنا ہی پڑا۔ "پیاری ایناؔ" اس نے ملکہ کو اپنے قریب لاتے ہوئے کہا، "تم کہا کرتی ہو کہ میری محبت کے سامنے دنیا کی تمام مصیبتیں تمہاری نظر میں ہیچ ہیں اور تم میرے ساتھ ہر بوجھ اٹھانے کو تیار رہو۔ تم ٹھیک کہتی ہو اور تم نے اپنے عمل سے آج تک اسے ثابت کر دکھایا ہے اور مجھے امید ہے بلکہ یقین ہے کہ تم آئندہ بھی اسی پر ثابت قدم رہو گی . . . . " بادشاہ باتیں کرتا جا رہا تھا اور ملکہ کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بادشاہ کی ان باتوں کو سننے کی تاب زیادہ دیر تک نہ لا سکی۔ بات کاٹتے ہوئے بولی: "آپ بتانے سے کیوں گھبراتے ہیں (منہ بناتے ہوئے) کیا مجھے اتنا ہی کمزور جانتے ہیں"۔

"ملکہ! اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں آج ہی یہاں سے کوچ کر جانا ہے۔ پارلیمنٹ نے فیصلہ دے دیا ہے کہ ہم آج ہی ملک چھوڑ جائیں"۔

"بس اتنی سی بات ہے" ملکہ بولی "آپ متوحش نہ ہوں ملکہ آپ کے ساتھ ہے کہاں کا رُخ کریں ——— انگلستان کا؟"

"نہیں ملکہ! میں نہیں کہہ سکتا ہم کہاں رہیں گے۔ چونکہ وقت تھوڑا ہے اس لیے ہم باقی باتوں کا فیصلہ راستے میں کر لیں گے تم تیاری کر لو۔ شام ہونے کے قریب ہے۔ رات کی تاریکی میں ہم چل دیں گے"۔

"بہت بہتر! ملکہ کو شوہر کے لیے سب کچھ گوارا کرنا ہو گا"۔

"ملکہ! میں والدہ سے مل لوں۔ تم سامانِ سفر تیار کرو میں ابھی آتا ہوں"۔

الفونسو اپنی والدہ میریا کرسٹینا سے ملنے کے لیے چلا گیا اور ملکہ ضروری سامان باندھنے میں مصروف ہو گئی۔

کس خرابے میں زلیستا آ پہنچی   میں تہی دست تو تہی دامن

المناک جدائی ۱۳۔ اپریل ۱۹۳۱ء کی ہیبت ناک رات دو محبت بھرے دلوں کے لیے

المناک جدائی کا پیغام لے کر آئی۔ سخت سردی تھی۔ سرد ہوا سے ہاتھ پاؤں سُن ہوئے جاتے تھے۔ گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سپین کا بادشاہ اور اس کی ملکہ ایک غمگسار درباری کی کار میں شاہی محل سے روانہ ہوئے۔ سفر کے لیے مختصر سا سامان ساتھ لیا اور سپین کے شمالی ساحل کا رُخ کیا۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد مسافروں نے سپین کی سرحد عبور کی اور فرانس کی زمین میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹے سے شہر میں قیام کیا۔ دو تین دن وہاں رہ کر سفر کی تھکن اور حالات کی پریشانی کا بوجھ ہلکا کیا۔ یہیں سے حکومت انگلستان کو ملکہ کی آمد کی خبر بھیجی گئی۔ الفونسو نے ملکہ کو مجبور کیا کہ وہ انگلستان چلی جائے۔ ملکہ نے بادشاہ کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر وہ فرانس ہی میں رہنا پسند کرتا تھا۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہو گئے کہ بادشاہ فرانس ہی میں رہے تاکہ سپین کے حالات کا آسانی سے پتہ لگتا رہے اور ملکہ انگلستان چلی جائے۔

کبھی آس کے سویرے کبھی یاس کے اندھیرے
مری صبحِ زندگانی، مری شامِ زندگانی

انقلاب سپین کا یہ انقلاب اتنی تیزی کے ساتھ اور اتنے پُرامن طریقے سے ظہور میں آیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ بادشاہ کی جلاوطنی کے بعد اس کے جو حامی ملک میں رہ گئے تھے، ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کی ایک معقول تعداد ملک میں موجود تھی جن میں فوجی افسر اور امراء بھی تھے مگر انقلاب پسندوں کے سامنے وہ بادشاہ کی حمایت میں کسی اقدام کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ انقلابی اگر چاہتے تو بادشاہت پسندوں پر تشدد کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا بلکہ بادشاہ کے چلے جانے کے بعد اس کے خاندان کے دوسرے افراد سے اچھا سلوک روا رکھا۔ پادری اور دوسرے مذہبی لوگ بادشاہ کے زمانے میں ہمیشہ اس کے طرفدار اور بہی خواہ رہے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ انقلابیوں کی نگاہ میں مدت سے خار بن کر کھٹک رہے تھے۔ انقلابیوں نے ان سے بدلہ لیا، انھیں بہت تنگ کیا گیا۔ کلیسا کے لوگوں کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ وہ عوام کے مقابلہ میں بااختیار طبقہ کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت ہمیشہ ان پر نظرِ عنایت رکھتی تھی اور ان کے پاس بڑی بڑی جائدادیں اور جاگیریں تھیں۔ سلطنت کے معاملات میں [illegible] کو بڑا دخل حاصل تھا۔ چنانچہ جس طرح انقلاب فرانس کے موقع پر اس طبقہ کی

گت بنی تھی اسی طرح سپین کے انقلاب کے وقت ان لوگوں سے پورا پورا انتقام لیا گیا۔ گرجا گھر جلا کر خاک کر دیے گئے۔ پاپائیت کے مرکزوں کو تباہ کر دیا گیا۔ پادریوں کی سخت بے حرمتی کی گئی اور ان کی جائدادوں اور جاگیروں کو نقصان پہنچایا گیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پادریوں کو قتل کرنے سے گریز کیا گیا۔

نئی حکومت نے ملک کا جمہوری دستور مرتب کیا جس میں جرمنی اور انگلستان دونوں ملکوں کے آئین کی پیروی کی گئی تھی۔ ری ویرا نے اپنے دورِ حکومت میں بعض ایسے اقدامات کیے تھے جن سے سپین کے بین الاقوامی تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ نئے آئین میں ایسی دفعات رکھی گئیں جن کے ذریعے سے ان تعلقات کو از سرِ نو استوار کیا گیا اور انھیں پہلے سے زیادہ بہتر بنایا گیا۔

جب ملک میں کامل سکون ہو گیا اور جمہوریت اپنا کاروبار کرنے لگی تو پادریوں اور دیگر مذہبی سربراہوں نے دوبارہ اپنا اقتدار جمانا چاہا، چنانچہ کلیسا کا جھگڑا چل نکلا۔ مذہبی لوگ کلیسا کا اقتدار جمانا چاہتے تھے، لیکن جمہوریت کو یہ قبول نہ تھا۔ بالآخر ایک سمجھوتہ ہوا۔ طے پایا کہ پادری اپنا کام حسبِ سابق کرتے رہیں گے اور چاہیں تو گرجا گھر بھی تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن وہ ملک کے تعلیمی نظام میں کسی قسم کا دخل نہ دیں گے، نہ اس میں حصہ لیں گے۔ حکومت انھیں کوئی جاگیر یا وظیفہ وغیرہ بھی نہیں دے گی۔

سپین میں یسوعی نام سے عیسائیوں کا ایک فرقہ تھا۔ یہ وہ فرقہ ہے جس کے افراد ملک کی سیاست اور قیادت پر اپنا اقتدار بٹھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں اور اپنے اس طرزِ عمل کی بنا پر سارے یورپ میں بدنام ہیں۔ سپین کے نئے دستور کے مطابق ان لوگوں کو ناقابلِ برداشت گروہ مانا گیا۔ اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے کر توڑ دیا گیا اور ان کا فنڈ جو ساٹھ لاکھ گنی سے کم نہ تھا، ضبط کر لیا گیا۔ کچھ رقم جو مختلف افراد کی ذاتی ملکیت تھی وہ انھیں دے دی گئی۔

ان اصلاحات سے کلیسا مطمئن نہ ہوا اور وقتاً فوقتاً احتجاج کی آوازیں بلند کرتا رہا۔ چنانچہ امن و سکون کی فضا میں پادریوں نے ہنگامے جاری رکھے۔ دوسری طرف انتشار کی زد پر بکھرے تھے۔ چنانچہ جمہوری حکومت کو ان دونوں گروہوں سے نبرد آزما رہنا پڑا۔ ۱۹۳۴ء میں

مختلف علاقوں میں ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکالے گئے، بلوے اور فسادات ظہور میں آئے۔ سپین کے بعض صوبوں نے خود مختار ہونے کے بعد شورشیں برپا کردیں۔ بیسے اور کیٹےلونیا نام دو صوبوں نے بہت مدت پہلے سے خود مختاری کے لیے کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔ الفونسو اور ری ویرا کے دورِ حکومت میں بھی انھوں نے تگ و دو کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب جمہوریت کے زمانے میں انھوں نے پھر آزادی کے لیے شور مچایا۔ اشتراکی افراد بھی ان کے حامی ہو گئے اور اس طرح حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ بن گیا۔

موہوم امیدیں

الفونسو فرانس میں پڑا تھا مگر اپنے ملک کے تمام حالات کی اطلاع اسے مل رہی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جن لوگوں نے اُسے قصوروار ٹھہرا کر ملک سے نکالا ہے وہ نئے حکمرانوں سے بھی مطمئن نہیں ہو رہے ہیں اور ملک میں بدامنی اسی طرح موجود ہے بلکہ اب حالات زیادہ بگڑ چکے تھے اس لیے کہ کمیونسٹ بھی زور پکڑ چکے تھے جو ملک کے باغی عناصر کو ہر طرح سے مدد دینے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں موجودہ نئی حکومت کا مستقبل بھی تاریک نظر آتا تھا۔ اسے اس بات سے خوشی ضرور ہوتی ہوگی اس لیے کہ اُسے امید ہونے لگی تھی کہ وہ ملک کا پانسہ پلٹنے پر دوبارہ تخت حاصل کرنے کے لیے قسمت آزمائی کرے گا۔ مگر ابھی تک کوئی واضح چیز سامنے نہیں آ رہی تھی۔

سپین کی نئی جمہوری حکومت نے اب کوشش کی کہ کسی طرح کسانوں کو خوش کیا جائے کیونکہ ان لوگوں کی اکثریت تھی اور اگر انھیں خوش کر لیا جائے تو ان کی مدد سے حکومت چلائی جا سکتی ہے، مگر ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے بڑے جاگیرداروں سے دشمنی لینی پڑتی تھی لہٰذا یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ جمہوری حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم ہو گیا جس میں مراکش اور ریف کے سادہ عربوں اور بربروں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس مخالف جماعت نے ۱۷ جولائی ۱۹۳۶ء کو کھلی بغاوت شروع کر دی اور ایک فوجی جرنیل فرانکو کی قیادت میں جمہوریت اور اشتراکیت دونوں کو تباہ کر دیا۔ دو سال کی خونریزی کے بعد ملی ۱۹۳۹ء میں نئی حکومت بن گئی۔ جنرل فرانکو کو وہی اختیارات مل گئے جو جرمنی میں ہٹلر کو اور اٹلی میں مسولینی کو حاصل تھے۔

خاندان کا حشر

الفونسو اپنی بحالی کی امیدیں ختم کر چکا تھا۔ اس کی محبوب بیوی اس سے الگ ہو کر انگلستان میں مقیم ہو چکی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا شہزادہ اسٹوریس سوئٹزرلینڈ چلا گیا تھا اور وہیں شادی کر کے رہنے لگ گیا تھا۔ چھوٹا لڑکا آسٹریا میں رہتا تھا۔ وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ الفونسو کچھ مدت فرانس میں گزاری پھر جب وطن واپس جانے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو روم چلا گیا، وہیں بیمار ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ اس طرح حسن و عشق کی یہ پُرالم داستان ختم ہو گئی۔

دو گام بھی نہ راہِ محبت میں چل سکے
مجبور اس قدر تھے دلِ ناتواں سے ہم

(عظیم لاہوری)

ڈیوک آف ونڈسر اور مسز سمپسن

"اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ میں نے تخت چھوڑ دیا، تاج اتار دیا، سرکاری دستاویزیں تیار ہو چکی ہیں۔ تم کہاں جاؤ گی؟ چین جاؤ، لیبریڈار چلی جاؤ یا جنوبی سمندروں کا رُخ کرو۔ جہاں بھی جاؤ گی میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔"

آخری منزل لندن کے ایک بڑے ہوٹل میں گاہکوں کا ہجوم تھا، شور کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ اچانک ہوٹل میں خاموشی چھا گئی۔ بی بی سی لندن سے اعلان ہو رہا تھا "یہ ونڈسر کیسل ہے۔ ہز رائل ہائی نس پرنس ایڈورڈ آپ سے مخاطب ہوتے ہیں:

"ایک مدت کے بعد مجھے اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔

میں نے کبھی کوئی بات چھپانی نہ چاہی تھی، مگر پارلیمانی دستور کی بنا پر میری زبان بندی کر دی گئی تھی اور میں آپ لوگوں سے خطاب نہ کر سکتا تھا۔

ابھی چند گھنٹے قبل میں نے بادشاہ کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیے ہیں اور اب میں تمام کاموں سے الگ ہو کر اپنا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔

آپ سب کو ان وجوہ کا بخوبی علم ہے جن کی بنا پر میں نے تخت چھوڑ دیا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کرنے کے بعد میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی محبت کو کبھی دل سے نہیں نکال سکتا۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ شہنشاہ کی حیثیت سے مجھے جو فرائض انجام دینے تھے اور جو ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہوتی تھیں انھیں میں اس عورت کی مدد اور تعاون کے بغیر انجام نہیں دے سکتا تھا جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ . . . . . ."

برطانیہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ جارج پنجم کے بعد ایڈورڈ ہشتم، ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو انگلستان کے تخت پر بیٹھا تھا مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو اپنے بھائی ڈیوک آف یارک کے حق میں دستبردار ہو کر ملک چھوڑ رہا تھا۔ اگرچہ ملک کی تاریخ میں یہ ایک عجیب اور اتفاقی واقعہ

ڈیوک آف ونڈسر
ویلیس سمپسن

تھا مگر ہر شخص کو اس واقعہ کا پہلے ہی سے علم تھا۔ بادشاہ اور کابینہ کے درمیان مدت سے ایک کشمکش چلی آتی تھی۔ اس کشمکش کا باعث ایک شادی شدہ امریکن عورت تھی جس سے بادشاہ شادی کرنا چاہتا تھا مگر پارلیمنٹ اس شادی کے حق میں نہ تھی۔ مسز سمپسن کا اصل نام ولیس وارفیلڈ سمپسن تھا۔ ایڈورڈ اُسے اُس زمانے سے جانتا تھا جب اس کا باپ جارج پنجم ابھی زندہ تھا اور وہ خود ڈیوک آف ونڈسر کہلاتا تھا۔ یہ تعلقات بڑھتے گئے یہاں تک کہ مسز سمپسن نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ اس وقت شہنشاہ جارج پنجم کی وفات ہو چکی تھی اور ڈیوک آف ونڈسر ایڈورڈ ہشتم کے نام سے انگلستان کے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔

ڈیوک آف ونڈسر ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۱ سے ۱۹۳۶ تک پرنس آف ویلز کہلایا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد جب اس نے تخت سے دستبرداری اختیار کی تو ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب ملا اور اب اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسز سمپسن کی محبت میں تاج و تخت چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ شاہی دستور کے مطابق بادشاہ ہوتے ہوئے وہ اس سے شادی نہ کر سکتا تھا۔ تخت چھوڑنے کے بعد مسز سمپسن سے شادی کر لی۔ ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵ تک بہاما کے جزیروں میں گورنر رہا۔

ڈیوک آف ونڈسر نے اپنی کتاب[1] میں اپنی داستانِ معاشقہ بھی بیان کی ہے جسے مناسب ترمیم و تنسیخ اور اختصار کے بعد درج کیا جاتا ہے۔

پہلی ملاقات وہ لکھتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جنوبی امریکہ میں سردیوں کا موسم گزارنے کے بعد جب میں واپس انگلستان آیا تو شکار کے لیے بھائی جارج کے ہمراہ ملٹن موبرے[2] گیا۔ مسز سمپسن اور اس کا شوہر بھی یہاں مہمان کی حیثیت سے مدعو ہوئے تھے۔ یہاں پہلی دفعہ اُن سے میری ملاقات ہوئی۔ مسز سمپسن کو گھوڑے کی سواری کا مطلق شوق نہ تھا۔ شکاری کتوں سے بھی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ شکار کو قطعی پسند نہ کرتی تھی۔ اُسے سردی زکام اور درد سر کی

---

[1] A KING'S STORY

[2] لندن کے مضافات (لسٹر) میں ایک مشہور شکار گاہ۔ شہر کی آبادی ۲۱ ہزار کے قریب ہے۔

بھی شکایت تھی۔ وہاں محفل میں اور بھی کئی لوگ تھے اور خاصی دیر تک بات چیت اور مباحثہ ہوتا رہا۔ میں نے اس بحث میں دوسروں کی نسبت زیادہ باتیں کیں شاید اس لیے کہ دستور کے مطابق جس محفل میں بادشاہ، شہزادہ یا شاہی خاندان کا کوئی اور فرد موجود ہو اس میں بحث کی قیادت اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مسز سمپسن امریکن عورت تھی، چنانچہ انگریزوں اور امریکیوں کے متعلق بھی کچھ گفت وشنید ہوئی۔ قصہ مختصر یہ کہ میرا اور مسز سمپسن کا تعارف ہوا۔ پھر ملاقاتیں ہونے لگیں۔

بات بنتی گئی اگلے چند سالوں میں دعوتوں کے بعض موقعوں پر کئی اور دوستوں کی محفل میں میری اور اس کی لندن میں ملاقاتیں ہوئیں۔ ملٹن موبری میں پہلی ملاقات کے بعد ہم لندن میں ایک پارٹی میں اکٹھے ہوئے۔ اس موقعہ پر میں نے اپنے میزبان سے مخاطب ہو کر پوچھا میرا خیال ہے (مسز سمپسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں اس خاتون سے پہلے کہیں ملا ہوں؟ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے اسے بکنگھم محل کے دربار میں دیکھا جبکہ وہ میرے والدین کے حضور میں آئی ہوئی تھی۔ میں دستور کے مطابق اپنے والدین کے تخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ خوبصورت لباس میں ملبوس عورتوں کی ایک قطار نہایت آہستہ خرامی کے ساتھ دربار میں چلی آ رہی تھی، ان میں ولیس بھی تھی یہ عورتیں باری باری سے میرے والدین کے حضور آئیں۔ جب ولیس کی باری آئی تو پہلے وہ میرے والد کے سامنے آئی پھر والدہ کے۔ میں اس کی باوقار شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سمپسن کا خاندان برنسٹن سکوئر کے ایک چھوٹے سے خوبصورت فلیٹ میں رہتا تھا۔

اس عرصے میں میں مختلف علاقوں میں سفر کرتا رہا، لیکن جب کبھی لندن آتا ہوا میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں برنسٹن میں ضرور اتروں۔ چنانچہ میں چائے وغیرہ کے لیے برنسٹن کورٹ میں رہ جاتا جہاں برطانیہ اور امریکہ کے سیاستدان، اخبار نویس اور اونچے درجے کی عورتیں اکثر دیکھنے میں آتی تھیں۔ ان کے آپس میں بحث مباحثے ہوا کرتے۔ ملکی معاملات اور دیگر حالات پر تبصرے اور قیاس آرائیاں ہوتیں۔ ان دنوں سیاسی دنیا میں ہٹلر، مسولینی، اسٹالن اور چیانگ کائی شک وغیرہ کا نام بار بار آ رہا تھا۔ چنانچہ برنسٹن کورٹ میں آنے والے لوگوں کا موضوع بحث اکثر یہی

لوگ ہوتے اور ان کے متعلق گرم گرم باتیں ہوتیں۔

میں نے دیکھا کہ ویلس کو ان موضوعات سے بہت دلچسپی تھی اور وہ مقامی حالات کے علاوہ بیرونی دنیا کے سیاسی حالات و کوائف سے بھی اُسی طرح باخبر تھی جس طرح کسی ہوشیار سیاستدان یا پڑھے لکھے باخبر انسان کو ہونا چاہیے۔ اُس کی ایک عادت جس نے مجھے بہت متاثر کیا یہ تھی کہ وہ لندن کے چار چوٹی کے اخباروں کا شروع سے آخر تک پورا مطالعہ کیا کرتی تھی۔ اور یہ اس کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ پھر یہ کہ اُس کے پاس ہر نئی چھپنے والی کتاب ہوتی تھی علاوہ ازیں تھیٹروں کے متعلق بھی اُس کی معلومات مکمل اور دلچسپ تھیں۔ اُس کا طرزِ گفتگو اور اُس کی ٹھوس سنجیدہ باتیں قابلِ ستائش ہوتی تھیں۔ جن میں کم از کم میرے لیے دلچسپی کے کئی پہلو ہوتے تھے۔ اُس کی دانائی اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ بحث کے دوران کسی شخص کے کسی نادر نقطۂ نگاہ کو ناپسند کرتی یا کسی کی رائے کی تردید کرنا چاہتی تو اُس کے لیے اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی بہترین جواز یا رائے پیش کرتی۔ یہ صفت کم لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔

ایک شام میں نے چند دوستوں کو ڈارچیسٹر ہوٹل میں رات کے کھانے پر بلایا۔ ان میں ٹلس بھی تھی۔ اس موقع پر ہم سب لوگوں کے مابین سوشل سروس سکیم کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ یعنی بے روزگار لوگوں کو کام پر لگانے کے لیے کیا کچھ ہونا چاہیے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں اسی دن یارک شائر کے مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں مزدوروں سے ملاقات کر کے اور اُن کے حالات دیکھنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ ویلس نے بھی اخبارات میں سوشل سروس کونسل کی سرگرمیوں کے متعلق پڑھ لیا تھا۔ چنانچہ اُس دن اُس نے مجھ سے اس کے متعلق مزید معلومات چاہیں۔ مَیں نے اُسے تمام سرگرمیوں کے متعلق بتایا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ امریکن عورت کی حیثیت سے برطانوی شہزادے کے متعلق یہ جاننے کی خواہش مند ہے کہ اُسے کیا کچھ کام کاج کرنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر سازن کی آواز اتنی اونچی تھی کہ اس کے شور میں ہم سب کی آوازیں دب کر رہ جاتی تھیں تاہم میں نے ویلس کے کانوں تک اپنی گفتگو پہنچانے کے لیے پوری کوشش کی۔ یہ شام مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔ ویلس کے عادات و خصائل اور اُس کی باتوں کا میرے ذہن پر گہرا تاثر تھا۔ میرے خیال کے مطابق وہ پہلی عورت ہے جسے میں نے آزاد رائے اور غیر ضروری پابندیوں سے

بے نیاز پایا۔

مشکلات کا احساس

وقت آگیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں ویلس کی طرف زیادہ مائل ہوتا جارہا ہوں۔ میں اُس میں دلچسپی تو شروع ہی سے لینے لگ گیا تھا اور اب یہ دلچسپی پہلے سے کچھ زیادہ ہی بڑھ چکی تھی مگر میں جانتا ہوں کہ ویلس میری اس کیفیت سے نا آشنا تھی۔ اور خاصی مدت تک نا آشنا رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک دن میرے ذہن میں یہ خیال آہی گیا کہ میں اس خاتون کو اپنی زندگی میں شریک کرلوں، مگر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ ——— یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔

یہ بات مجھ پر پوری طرح واضح تھی کہ اپنی اس امید کو پورا کرنے کے سلسلہ میں مجھے بہت بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ سب سے بڑی مشکل میرے سامنے وہ تھی جو ۱۷۷۲ء کے رائل میرج ایکٹ کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ اس ایکٹ کا مفاد یہ تھا کہ شاہی خاندان کے شہزادوں کی شادیاں بادشاہ کے اختیار میں آتی ہیں اس کے بعد پارلیمنٹ کے۔ چنانچہ میری شادی کے سلسلہ میں میرا والد ہی حَکَم اور مختارِ کل ہو سکتا تھا پھر طلاق کا مسئلہ تھا میں پوری طرح جانتا تھا کہ طلاق کی اجازت بھی نہ مل سکے گی۔

انگلستان کا چرچ جس کا سربراہ انگلستان کا بادشاہ ہوتا ہے طلاق کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ میرے دادا کے زمانے تک قانون یہ تھا کہ کوئی ایسا شخص جس نے طلاق دی یا لی ہو، خواہ وہ قصوروار ہو یا نہ ہو وہ دربار میں نہیں آسکتا۔ بعد ازاں جنگ کے دوران میں جب جلدی کی شادیوں نے زور پکڑا تو میرے باپ کے زمانے تک مذکورہ بالا قانون میں اتنی ترمیم کردی گئی تھی کہ طلاق کے معاملے میں جو شخص بے قصور ہوا کرتا اُسے دربار میں آنے کی اجازت تھی، اور جو قصوروار ہوتا اُسے بعض مخصوص حالات میں ہی یہ اجازت مل سکتی تھی۔

اگرچہ میں جانتا تھا کہ جس خاتون سے میں نے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں وہ کسی قانون کے تحت موردِ الزام نہیں ٹھہرائی جا سکتی نہ ہی اُس کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے تاہم میں جانتا تھا کہ اہلِ دربار کا موجودہ رویّہ اور ان کے اختیارات یا ان کی طاقت اتنی ہے کہ وہ میری شادی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ڈال سکتے ہیں اور اگر میں اُن لوگوں کی مرضی

کے خلاف کوئی اقدام کروں تو چرچ اور مذہبی حلقوں کے علاوہ درباری حلقوں میں بھی میرے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہو گا جس سے ہمارے شاہی گھرانے میں بھی کسی قباحت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے ——— میں یہ نہ چاہتا تھا۔

میں نے سوچا کہ اپنے والد سے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دوں تاکہ اُن کی رائے تو مجھے معلوم ہو سکے چنانچہ میں مناسب موقعے کی تلاش میں رہا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کی تھی۔ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا اُن کی بادشاہت کا پچیسواں سال شروع ہو رہا تھا چنانچہ سلطنتِ برطانیہ کے طول و عرض میں ان کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی۔ جوبلی کے اس ہنگامے میں میرے والد کو بہت پریشان ہونا پڑا۔ اس لیے کہ انھیں کسی وقت بھی فرصت نصیب نہ ہوتی تھی۔ اسی سوچ بچار میں میں بھی وقت گزارتا گیا یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے بعد میرے والد کو پیغامِ اجل آ پہنچا۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں وہ انتقال کر گئے۔

نئی ذمہ داریاں والد کے انتقال کے بعد مجھے ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو تخت پر بٹھایا گیا۔ دستور کے مطابق سلطنتِ برطانیہ کے تمام حصوں سے مجھے شہنشاہیت کی تہنیت کے پیغامات آنے شروع ہو گئے اور دنیا کے مختلف بادشاہوں، راجوں مہاراجوں، شہزادوں اور بڑے بڑے لوگوں نے مجھ سے ملاقاتیں کیں۔ جس دن میرے والد کا جنازہ اٹھایا گیا، انگلستان کا لاٹ پادری میری والدہ کی تعظیم کے لیے بکنگھم محل میں آیا۔ مجھے بھی پیغام بھیجا گیا اور کہا گیا کہ لاٹ پادری فارغ ہونے کے بعد مجھ سے بھی ملیں گے۔ یہ ملاقات قابلِ ذکر ہے۔ لاٹ پادری انگلستان کے چرچ کا سربراہ تھا اور ایک لحاظ سے سلطنت کا سب سے اُونچا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کے بعد دوسرا درجہ اُسے حاصل تھا۔ اِس حیثیت کے علاوہ اُس کی ایک حیثیت یہ بھی تھی کہ وہ میرے والد کا گہرا دوست تھا۔ اُس کی شخصیت کا ہمارے سارے خاندان پر بڑا اثر تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں بھی اُس سے اسی طرح متاثر تھا جس طرح دوسرے اہلِ خاندان لیکن جب بڑا ہو گیا تو اُس کے متعلق میری رائے بدل گئی۔ اب جب میں تخت پر بیٹھا اور وہ میری ملاقات کے لیے آیا تو شاید میری جانب سے اُسے وہ گرمجوشی نظر نہ آئی جس کا وہ عادی تھا۔ بہرحال باتیں ہوئیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ "جب کبھی تمہارے والد سے تمہارے چال چلن

کے بارے میں گفتگو ہوئی میں نے ہمیشہ تمھاری تعریف کی" بہرحال یہ ملاقات ہوئی اور میرے لیے ایک نیا تعصب چھوڑ گئی۔

میں سوچنے لگا کہ کوئی آدمی یہ سُننا پسند نہیں کرے کہ اُس کے چال چلن کے متعلق اس کے باپ اور کسی تیسرے شخص کے درمیان کوئی بات ہو۔ لاٹ پادری کے اس جملے میں مجھے اُس کا اشارہ صاف نظر آگیا۔ یہ میرے اور ولیس کے تعلقات کی نشان دہی کرتا تھا لاٹ پادری کے اس اظہار کے بعد مجھ پر یہ حقیقت بھی واشگاف ہوگئی کہ مجھے اپنی حسب خواہش شادی کے سلسلے میں چرچ سے حمایت کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ کیونکہ لاٹ پادری میری اور ولیس کی محبت کا سخت دشمن نظر آتا تھا۔

ہنگاموں کا دور میں نے گزشتہ ایام کی طرف نظر دوڑائی۔ ظاہر ہے کہ میں اب تک اپنے معاملات میں بالکل آزاد تھا، مگر اب سینٹ جیمز پیلس کے کلاک ٹاور پر لہراتا ہوا برطانوی جھنڈا میرے سابقہ آزاد دنوں کے ختم ہونے کا اعلان کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ میری وہ امیدیں خیالات اور میری تمام حرکات وسکنات جن میں میری زندگی کا ایک گہرا راز بھی پوشیدہ تھا میرے اس نئے مرتبے کے ساتھ ہی میرے ذاتی اختیار سے نکل چکی تھیں اور شاہی قوم کے وسیع حلقے کے قبضۂ اختیار میں چلی گئی تھیں۔ یہ حلقہ اگر چاہے تو میری اُس اُمید کو فنا کرسکتا ہے۔

اس دوران میں میرے اور ولیس کے متعلق داستانیں امریکی اور برطانوی اخبارات میں چھپنے لگیں۔ امریکی اخبارات نے مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کیں اور ایسی ایسی خبریں شائع کیں جن سے خواہ مخواہ لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔

طلاق کی درخواست ولیس نے اپنے شوہر سے طلاق لینے کے لیے ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو عدالت میں درخواست دائر کر دی۔ اس درخواست کی پیروی کے لیے اُس نے لندن کے مشہور وکیل گارڈڈ کی خدمات حاصل کیں۔ امریکی اخبارات نے عدالتی کارروائی کے متعلق بڑی زوردار خبریں شائع کردیں۔ اور یہ افواہیں بھی پھیلانے لگے کہ طلاق حاصل کرنے کے بعد ولیس بادشاہ سے شادی کرلے گی۔ برطانوی اخبارات نے بھی ان خبروں کے سلسلہ میں امریکی اخبارات کی پیروی کی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں

اخباروں کا رویّہ ایسا ہے جس سے ویلس کے لیے اس طلاق کے سلسلے میں پریشانی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دو بڑے اخبار نویس دوستوں لارڈ بیور بروک اور ہارمز ورتھ سے ملاقات کی۔ یہ دونوں "ڈیلی ایکسپریس" اور "ایوننگ سٹینڈرڈ" کو کنٹرول کرتے تھے۔ میری درخواست پر ۱۶ اکتوبر کو بیور بروک محل میں آیا۔ میں نے اُس سے یہ نہ کہا کہ وہ میرے معاملے میں اپنے اخبار کے ذریعہ عام لوگوں کی رائے میرے حق میں استوار کرے، بلکہ میرا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان خبروں سے خواہ مخواہ سنسنی پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بیور بروک اور ہارمز ورتھ دونوں نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اس کے بعد ان اخباروں نے اپنا رویّہ درست کر لیا مگر امریکی اخباروں کی روش نہ بدلی۔

ایک اتوار کو میں تفریح کی غرض سے سنڈرنگم گیا تو اچانک پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے اطلاع ملی کہ وزیراعظم مسٹر بالڈون مجھ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔ میرے لیے یہ اچانک ملاقات باعثِ حیرت تھی تاہم ونڈسر پارک میں صبح دس بجے کا وقت طے ہوا۔ ٹھیک دس بجے مسٹر بالڈون آ گئے میں صوفے پر بیٹھا تھا اور وہ آرام کرسی پر۔ باتیں ہونے لگیں۔ مسٹر بالڈون نے فوری ملاقات کا باعث بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میرا اور ویلس کا مسئلہ بہت خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے اور وہ محض ایک وزیراعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے میری مدد کرنے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات میں جو خبریں شائع ہو رہی ہیں ان سے بادشاہ کی پوزیشن خطرے میں پڑ گئی ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں، اگرچہ انھوں نے صاف طور پر مجھے کوئی مشورہ نہ دیا، لیکن ان کی تمام گفتگو کا مطلب یہ تھا کہ میں ویلس سے کہوں کہ وہ اپنی طلاق کی درخواست واپس لے لے۔ مگر میں یہ کیسے کر سکتا تھا۔

"مسٹر بالڈون! میں کسی فرد کے ذاتی معاملات میں کیسے دخل دے سکتا ہوں، میں مسز سمپسن پر محض اس لیے اثر انداز ہونے کی کوشش کروں کہ وہ میری دوست ہے؟"

بہرحال گفتگو کے اختتام تک بالڈون نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ کیا مسز سمپسن کی طلاق کے بعد میں اُس سے شادی کروں گا۔ مسٹر بالڈون چلے گئے مگر میں نے اُن کے رویّے سے

جان لیا کہ مسئلہ بہت اُلجھ گیا ہے۔

اِن حالات میں مَیں نے اپنے ایک دوست والٹر مانکٹن سے ملاقات کی یہ نہایت قابل بیرسٹر تھے۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس مسئلے میں آخر تک مجھے مشورے دیتے رہیں۔ انھوں نے میری یہ خواہش قبول کر لی۔

طلاق ہو گئی اس واقعے کے چار دن بعد طلاق کا مقدمہ سُنا گیا اور مسز سمپسن کے حق میں پہلی ڈگری دے دی گئی۔ مروّجہ قانون کے مطابق مکمل اور آخری ڈگری قریباً چھ ماہ بعد ملنی تھی۔ اس حساب سے اپریل ۱۹۳۷ء سے قبل ولیس دوبارہ شادی نہ کر سکتی تھی۔ میری تاج پوشی کی تاریخ ۱۲ مئی تھی چنانچہ معاملے سے نپٹنے کے لیے میرے پاس کافی وقت تھا۔ ۱۳ نومبر کی شام کو مجھے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے ایک ضروری اور خفیہ خط موصول ہوا جس کے متعلق یہ ہدایت تھی کہ اسے فوراً کھول لیا جائے۔ میں نے اُسے کھولا اور پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ آج میں زندگی کے ایک بڑے حیران کن دوراہے پر کھڑا ہوں۔ سیکرٹری نے لکھا تھا کہ آج وزیر اعظم اور اس کی حکومت کے دوسرے اراکین فوری طور پر لندن میں اس لیے جمع ہو رہے ہیں کہ جو خطرناک صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے اُس کے لیے حکومت کا فیصلہ مرتب کیا جائے کہ کیا ہونا چاہیے۔ سیکرٹری نے یہ بھی لکھا کہ اس معاملے میں لندن کے اخبارات نے جو خاموشی اختیار کر رکھی ہے وہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جائے گی اور حکومت کے مستعفی ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ اُس نے آخر میں لکھا کہ بادشاہ کے لیے ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مسز سمپسن کو فوری طور پر سمندر پار بھیج دیا جائے۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اخبارات نے جو اقدام کرنے کا فیصلہ کیا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ معاملہ بیحد خطرناک ہو چکا ہے۔

یہ خط پڑھ کر مجھے سخت صدمہ پہنچا اور غصہ بھی آیا۔ مسز سمپسن کو سمندر پار بھیجنے کا جو مشورہ دیا گیا تھا اُس نے مجھے برہم کر دیا۔ "میں اُس عورت کو اپنی سرزمین سے نکال دوں جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں؟" میں نے پہلے اپنے ٹیلیفون کو بند کیا تا کہ کوئی میری سوچ میں حائل نہ ہو پھر سر جوڑ کر بیٹھ گیا اور معاملے پر غور کرنے لگا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد خط نکال کر دوبارہ پڑھنے لگا۔ جوں جوں پڑھتا جاتا میری اُلجھن اور بڑھتی جاتی۔ میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا

کہ میرے سیکرٹری نے کن حالات کے تحت ایسی باتیں لکھیں۔ اس میں میرے لیے دھمکی بھی تھی اور الٹی میٹم بھی۔ میں جان گیا کہ مسٹر بالڈون ہی ایسے حالات پیدا کرنے کا باعث ہے۔

کابینہ کی مداخلت

میں رات بھر نہ سو سکا۔ اب یہ سوچنے اور انتظار کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے بالڈون اور اُس کے حواریوں کے ساتھ فیصلہ کن بات کرنے کا عزم کر لیا۔ میں نے سوچا کہ اپنے مشیر والٹر مانکٹن کے ذریعہ بات کی جائے۔ چنانچہ اتوار کی دوپہر کو ونڈسر میں اُس سے ملاقات کا طے ہوا۔

ولیس اور اس کی چچی امریکہ سے آئی ہوئی تھی اور میرے ساتھ سیر و تفریح میں مصروف تھیں۔ میں نے سوچا کہ انھیں ابھی اس معاملہ سے آگاہ نہ کیا جائے۔ میں ان کے ہمراہ موٹر میں چلا جا رہا تھا۔ جب ہم فراک مور گیٹ میں داخل ہونے لگے تو گیٹ کیپر نے جو فوجی ملازم تھا، آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور مجھے جھک کر سلام کیا اُس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ کچھ دُور آگے جا کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو گیٹ کیپر بڑے اطمینان سے اپنی جھونپڑی میں چارپائی پر لیٹ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا لکڑی کی ٹانگ والا یہ شخص اپنی زندگی میں کتنا مطمئن ہے۔ یہ وہ شخص ہے جسے اطمینانِ قلب حاصل ہے اسے ایسی اُلجھن کی قطعاً پروا نہیں جو آج مجھے درپیش ہے۔ میں اپنے مشیر سے ملا۔ اُسے وہ خط دکھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس خط سے اُسے بھی اتنا ہی صدمہ ہوا ہے جتنا مجھے۔ جب بالڈون کے متعلق بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اور بالڈون سے فوراً ملنا چاہیے۔ اتفاق سے جلد ہی والٹر مانکٹن کہیں باہر چلا گیا اور مجھے خود ہی وزیر اعظم سے ملنا پڑ گیا۔ اُسے ملنے سے قبل میں نے ضروری خیال کیا کہ ولیس کو صورتِ حال بتا دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ خط میں نے اُسے دکھایا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا کوئی خیال ظاہر کرتی میں نے خود ہی کہا یہ لوگ خواہ مخواہ ہمارے درمیان رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ یہ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ تمھیں چھوڑ دوں۔ میں نے دیکھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد ولیس گم سُم ہو گئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا میں کل وزیر اعظم سے مل رہا ہوں اور اُسے کہوں گا کہ اگر حکومت ہماری شادی کے خلاف ہے تو میں تخت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ۱۶ نومبر کو شام کے ساڑھے چھ بجے

بکنگھم ہال میں میری اور بالڈون کی ملاقات ہوئی۔ میرا پہلا سوال یہ تھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اور آپ کی وزارت کے بہت سے اراکین بعض دستوری مجبوریوں کے تحت میری اور مسز سمپسن کی دوستی کے خلاف ہیں۔"

"جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" بالڈون نے کہا "وزارت میں میرے دوسرے ساتھی اس بات پر بہت متحیّر ہیں کہ بادشاہ ایک ایسی عورت سے شادی کرے جو پہلے شوہر سے طلاق لے چکی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ کس بات کو برداشت کر سکتے ہیں اور کونسی بات اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔" غرض خاص دیر تک باتیں ہوئیں اور ہم الگ ہو گئے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس تمام پریشان کن مدت میں کنٹربری کے لاٹ پادری کا کہیں نام نہ آیا۔ اور نہ اُس نے اپنی کسی رائے کا اظہار کیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ بھی میرے خلاف ہیں۔ میں نے مسٹر بالڈون سے صاف صاف کہہ دیا کہ شادی ہو کر رہے گی خواہ میں بادشاہ رہوں یا نہ رہوں۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ جونہی مسز سمپسن شادی کے معاملے میں آزاد ہو گی میں اُس سے شادی کر لوں گا۔ اگر میں بادشاہ کی حیثیت سے شادی کروں تو زیادہ اچھا ہے۔ مجھے زیادہ خوشی ہو گی اس کے برعکس اگر حکومت نے شادی کی مخالفت کی جیسا کہ مجھے بتایا جا رہا ہے۔ میں تخت چھوڑ دوں گا۔

شادی کے سلسلے میں میں نے اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے بھی بات چیت کی۔ میری والدہ کو احساس ہو چکا تھا۔ کہ میں اپنے ارادے سے باز نہ رہ سکوں گا۔ لہٰذا اُس نے مخالفت نہ کی جب میں نے اپنے دوسرے بھائی جارج کو صورتِ حال بتائی اور اُس سے کہا کہ میں تخت چھوڑنا بھی قبول کر لوں گا تو میرے اٹل ارادے کے پیشِ نظر اس نے بھی میری حمایت کی۔

اس کے بعد مجھے ساؤتھ ویلز کے دورے پر جانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے سفر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ واپسی پر میں نے مناسب جانا کہ کابینہ کے بعض وزراء کو اپنے حق میں لانے کی کوشش کروں۔ سب سے پہلے میں سیموئیل ہور سے ملا۔ پھر ڈف کوپر سے ملاقات کی۔ پھر اور لوگوں سے بھی ملا، مگر مایوسی کے سوا کچھ نہ پایا۔ —

ابھی چمن میں بگولوں کا رقص جاری ہے
ابھی کچھ اور بڑھے گی چمن کی ویرانی

دھمکی آمیز خطوط

اِس دوران میں مجھے اور ویلس کو گمنام خطوط آنے شروع ہو گئے۔ میں اپنے تجربے کے پیشِ نظر اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسے خطوط کا اصل مقام آگ ہے چنانچہ میں اُنھیں انگیٹھی میں ڈال دیا کرتا تھا۔ ویلس کے لیے یہ خطوط نئی بات تھی۔ لہٰذا وہ کسی قدر دہشت زدہ ہو گئی۔ اُس نے اب کمبرلینڈ ٹیریس میں مکان لے لیا تھا جہاں وہ اپنی چچی کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا مکان ایک حیرت کدہ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ گھر سے باہر جا کر خرید و فروخت کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ مجھ تک ایک افواہ پہنچی کہ ویلس کے گھر کو بارود سے اڑا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے اس افواہ کی کچھ پروا نہ کی اور ویلس اور اُس کی چچی کو مشورہ دیا کہ وہ میرے ہاں آ جائیں جہاں انھیں کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب کابینہ نے ہماری شادی کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔ میرے سامنے تین تجاویز رکھی گئیں کہ ان میں جس ایک کو چاہوں اپنے لیے پسند کر لوں:

۱۔ شادی کا خیال چھوڑ دوں۔
۲۔ اپنے وزیروں کی مرضی کے خلاف شادی کر لوں۔
۳۔ تخت چھوڑ دوں۔

وزیرِ اعظم کی درخواست یہ تھی کہ میں پہلی بات قبول کر لوں اور دوسری دونوں کو چھوڑ دوں دوسری شرط کے مطابق اگر میں وزیروں کی مرضی کے خلاف شادی کر لوں تو مجھ پر تیسری شرط کا اطلاق خود بخود ہو جاتا تھا یعنی مجھے تخت چھوڑنا پڑتا تھا اور وزیرِ اعظم نے خود بھی مجھ سے یہ بات کہہ دی تھی۔

"مسٹر بالڈون! کیا واقعی تم ان میں سے کوئی ایک شرط مجھ سے قبول کرانا چاہتے ہو" میں نے وزیرِ اعظم سے پوچھا۔

"عالی جاہ! میری دلی خواہش ہے بلکہ سارے کابینہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ ہمارے بادشاہ رہیں گے۔" وزیرِ اعظم نے کہا۔

"تخت رہے یا نہ رہے، مسٹر بالڈون! میں ضرور شادی کروں گا۔ خواہ مجھے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر ضروری ہوا تو میں اس شادی کی خاطر تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

افسوس کے عالم میں میں فورٹ چلا آیا، تاکہ ویلس کو بتا دوں کہ ہم دونوں کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے ویلس سے کہا کہ میرے ساتھ گھومنے کے لیے باہر چلے۔ چنانچہ ہم باہر نکلے اور فورٹ کے آس پاس پھرنے لگے۔ تاریکی چھا چکی تھی۔ میرے لیے یہ رات بڑی غمناک تھی۔ سردی بھی زیادہ تھی اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اور ویلس آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یہ ماحول ویلس کو یہ افسوسناک واقعہ بتانے کے لیے عین موزوں تھا۔

"آج بہت بُرا دن تھا" میں نے ویلس سے مخاطب ہو کر کہا "میں بالڈون سے ملا تھا۔ اُس نے میری پسند کی کوئی بات باقی نہیں رہنے دی۔ میں یا تو تمھیں چھوڑ دوں یا تخت چھوڑ دوں۔ دونوں میں سے ایک پر مجھے عمل کرنا ہوگا۔"

ویلس کے چہرے پر اندوہ کے آثار مجھے صاف نظر آ رہے تھے مگر وہ مایوس نہ ہوئی تھی اُس نے جو جواب دیا وہ نہایت مناسب تھا۔ وہ بار بار یہی اصرار کرتی رہی کہ میں کسی حالت میں بھی تخت نہ چھوڑوں۔

مجھے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ میری وجہ سے ویلس پر مصیبتیں نازل ہونے لگی تھیں۔ جب میں نے اس سے اخباری حلقوں کی زیادتیوں کے متعلق بات چیت کی تو وہ خاموش رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر کہنے لگی بہتر یہ ہے کہ میں انگلستان چھوڑ جاؤں۔

چونکہ ہمارے اکٹھے رہنے سے حالات اور زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے، اس لیے میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے اس بات سے بھی خوشی ہوئی کہ اس نے سفر کیلئے جانے کا ارادہ کیا۔ میں نے جان لیا کہ اپنی بادشاہت کو بحال رکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ لہذا ویلس کے چلے جانے کے بعد میں بھی کچھ دنوں بعد اس کے پیچھے چلا جاؤں گا تاہم تخت کو بچانے کے لیے میں نے آخری قدم اٹھایا۔

رعایا سے اپیل میں نے سوچا کہ اگر میں اپنی رعایا کے سامنے کھڑے ہو کر خود اپنی مجبوریاں کو بیان کروں اور انھیں بتاؤں کہ ایک عام انسان کی طرح میں بھی اپنا ذاتی حق لے رہا ہوں اور جس طرح میری رعایا کے تمام افراد اپنی مرضی کے مطابق شادیاں کرتے ہیں اسی طرح میں کرنا چاہتا ہوں، تو عین ممکن ہے لوگوں کی رائے میرے حق میں ہو اور میرا کام آسان ہو جائے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک تقریر لکھوں اور اُسے براڈ کاسٹ کروں۔ موضوع کے لحاظ سے میری یہ تقریر ایک قسم کی اپیل تھی، جو میں اپنے ملک سے کرنا چاہتا تھا۔

اس دوران میں اخبارات نے اودھم مچا رکھا تھا۔ میرے متعلق خبریں اور واقعات اس طریقہ سے شائع کیے جا رہے تھے کہ ان سے لوگوں میں بہت سنسنی پھیلتی جا رہی تھی۔ ویلس پر بھی حملے کیے جا رہے تھے اور میری ذات کے متعلق بھی بعض ناخوشگوار باتیں لکھی جا رہی تھیں۔ مجھے اخباروں کی اس روش پر بڑا افسوس ہوا۔ عام طور پر کابینہ اور وزیر اعظم کے فیصلوں کی حمایت ہی ہو رہی تھی۔ مختصر یہ کہ سارے ملک میں میرے اور ویلس کے حق میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی فرد واحد ہماری بات سننے کے لیے تیار تھا۔ نامساعد حالات کے باوجود میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ہر حالت میں اپنے دل کی بات اپنی رعایا تک ضرور پہنچا کر رہوں گا۔

میں اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ سامنے اخبارات پڑے تھے میں نے انھیں ایک طرف پھینک دیا اور اپیل لکھنے لگا۔ جب ڈرافٹ تیار ہو گیا تو میں نے اپنے مشیر مانکٹن اور جارج ایلن کو لندن میں فون کیا کہ جلد از جلد میرے پاس پہنچیں۔ ابھی وہ دونوں پہنچے نہ تھے اور میں بدستور لکھنے میں مصروف تھا کہ ویلس میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں لندن کا ایک مصور اخبار تھا۔ اس نے اخبار میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "کیا آپ نے یہ دیکھا ہے؟"

"ہاں میں نے دیکھ لیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہ بہت برا ہے۔"

ایک سنسنی خیز اخبار کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں کسی عورت کے متعلق ہراس پھیلانے والی باتیں لکھنی کتنی بری بات ہے۔

"مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ لوگ ایسا کریں گے"۔ ویلس نے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی ان لوگوں سے ایسی توقع نہ تھی"۔ میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے اس کی دل جمعی کی خاطر بعض باتیں کیں اور اس کی حوصلہ افزائی کی مگر وہ غیر مطمئن اور افسوسناک لہجہ میں بولی "صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ میری اور آپ کی ذات پر حملے کر رہے ہیں بلکہ اپنے بادشاہ پر حملہ کر رہے ہیں"۔ ویلس کی آواز میں غصہ بھی تھا۔

میں نے اُسے پھر تسلی دی اور کہا کہ وہ ان باتوں کی پروا نہ کرے مگر میں نے دیکھا کہ اس پر دکھ اور یاس کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اس دن اس کا چہرہ خلافِ معمول بہت اترا ہوا تھا۔

میں نے اپنی تحریر ایک طرف رکھ دی اور ویلس کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے آج پھر مجھ سے وہی بات کی جو اس سے پہلے متعدد مرتبہ کہہ چکی تھی۔ یعنی اب بھی وقت ہے آپ چاہیں تو تخت کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس راستے میں ہر مصیبت اور ہر محرومی کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم کیوں ایسی باتیں کہتی ہو۔

"میں اب ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ میں آج دوپہر کے بعد انگلستان سے ضرور چلی جاؤں گی"۔ ویلس بولی۔

منزل اک جست کی نہیں مرہون
راہ میں سینکڑوں مقام آئے

خفیہ روانگی ویلس فرانس جانے کو بالکل تیار بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا اگر ویلس کی روانگی کا لوگوں کو علم ہو گیا تو اخبارات میں اس کے متعلق اور زیادہ شور مچ جائیگا اور نئی نئی باتیں تراش لی جائیں گی۔ لہذا ضروری ہو گیا کہ اس روانگی کو خفیہ طور پر عمل میں لایا جائے۔ طے ہوا کہ رودبارِ انگلستان کو رات کی تاریکی میں عبور کیا جائے۔ فورٹ سے ساحلِ سمندر تک موٹر میں سفر کیا جائے۔ میں نے ویلس سے کہا کہ وہ اکیلی نہ جائے بلکہ میں اپنے خاص آدمی اس کے ساتھ کیے دیتا ہوں۔ وہ نہ مانتی تھی مگر میں نے اصرار کر کے اُسے اس پر رضامند کر لیا۔ چنانچہ سکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک شخص کو اس کے ساتھ جانے کے لیے بلا لیا۔ لارڈ براؤن لو بیری اور اس کی بیوی کٹی کو بھی ساتھ کر دیا۔ سفر کا پورا خاکہ تیار کر لیا گیا۔

مانکٹن اور جارج ایلین نے ڈرافٹ کی تیاری میں میری مدد کی۔ یہ ایک سادہ سا بیان تھا جس میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہ پایا جاتا تھا۔ مگر اسے براڈ کاسٹ کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔

اس اپیل میں میں نے کوئی مراعات نہ مانگی تھیں بلکہ ایک عام شخص کی حیثیت سے اپنے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں میں نے اپنی الجھن کو واضح اور صاف انداز میں پبلک کے سامنے رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں عام لوگوں کی سطح پر کھڑے ہو کر ان سے خطاب کروں گا تو میری اپیل رائیگاں نہ جائے گی۔ میں نے کوئی بات لوگوں سے چھپائی نہ تھی بلکہ ہر بات صاف صاف لکھ دی تھی۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میری رعایا کے ہر فرد کو جو بنیادی حق حاصل ہے۔ وہ میری کابینہ کا وزیر اعظم مجھے دینے سے انکار کر رہا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں نے اس شادی کا تہیہ کر لیا ہے اور نہ میں نے اور نہ ہی مسز سمپسن نے کبھی یہ خواہش کی ہے کہ وہ ضرور ملکہ بنے۔ البتہ ہماری یہ خواہش ضرور ہے کہ شادی کی خوشگواریوں کے ساتھ ساتھ ہمارے مناسب خطابات بھی بحال رہیں اور میری بیوی کا وقار بھی قائم رہے۔ ایسا وقار جو میری بیوی کے شایانِ شان ہو سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی لکھا کہ میں آپ لوگوں کو اپنے کامل اعتماد میں لے کر یہ تمام باتیں بیان کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ زیادہ دیر کے بغیر میرے اس بیان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اپنی خواہش اور دلی جذبات سے مجھے آگاہ کریں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں تخت کو نہ چھوڑوں لیکن کیسے ہی کڑے حالات پیدا ہو جائیں اور کیسی ہی مصیبت آ جائے اور مجھے خواہ کوئی بھی قدم اٹھانا پڑے، میں ہمیشہ اپنے ملک کی محبت کو دل میں قائم رکھوں گا، اپنی سلطنت اور لوگوں کی محبت میرے دل سے کبھی نہ جائے گی۔

میں نے اپیل تیار کر لی تھی۔ اگرچہ مجھے توقع تھی کہ لوگ میری باتوں پر ضرور غور کریں گے مگر میں وزیر اعظم سے کوئی توقع نہ رکھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اسے پسند نہ کرے گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ تقریر میں خود لے کر لندن جاؤں گا۔ اور والیس کے چلے جانے کے بعد ایسا کروں گا چونکہ دستور کے مطابق بادشاہ کو عوام سے خطاب کرنے سے قبل حکومت سے اپنی تقریر کی

منظوری لینا پڑتی ہے، اس لیے یہ مرحلہ باقی تھا۔

ویلس غائب ہو گئی ویلس کی روانگی کا وقت قریب آ گیا۔ میں، ویلس، ویلس کی چچی، پیری اور الیگزانڈر اکٹھے چائے پی رہے تھے، مگر چونکہ ہم سب تشویش میں مبتلا تھے اس لیے اچھی طرح کھا پی نہ سکے۔ جب رخصت کا وقت آیا تو سب کے چہروں پر غم کے آثار تھے۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ جدائی کتنی مدت کے لیے ہو گی۔ چنانچہ یہ کسی نے نہ پوچھا کہ کب ہم لوگ پھر ملیں گے۔ ویلس پر عجب کیفیت طاری تھی۔ میں نے جان لیا کہ وہ میرے متعلق بہت فکرمند ہے کہ نہ جانے اس کے بعد مجھ پر کیا گزرے۔

ہلکی روشنی میں میں نے ان سب کو الوداع کہا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا شخص آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے یہ مختصر قافلہ چل دیا، اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی تقریر کا کاغذ لے کر لندن گیا۔ محل میں پہنچا تو والٹر مانکٹن کو اپنے کمرے میں موجود پایا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی ہم نے گفتگو شروع ہی کی تھی کہ وزیراعظم کا آدمی آ گیا۔ اس نے پیغام دیا کہ وزیراعظم آ رہے ہیں۔ میں نے مانکٹن سے کہا کہ وہ دفتر میں جا کر میرا انتظار کرے میں وزیراعظم سے ملنے کے بعد وہاں آ جاؤں گا۔ جارج مانکٹن بھی وہاں آ چکا تھا۔ لہذا میرے کہنے پر دونوں دفتر میں چلے گئے۔ اور میں وزیراعظم کی ملاقات کے لیے کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

وزیراعظم آ گیا اور ہم مصروف گفتگو ہو گئے۔ ہم دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں نے براڈکاسٹ کا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔ وہ سنتے ہی چونک اٹھا۔ میں نے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

مجھے یاد نہیں میں نے کاغذ اس کے ہاتھ میں دیا یا نہیں۔ بہرحال اس نے وعدہ کیا کہ کل صبح وہ کابینہ کا خاص اجلاس طلب کر کے اس میں یہ معاملہ پیش کر دے گا۔ اپنے طور پر اس نے کچھ نہ کہا کہ آیا وہ براڈکاسٹ کی منظوری دینے کے حق میں ہے یا نہیں۔

اس دوران میں مجھے اپنی والدہ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس نے اخباروں میں جو خبریں پڑھی تھیں ان کے باعث وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ چونکہ گزشتہ دس دنوں سے اس نے مجھے نہ دیکھا تھا اس لیے وہ چاہتی تھی کہ فوراً اس کے پاس جاؤں۔ میں نے جان بوجھ کر اس سے

ملاقات نہ کی تھی اس لیے کہ یہ میرا ذاتی معاملہ تھا اور ہر مصیبت کا سامنا مجھے خود کرنا تھا میں نہ چاہتا تھا کہ والدہ یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کو پریشان کروں۔ اب جبکہ اس نے بلا بھیجا میں چلا گیا۔ اور ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی میں نے اسے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس مسئلہ میں تمھارا یا اپنے کسی اور عزیز کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ میں خود ہی اپنے معاملے سے نپٹ لوں گا۔ میں والدہ سے مل کر چلا آیا۔

شادی کی عام حمایت

دوسری صبح میرے لیے شام غم سے بھی بڑھ کر تھی۔ ولیس جا چکی تھی [1]، اس کی یاد مجھے رہ رہ کر ستا رہی تھی۔ میں نے اس کے قیام کی جگہ کو پوشیدہ رکھا میرے اور میرے خاص دوستوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ میں والٹر مانکٹن کے کمرے میں گیا۔ آج کے اخبارات کے ڈھیر لگے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ لوگوں کی رائے اچانک بدل چکی ہے۔ اب تک یہ حال تھا کہ ایک بھی اخبار یا ایک بھی لیڈر میرے حق میں نہ تھا مگر آج قریباً تمام اخباروں میں میری شادی کے حق میں مضمون لکھے گئے تھے۔

" آج کے اخبار پڑھنے کے قابل ہیں " والٹر مانکٹن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" ہاں واقعی " میں نے کہا اور اخبارات پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈیلی ایکسپریس نے لکھا تھا " اگر بادشاہ ایسا اقدام کرنے پر تل جائے تو کوئی بھی حکومت اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنے فیصلے سے اپنے لوگوں کو آگاہ کرے اور اس کے متعلق اپنے دلائل بیان کرے "۔

" ڈیلی میل " نے لکھا " تخت سے دستبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے بڑی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سلطنت پر اس کا تباہ کن اثر پڑے گا "۔

" ویسٹرن مارننگ نیوز " نے بھی شادی کے حق میں دلیلیں دی تھیں۔

---

[1] ولیس نے فرانس کے جنوبی ساحل کے کنارے کینز (CANNES) کے مقام پر سکونت اختیار کر لی تھی کیسر سردیاں گذارنے کے لیے بہترین جگہ ہے آبادی چھیالیس ہزار کے قریب ہے۔

لبرل کے اخبار "نیوز کرانیکل" نے بھی میری حمایت میں لکھا تھا۔

وزیر اعظم کی بوکھلاہٹ

"نیو سٹیٹسمین" اور "نیشن" نے بھی شادی کے حق میں بہت کچھ لکھا تھا۔ کیتھولک کے اخبار "ٹیبلٹ" نے لکھا کہ شادی کے متعلق طے کرنا بادشاہ کا ذاتی کام ہے۔ دستور سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اسے تخت چھوڑنے کا باعث بنایا جا سکتا ہے۔ بکنگھم محل، سینٹ جیمز پارک اور ڈاؤننگ سٹریٹ میں لوگوں کے ہجوم اکٹھے ہو گئے تھے جو بادشاہ کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرے پُرامن تھے مگر لوگوں کے دلوں کی بات صاف نظر آ رہی تھی۔ مسٹر بالڈون کو اخباروں کے بیانات اور لوگوں کے رویے نے پریشان کر دیا اور وہ بھونچکا رہ گیا۔

مجھے لوگوں سے خطاب کی اجازت دینے کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے کابینہ کا جو فوری اجلاس طلب کیا تھا وہ ساڑھے دس بجے ہوا۔ ابھی مجھے اس اجلاس کے فیصلے کا انتظار ہی تھا کہ اس دوران میں ایک منحوس خبر ملی۔

ویلس کا سراغ مل گیا

رپورٹر کے چیف ایڈیٹر مسٹر برنارڈ کا ٹیلیفون آیا کہ ویلس کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ دنیا کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ فرانس میں ہے اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ وہ کنیز میں رہ رہی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اخباروں کے رپورٹروں نے وہاں جانا شروع کر دیا ہے۔ مسٹر برنارڈ مجھے صرف اتنا ہی بتا سکا۔ میں حیران رہ گیا کہ ہم نے اس بات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پورا اہتمام کیا تھا۔ پھر یہ راز طشت از بام کیسے ہوا۔

یہ انکشاف یوں ہوا کہ جب ویلس نے فرانس کے ساحل پر قدم رکھا اور اس کی کار کے کاغذات کی پڑتال کی گئی تو فرانس کے عملے نے ان کاغذات پر ویلس کا نام پڑھ لیا۔ ہمیں گھبراہٹ میں اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ یہ نام بدل دیا جاتا۔ بہرحال فرانسیسی سٹاف کے لوگوں پر یہ راز ظاہر ہو گیا۔ علاوہ ازاں جب ویلس پیری اور دوسرے لوگ ایک ہوٹل میں جائے پینے گئے تو وہاں ایک فرانسیسی اداکارہ نے ویلس کو پہچان لیا۔ جب یہ لوگ باہر نکلے تو اداکارہ نے ان کا پیچھا کیا اور لوگوں کو بتا دیا کہ یہ ویلس ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ویلس کو دیکھنے کے لیے لوگ بے تابانہ جمع ہونے لگے۔ پیری نے فوراً ایک کار

سنگانی اور اس میں ولیس اور دو دوسرے ساتھیوں کو بٹھا کر غائب ہو گئی - یہ لوگ چلے گئے
گر اہل فرانس کو پتہ چل گیا کہ ولیس یہاں آئی ہوئی ہے - پھر اس کی جائے قیام کا بھی لوگوں
کو علم ہو گیا ع
حادثہ سخت سہی پھر بھی سنبھلنا ہو گا

آخری امید ختم | کابینہ کا خاص اجلاس ہوا - میری تقریر کا سوال پیش ہوا - کابینہ نے اسے
مسترد کر دیا - مجھے لوگوں سے خطاب کرنے کی اجازت نہ دی گئی - میری آخری توقع بھی جاتی رہی
مسٹر بالڈون نے مجھ پر پہلا خطرناک وار کیا -

"اپنی شادی کے سلسلہ میں بادشاہ کو کسی بھی شخص سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں
کہ وہ قانونی ہے یا نہیں - مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں جس عورت سے بادشاہ شادی
کرنا چاہتا ہے وہ شادی کے بعد خود بخود ملکہ بن جاتی ہے - اور اُسے خود بخود وہ تمام
حقوق، مراعات، درجے اور اعزاز حاصل ہو جاتے ہیں جو ایک ملکہ کو ہونے چاہئیں
اور جو مرحومہ ملکہ الگزانڈرا اور ملکہ میری کو حاصل ہیں - اور اس کی اولاد براہِ راست
تخت کی وارث ہو گی"

وزیر اعظم کے بیان میں مذکورہ بالا حصہ بھی شامل تھا - اور اس بیان کے ساتھ وزیر اعظم
نے یہ بھی کہا کہ روایات کے مطابق ملکہ کو جو اعزاز اور درجہ حاصل ہے - حکومت اس میں کسی
قسم کی تبدیلی یا کمی کرنے کو تیار نہیں -

جس رات یہ فیصلہ ہوا - اُس رات میری اور وزیر اعظم کی ملاقات ہونی تھی تاکہ میں یہ
فیصلہ خود اس کی زبان سے سنوں -

وزیر اعظم آیا - اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ میری وزارت بادشاہ کو پبلک براڈکاسٹ کی
اجازت دینے سے انکاری ہے - اس نے مختلف وزراء کے دلائل بھی بتلائے اور مجھے اس بات
پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ یہ سب قانونی مجبوریوں کے باعث ہوا ہے -

میں جانتا تھا کہ بادشاہ کو پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر عوام سے خطاب کرنے کی اجازت
نہیں ہوتی - چنانچہ اب جبکہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی گئی تھی - اگر میں اجازت کے بغیر
ایسا کر دیتا تو اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ شاہی دستور کے معاملے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے

اور شاید کابینہ کے وزراء کے لیے ایک نئی الجھن پیدا ہو جاتی۔

مسٹر بالڈون سے باتیں ختم کرنے کے بعد میں جانے لگا تو محسوس کیا کہ وہ ابھی مزید کچھ کہنا سننا چاہتا ہے۔ میں رک گیا۔ "عالی جاہ! آپ اب بھی اپنا ارادہ ترک کر سکتے ہیں، یہ صرف میری خواہش ہی نہیں بلکہ آپ کے سب خادموں کی خواہش ہے" بالڈون نے کہا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ابھی اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ ممکن ہوا تو اس ہفتہ کے ختم ہونے سے قبل میرا فیصلہ آپ کو معلوم ہو جائے گا" میں نے کہا۔

ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

محبت کی قدر و قیمت

رات ہو چکی تھی میں فورٹ میں چلا گیا۔ ٹیلیفون اور چٹھیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ملک کے طول و عرض سے مجھے ہمدردی کے پیغامات موصول ہو رہے تھے ریاستہائے متحدہ امریکہ سے بھی کئی لوگوں کی طرف سے مجھے اپنے اقدام پر مبارکباد دی گئی تھی یہی نہیں بلکہ لندن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ فورٹ کے باہر اور بازاروں میں میری حمایت میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔ عام لوگ میرے ہم نوا ہو گئے تھے۔ اگر میں اپنے دوستوں کی حوصلہ افزائی کرتا یا عوام کو مشتعل کرنا چاہتا تو ملک میں ایک آگ بھڑک اٹھتی۔ سول وار شروع ہو جاتی جو شہنشاہیت کے وقار کے خلاف تھا اور سلطنت برطانیہ کے مفاد کے منافی۔ تخت سے دستبرداری کو اب زیادہ دیر نہ لگنی چاہیے تھی۔ اور نہ ہی اس مسئلے کے متعلق اب سوچنا باقی تھا۔ یہ فیصلہ تو میں نے کر ہی لیا تھا اب صرف وزیر اعظم کے ساتھ دستبرداری کی شرائط طے کرنا تھیں۔ ان حالات میں مسٹر چرچل سے بھی میری ملاقاتیں ہوئیں وہ وزیر اعظم کے رویّہ پر خود متاسف تھے۔ اس رات وہ لندن سے کار میں میرے پاس آئے۔ اور رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایا۔ دعوت کے موقعہ پر مسٹر چرچل کے علاوہ مسٹر مانکٹن، الک الیگزانڈر اور جارج ایلن بھی موجود تھے۔

عوام کا جوش

اگلے روز بازاروں، گلی کوچوں اور پارکوں میں میری حمایت میں ہنگامے نظر آنے لگے۔ لاؤڈ سپیکروں پر نعرے سُنے گئے۔ "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے ——— سٹینلے بالڈون سے۔" یہ تھے نعرے۔ دیواروں پر جگہ جگہ لکھا تھا "بادشاہ کی حمایت کرو۔"

جب والٹر مانگٹن اپنی کار میں جاتے تو لوگ تحسین و آفرین کی تالیاں بجاتے۔ غرض اکثر لوگ میری حمایت میں تھے۔ کنٹربری کے لاٹ پادری نے بھی بعدازاں ایک بیان میں کہا تھا کہ اس موقعہ پر بیشتر لوگ بادشاہ کے حامی بن گئے تھے۔

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اگر عوامی رجحان سے میں فائدہ اٹھانا چاہتا تو بڑی آسانی سے اٹھا سکتا تھا، مگر اس طرح سول وار کا خطرہ تھا۔ اگر چاہتا تو تخت پر بھی رہ سکتا تھا مگر میرے ملک کے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے۔ اور میں ایسی حکومت کا قائل نہیں۔ میں اپنی رعایا کے کسی فرد کو دوسروں سے کاٹنے کا موجب نہ بننا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ذاتی معاملہ کے لیے سلطنت کو نقصان پہنچاتا۔ اگر میں بادشاہت پر قائم رہتے ہوئے شادی کر لیتا تو کیا میں اور ولیس خوش رہ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ باعزت طریقہ سے تخت سے علیحدہ ہو جاؤں اور ملک میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

ایک ہی راستہ | میرے سامنے دو چیزیں رکھی گئیں کہ ان میں سے ایک کو پسند کر لوں۔ محبت اور فرض، میں نے محبت کو پسند کیا۔ میں نے یقیناً شادی کی، اس لیے کہ میں محبت کے راستہ پر چل دیا، مگر میں نے تخت اس لیے چھوڑا کہ میں نے فرض کا راستہ اختیار کیا۔ تاج کی قدر و قیمت کا مجھے پورا پورا اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آسانی سے اُسے نہ چھوڑا اور نہ ہی جلد بازی سے کام لیا۔ بلکہ اُسے برقرار رکھنے کے لیے میں نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

تخت چھوڑ دیا | جب صبح ہوئی تو میں نے والٹر مانکٹن کو بلایا تاکہ اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ فوراً لندن جائیں اور وزیر اعظم کو بتا دیں کہ آج سہ پہر کے بعد جب وہ میرے ہاں آئیں گے تو میں ان سے یہ کہہ دوں گا کہ میں تخت چھوڑ رہا ہوں" میں نے کہا۔

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تخت سے دستبردار ہونے کے بعد میرے لیے کیا صورت حال ہو گی اور کیا شرائط پیش کی جائیں گی۔ والٹر مانکٹن نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے کچھ علم نہیں۔ مانکٹن نے کہا آپ کو چند دنوں کے بعد پردیس میں ایک عام شہری کی حیثیت سے رہنا پڑ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ آپ کو بہت مصائب اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان حالات میں ولیس کے ساتھ فوری طور پر آپ شادی بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ طلاق کے بعد چھ* ماہ کی مدت بھی

---

* طلاق کی پختگی ڈگری کے لیے اس مدت کا تعین تھا جو قانونی لحاظ سے ضروری تھی۔ (ادارہ)

بندی نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ جدائی آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی۔ اگر قانون اس مدت کو ختم کر دے تو آپ فوراً ہی اس سے شادی کر سکتے ہیں۔ لہذا میں اس کے لیے کوشش کروں گا۔

والٹر میری ہدایت کے مطابق لندن چلا گیا اور میرے لیے طلاق کا خاص بل منظور کرانے کی کوششیں شروع ہوگئیں، تاکہ میں دستبرداری کے فوری بعد ویلس سے شادی کر سکوں۔ مگر وزیر اعظم اور اس کی کابینہ نے میری یہ کوششیں بھی بار آور نہ ہونے دیں۔ اور طلاق کا بل بھی رد کر دیا گیا۔

بادشاہ کی بے لبسی

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ میرے وزراء ہی تھے جو میری ہر خواہش کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ انھوں نے شادی کے مسئلے میں قدم قدم پر میری مخالفت کی اور میری پریشانیوں میں اضافہ کیا۔ میں یہی کہوں گا کہ وہ اپنی ہی مرضی کو ترجیح دیتے تھے جسے انھوں نے ڈیوٹی یا فریضہ کا نام دے رکھا تھا۔ وزیر اعظم کے ہاتھ میں سارے اختیارات تھے وہ سب وزیروں پر کنٹرول کرتا تھا۔ وہ مخالفوں کو اپنے حق میں کر سکتا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبروں کو نرم کر سکتا تھا۔ وہ اخبارات کو اپنے حق میں کرنے کے لیے ان پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ وہ نو آبادیات کے وزراء کی رائے اپنے حق میں کر سکتا تھا وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ جس پارٹی پر اُس نے اپنا کنٹرول جما رکھا تھا، اس کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ پارٹی کے ایسے اراکین جن سے میرے بہت زیادہ دوستانہ مراسم تھے اور جو میرے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے وہ سب وزیر اعظم کے سامنے بے بس اور مجبور تھے۔ چنانچہ مجھے خاموش رہنا پڑ گیا۔ مجھے اس صورت حال کا اب تک افسوس ہے کہ جب مسٹر چرچل نے میرے لیے کچھ کرنا چاہا تو اُسے بھی بے بس کر دیا گیا۔ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میری ساری قوم میں مسٹر چرچل واحد شخص ہے جنھوں نے آخری دم تک میری حمایت کی۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم!

اب میرے اور وزیر اعظم کے درمیان کوئی بات باقی نہ رہی تھی۔ ہر بات کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ تخت سے دستبرداری کے بعد اب صرف سرکاری کارگزاری مرتب ہونی باقی رہ گئی تھی اور دستاویزیں تیار ہونی تھیں۔ میں نے تخت اپنے بھائی برٹی کے حوالہ کرنا تھا اور بعض خاندانی معاملات طے کرنے تھے۔ یہ امور اب میرے ذہن پر بوجھ بن گئے تھے۔ تاہم میں جلد از جلد ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار تھا۔ مگر بدقسمتی سے اچانک ایسی

باتیں میرے علم میں آئیں جنھوں نے مجھے بہت صدمہ پہنچادیا اور تھوڑی دیر کے لیے میرا ذہن معطل ہوگیا۔ مجھے پتہ چلاکہ جس مقصد کے لیے میں نے شہنشاہی کا تاج اتار پھینکا ہے وہ مقصد بھی ہاتھ سے جارہا ہے۔ میں ورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ ع

سوچتا ہوں کہ تیری چاہت کو ، نغمۂ جاں کہوں کہ شعلۂ تن

شکستِ جمال ان دنوں کیا کچھ ہوتا رہا اور اصل معاملہ کیا تھا اس کا مجھے آج تک پتہ نہیں چلا، میں نے اتنا سُنا اور مجھے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ وزیر اعظم نے بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی کہ ولیس بھی میرے ہاتھ سے جاتی رہے۔ چنانچہ ولیس کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اعلان کردے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ میرے لیے یہ خبر بہت روح فرسا تھی، مگر ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ ولیس ایسا نہیں کرسکتی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ اس سازش میں وزیر اعظم کے ساتھ میکس بیور بروک اور تھیوڈور گاڈرڈ بھی شامل ہیں۔ گاڈرڈ ولیس کے مقدمہ کے سلسلہ میں اس کا وکیل تھا۔ ان دنوں اخباروں میں جو خبریں آئیں ان میں ایک خبر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسز سمپسن ہر اس تجویز یا اقدام کے خلاف ہے جس سے بادشاہ یا تاج کو نقصان پہنچتا ہو اگر ایسی صورت پیدا ہوتی ہو یا دونوں کی ناخوشی کی صورت نکلتی ہو تو وہ شادی نہیں کرے گی۔

اس خبر سے یہ پہلو ضرور نکلتا تھا کہ چونکہ مسز سمپسن کی وجہ سے بادشاہ کو تخت چھوڑنا پڑ رہا ہے اس لیے اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بادشاہ سے شادی نہیں کرے گی۔

ان حالات سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ولیس کو ڈرایا، دھمکایا جارہا ہے، اور بڑھتے ہوئے ناسازگار حالات کے پیشِ نظر وہ شاید اس طرح سوچنے لگ گئی ہو۔ اس دوران میں وزیر اعظم نے مسٹر گاڈرڈ کو راتوں رات فرانس بھیجا، تاکہ ولیس سے ملاقات کرکے اسے ہموار کرے۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں نے ولیس کو فون کیا اور گاڈرڈ کے ارادوں سے خبردار کرتے ہوئے اُسے ہدایت دی کہ اس شخص کی بات ہرگز نہ سننا۔ وہ خواہ کیسی ہی باتیں کہیں تم ان کا اثر ہرگز قبول نہ کرنا۔

ولیس تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی پھر بولی کہ اُسے آنے دو میں اس کی باتیں سنوں گی مگر وہ اتنی دُور سے آرہا ہے۔ بے رُخی سے پیش آنا اچھا نہیں۔ ولیس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کسی

باتیں سننے کے بعد مجھ سے فون پر مشورہ کیے بغیر کوئی جواب نہ دے گی۔

اس موقعہ پر مجھے شدید خطرہ محسوس ہوا کہ ویلس میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ میں مغموم ہو گیا، جو خطرات ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے انھوں نے ویلس کو بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ مسٹر کاڈرڈ ویلیس کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کی ہو گی اور ضرور ویلس کے دل پر اثر بھی ہوا ہو گا۔ چنانچہ ویلس نے کاڈرڈ کی موجودگی میں فون پر مجھ سے بات کی۔ کہنے لگی اگر آپ مجھ سے دستبردار نہیں ہوتے تو میں آپ سے الگ ہوتی ہوں پھر کہنے لگی میں فرانس چھوڑ کر کسی اور ملک میں جانا چاہتی ہوں۔

" مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے " میں نے جواب میں کہا۔ " میں تاج و تخت چھوڑ چکا ہوں۔ اب سرکاری دستاویزیں تیار ہو رہی ہیں جن کے مطابق مجھے عمل کرنا ہو گا۔ تم اپنے معاملے میں آزاد ہو جو چاہو کرو۔ تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو —— چین جاؤ، الیبرے ٹار چلی جاؤ، یا جنوبی سمندروں کا رُخ کرو۔ جہاں بھی جاؤ گی میں تمھارے پیچھے آرہا ہوں "

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

آخری کارروائی سرکاری کاغذات تیار ہو گئے۔ جن کے ذریعہ میں نے تخت سے الگ ہونا تھا اور اپنے بھائی کے لیے جگہ خالی کرنی تھی۔ دستبرداری کے کاغذات پر میں نے دستخط کرنے تھے اور میرے تین بھائیوں نے اس پر گواہوں کے طور سے اپنے دستخط ثبت کرنے تھے۔

میں صبح کے ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاغذات میرے سامنے لائے گئے۔ دس بجے کے قریب میرے تینوں بھائی بھی وہاں آ گئے۔ یہ دو دستاویزیں تھیں۔ ایک کی سات نقلیں تھیں اور ایک کی آٹھ۔ نقلوں میں ایک کا فرق کیوں تھا؟ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ یہ نقلیں ان لوگوں کو بھیجی جانی تھیں: وزیراعظم، دارالامراء، دارالعوام، نوآبادیات کے گورنر جنرل، آئرش سٹیٹ کی ایگزکٹو کونسل کا پریذیڈنٹ اور سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا۔

اس وقت کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ اور فضا مغموم نظر آتی تھی۔ میں نے سب نقلوں پر دستخط کر دیے اور پھر گواہوں نے بھی ان پر دستخط ثبت کر دیے۔

وزیر اعظم نے کہلا بھیجا تھا کہ میں پارلیمنٹ میں رپورٹ پیش کر رہا ہوں اگر آپ کو کوئی بات کہنی ہو تو بتا دیں میں اس میں شامل کر دوں۔ میں نے دو باتیں شامل کرنے کو کہا اور انھیں کاغذ پر لکھ کر بھیج دیا۔ ایک میرے بھائی کے متعلق تھی جو میرے بعد تخت پر بیٹھ رہا تھا۔ اور دوسری ولیس کے متعلق تھی۔ پہلی بات کا ذکر تو وزیر اعظم نے اپنی رپورٹ میں کر دیا مگر مجھے افسوس ہے کہ دوسری بات اس نے اپنی رپورٹ میں شامل نہ کی۔ وہ یہ تھی کہ لوگوں کو یہ بتا دیا جائے کہ ولیس نے ہر قدم پر مجھے اپنے عزم سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ اور آخر دم تک اس سے باز رکھتی رہی۔

آخری صبح | اگلے دن میں بہت سویرے اٹھا۔ اپنے ملک میں یہ میری آخری صبح تھی میں نے سوچا کہ یوں چپ چاپ چلا جانا مناسب نہیں ہیں اپنے دل کی بات کا اظہار کر کے جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے حکومت سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کرنے کی اجازت مانگی جو دے دی گئی۔ اس تقریر میں اور باتوں کے علاوہ میں نے یہ کہا کہ میں اپنی ذمہ داریوں کے عظیم بوجھ کو اٹھانا مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں اُس عورت کے بغیر جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ ایک بادشاہ کی حیثیت سے سارا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔

نامعلوم منزل | میں نے رخت سفر باندھا، ضروری اشیا سنبھالیں اور ملک کو الوداع کہنے کے لیے تیار ہو گیا۔ فورٹ سے روانہ ہونے سے قبل میں نے ولیس کو فون کیا کہ میں روانہ ہو رہا ہوں اور اتوار سے قبل اس سے نہ مل سکوں گا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں میں نے بتایا کہ زیورچ[1] جا رہا ہوں۔ "زیورچ کیوں؟" اس نے حیرانی سے دریافت کیا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ وہاں شہر سے باہر پُرسکون جگہ پر ایک ہوٹل ہے جہاں مجھے سکون مل سکے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر آپ ہوٹل میں نہ جائیں، وہاں آپ کو تنہائی میسر نہ آئے گی۔"

ولیس نے کہا اور مجھے مشورہ دیا کہ ویانا کے قریب انس فیلڈ میں اس کی ایک سہیلی نے

---

[1] سوئٹزرلینڈ کا مشہور شہر۔ آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

کرسمس پر اُسے بلایا ہے اور وہ وہاں جارہی ہے۔ لہٰذا میں بھی وہیں آجاؤں۔

الوداع میں نے وطن کو خیرباد کہا۔ محل پر آخری نظر ڈالی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے آپ میں گم ہوگیا۔ مجھے اس محل سے بہت محبت تھی، میں نے زندگی کے بہترین ایام یہاں گزارے تھے۔ آج میں اسے چھوڑ کر جارہا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ میں دوبارہ اسے دیکھ سکوں گا محل کے خیال نے میرے دل میں درد و کرب اور غم کی ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ محل میرے لیے گھر سے زیادہ محبوب تھا۔

میں پورٹ سمتھ پہنچا۔ ۱۲ دسمبر کو صبح دو بجے جہاز روانہ ہوا اور مجھے رودبار انگلستان کے پانی میں لے گیا۔ وطن کی سرزمین مجھ سے چھوٹ رہی تھی۔ اگرچہ ساحل ابھی تک دکھائی دیتا تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وطن چھوڑنا تاج و تخت چھوڑنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ میرا دل طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مگر میں مطمئن تھا کہ میری محبت نے برطانوی سیاست پر فتح حاصل کر لی ہے ؎

خاک ہے سوزِ غمِ عشق کی تاثیر کلیم
دل کا ہر ذرہ اگر برقِ سرِ طور نہ ہو

ولیس سمپسن کے خطوط عشق و محبت کی اس تمام تر طویل داستان میں بعض واقعات کے موقعہ پر جگہ جگہ ولیس کا کردار بھی بے نقاب ہوتا نظر آجاتا ہے مگر ڈیوک آف ونڈسر نے اپنی داستان بیان کرتے وقت ولیس کے افکار و کردار کا واضح ذکر کہیں بھی نہیں کیا۔ اسے جاننے کے لیے ولیس کے بعض خطوط[۱] ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جو اس نے وقتاً فوقتاً مارگریٹ کے نام لکھے۔ آخری دو خطوط ولیس کے دکھے دل کی سچی آواز اور اس کی بہترین انشاپردازی پر دلالت کرتے ہیں۔

---

[۱] یہ خطوط "بڑے آدمیوں کا عشق" سے منقول ہیں۔

(۱)

لندن۔

پیاری مارگریٹ۔

تم نے دریافت کیا ہے کیا واقعی لندن کے شاہی افراد میرے مہمان ہوئے اور کیا واقعی یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میری گرویدہ ہو گئی ہے ——— اگر میری فطرت کو اچھی طرح سمجھ لیتیں تو شک کی گنجائش نہ تھی۔ میرا خیال ہے جو انسان اپنی زندگی کے لمحات کی قدر کرتا ہے اور اپنی عزت نیز دوسروں کے لیے ایثار کی فکر میں رہتا ہے وہ یقیناً اعلیٰ مدارج حاصل کر سکتا ہے، میری نفاست پسندی، خوش اسلوبی اور قوتِ انتخاب کے یہاں چرچے ہو رہے ہیں۔

چند روز ہوئے کہ شاہی خاندان کے اعلیٰ افراد نے میری ضیافت قبول فرمائی اگرچہ میرا مکان مختصر ہے لیکن میں نے اسے سجانے میں کافی ذہانت کا ثبوت دیا۔

نتیجہ یہ ہے کہ ارکانِ شاہی میری اس قدر تعریف کرتے تھے کہ غالباً اس سے پہلے کسی کی نہیں ہوئی ہوگی۔ ان میں سے ایک نے اس قدر اظہارِ گرم جوشی فرمایا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کے بعد ولی عہد نے مجھے مدعو کیا۔ شہزادے کی دلکش گفتگو، بلند خیالات اور خلوص و محبت نے مجھے موہ لیا۔ لطف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ میرے قائل ہیں اب تک چند ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی روحیں فطرت نے ایک ہی وقت میں بنائی تھیں میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ مجھے گوہرِ مقصود مل گیا۔ مجھے کچھ ایسا روحانی سکون نصیب ہوا کہ بیان سے باہر ہے، لیکن خود شہزادے کا خیال اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی میرے بغیر قرار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرے جسم میں ان کی روح سمائی جا رہی ہے۔ دونوں روحیں ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو گئی ہیں کہ ہماری حرکات و سکنات، الفاظ و معنی سب ایک ہی قسم کے ہیں لہٰذا ہر دو جسم

ہیں، لیکن دل و دماغ ایک ——

شہزادے کی بھوری آنکھیں جب محبت میں ڈوبی ہوئی نظروں کو میری طرف سیدھی کرتی ہیں تو میری قوتِ برداشت جواب دے دیتی ہے۔ میں ان کی دلدوز شعاعوں کی تاب نہ لاکر آنکھیں چرا لیتی ہوں —— ظاہر جسم اور مادی حیثیت ہمیں ایک دوسرے سے قریب نہیں کر رہی۔ یہ مجھے اس وقت محسوس ہوتا ہے، جب میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی پس منظر پر غور کرتی ہوں اور ان دو روشندانوں کے ذریعہ دماغ کے بلند محل میں چلی جاتی ہوں، جو شخص بھی ان کی نگاہوں کے سایہ میں پناہ لے کر حقیقت پر غور کرے گا فوراً سمجھ جائیگا کہ یہ آنکھیں بڑی دُور کی خبر لا رہی ہیں، یہ بڑا گہرا سمندر ہیں، تمام کائنات کو اپنے دو ہیروں میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ دو آنکھیں دو جامِ جہاں نما ہیں جن کے اندر تمام پوشیدہ خیالات تک سمٹ آتے ہیں، اور ان کا واحد مرکز میری ہستی ہے۔ ان دو کھڑکیوں میں داخل ہوتے ہی کوئی شخص اپنے آپ کو دوسری دنیا میں محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے پرے جادو کی دنیا اور عام تخیل سے بالا عالم نظر آتا ہے۔ اس کی دنیا اس دنیا سے بالکل نرالی ہے —— اور پھر ہم دونوں بظاہر دو انسان ہیں، ایک دوسرے سے مختلف، ابھی ہماری ابتدا ہے۔

لوگوں کی نظریں مختلف شکوک کے ساتھ ہم پر پڑ رہی ہیں، لیکن مجھے شک ہے کہ یہ داستان ابھی اور طول کھینچے گی، اس لیے کہ دنیا اس معیار اور مقام پر نہیں پہنچ سکتی جہاں ہم ہیں۔ لوگ صحیح طور پر ہماری پرواز میں ساتھ نہیں دے سکتے اور یہ تمھیں معلوم ہے کہ پیچھے رہ جانے والے ہمیشہ بازی لے جانے والوں پر تہمت تراشا کرتے ہیں۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں اور نوابوں کی آرزوؤں پر پانی پھرتا نظر آتا ہے اور خود وہ اپنی بے چینی میں عام برتاؤ سے تجاوز کر گئے ہیں۔ انھیں ہر لمحہ میری محبت میں گذارنے کی خواہش ہے۔ ذیل کے واقعہ سے کچھ اندازہ کر سکو گی۔

میں ایک سنیچر کی صبح ہوائی جہاز سے پیرس اپنا ڈریس تیار کرانے گئی اور ابھی کرسی پر جم کر بھی نہ بیٹھی تھی کہ لندن سے میرے ہوٹل کو فون کیا گیا اور وہاں نہ پاکر درزی کی دکان پر ہی مجھے مخاطب کر لیا گیا۔ لندن سے تنہائی کی شکایت کی گئی اور کہا گیا " کپڑے لے کر سیدھی چلی آؤ "

میں نے یہ بتایا " یہ ناممکن ہے کہ کوئی درزی دس منٹ میں کپڑے تیار کر دے "

لندن سے کہا گیا " لیکن میری رات کیسے کٹے گی؟ "

مَیں نے کہا " جو پرانی تصاویر قلعہ کے ترخانہ سے برآمد ہوئی ہیں، انھیں ٹانکیے " میری اس طویل اور صبر آزما تکلیف کی مخالفت نہیں کی گئی اور اس کے بعد کہا گیا

" لیکن کل صبح کے لیے کیا راستہ ہے۔ کل صبح میں کیا کروں گا؟ "

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا " کیا میں یاد دلا سکتی ہوں کہ آپ مذہب کے محافظ ہیں "

جواب " کیا خوب "

میں نے کہا " آپ کل صبح چرچ کیوں نہ تشریف لے جائیں "

شہنشاہ ہنس دیے۔ میرا مذاق کامیاب رہا۔ دوسرے روز لوگوں نے شہنشاہ کو چرچ میں دیکھا۔ آرچ بشپ جنھوں نے سب سے پہلے ہمارے معاملہ میں آگ بھڑکائی تھی، یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ شہنشاہ جنھوں نے کسی چرچ کا رُخ نہیں کیا ایک اتوار کو صرف میری خاطر تشریف لائے تھے۔

خط بہت طویل ہو گیا، لیکن یہاں کی رنگینی اس سے زیادہ طویل ہے۔ ہماری گرم صحبتوں میں موسم سرما کی برودت بالکل خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

تمھاری مخلص ——— ویلیس سمپسن

(۲)

لندن۔

پیاری مارگریٹ!

ہمارا افسانۂ محبت بہت عام ہوچکا ہے۔ امریکن اور انگلش اخبارات گرم گرم فقرے اور نئی نئی افواہیں تراش رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے قول کے مطابق ہماری محبت دنیا کی تاریخ میں حیرت انگیز رومان اور انقلاب پرور افسانہ ہوگا۔ مجھے بعض دوستوں کی طرف سے اخبارات کے کچھ تراشے موصول ہوئے ہیں۔ وہ اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ایک مستقل کمیٹی بھی کئی برس میں فارغ نہیں ہوسکتی۔

ہمارے افسانے نے جس قدر حیرت انگیز طریقہ سے شہرت اور انقلاب کی صورت اختیار کر لی ہے وہ صرف پریس اور موجودہ سیاست کے پیدا کیے ہوئے ماحول کا نتیجہ ہے۔ پریس نے جس لطف کے ساتھ اس سلسلہ میں تخریبی کوششیں کی ہیں اس کو چھوڑ کر تمھاری دلچسپی کے لیے اقتباسات بھیج رہی ہوں۔

• مسز سمپسن نے اپنی ساحرانہ قوت فسوں ساز وجادو اثری سے پرنس کو مسحور کرلیا ہے۔ اس کی قوت طلسمات جادو کی طاقت سے بھی بڑھ کر ہے وہ جو کچھ ہے اس طرح ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

وہ آسمانی حور ہے ——— زہرہ اور مشتری کی قوتوں سے بڑھ کر، اس کی ساحری لیلےٰ اور شیریں سے بڑھ کر مسحور کن ہے ——— غرض کلوپیٹرا، ڈیانا اور دنیا کی تمام ساحرانہ قوتوں کی مالک مجھے قرار دے دیا گیا ہے۔

اس قسم کے خیالات ہم وطن (امریکن) اخبارات اور مصنفین کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں ——— لیکن دبی زبان سے تعریف کا پہلو لیے ہوئے شکل و شباہت کی نقاشی انگلش پریس نے اس طرح کی ہے کہ اس میں نفرت، حقارت اور پستیٔ فطرت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ جہاں اس مخلوق نے بادشاہ کے کردار کو محفوظ رکھنے کی

کوشش کی ہے، وہاں میرے شمائل وخصائل کی برائی میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ میری آنکھیں، ناک، کان، گردن، چہرہ رخسار، بدن اور قد کی تخریبی نمائش وتنقید میں پوری طرح حصہ لیا ہے اور ایک ایک خط وخال کی موشگافی اس طرح کی گئی ہے۔ گویا صانع فطرت کی تمام چابکدستی اس مخلوق کے قبضۂ قدرت میں آگئی ہے۔ میرے عیب ان کی نظر میں ہنر اور میرے ہنر ان کی نظر میں عیب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عصرِ جدید کی صناعیوں اور خوبیوں کا استعمال میں نہایت نفیس اور دلکش طریقہ سے کرنا جانتی ہوں۔ قدرت نے مجھے نفاستِ خیال اور سادگیٔ مزاج کے ساتھ جدید طرزِ تمدن کی صف اول کا انسان بنایا ہے۔ میں جذبات وخیالات اور روش کے لحاظ سے صحیح طور پر امریکن اور جدت پسند ہوں اور یہی چیز ان لوگوں کے دلوں میں چبھتی ہے۔ میں شام کے وقت ہی میں دس دفعہ لباس تبدیل کر لیتی ہوں اور ہر دفعہ نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہوں، لیکن میں آگے چل کر بتاؤں گی کہ میرے رفیقِ حیات ان امور میں مجھ سے بڑھ کر جدت پسند اور عصرِ جدید کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ صحیح طور پر اسی زمانہ کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے خیالات، رجحانات اور افعال واطوار میں قدامت پسندی کا شائبہ تک نہیں۔ افسوس اس قدر ترقی کے بعد بھی میں لندن کی سوسائٹی کو قدیم رسم ورواج کی بوسیدہ ہڈیوں کی طرف مائل پاتی ہوں۔ ناقابلِ بیان جذبات کے ماتحت یہ لوگ خیال اور افعال کے لحاظ سے دوغلے واقع ہوئے ہیں۔ جدید اور قدیم روش کی آمیزش سے ان لوگوں کے افعال ارادی میں غیر محسوس طریقہ سے دورنگی داخل ہو گئی ہے اور اس بنیادی تذبذب کی بنا پر یہ لوگ ایسے رستے پر چل رہے ہیں جس کے زبان سے قائل نہیں۔

تمھیں یہ خیال ہے کہ بادشاہ کی زندگی بالکل تماشی ہوتی ہے اور اس کا ایک ایک فعل اور ایک ایک لمحہ پبلک کے لیے سبق آموز اور ملک کی نگاہ کا مرکز ہوتا ہے۔ ہر ہر قدم اسے سنبھل کر رکھنا پڑتا ہے اور رسم ورواج اور آئین سلطنت

کے مطابق وہ خود کو نظم و ضبط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔ ہمیشہ اس کے آس پاس مدبر، سیاستدان دان، تجربہ کار سال خوردہ عالموں، فاضلوں اور رئیسوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہر آدمی اس کے سامنے جھکا ہوا مؤدب اور خمیدہ داخل ہوتا ہے۔ پھر ایسے ماحول میں میری پذیرائی کس طرح ہوئی، لیکن یہی پُر لطف بات ہے جس کی نسبت میں اشارہ کرنا چاہتی ہوں۔

بے شک ان کی زندگی بالکل اسی نظم و ضبط اور قدامت کے شکنجوں میں جکڑی گئی تھی۔ انھیں بیس سال کی عمر کے بعد سے اب تک تقریباً چار تقریریں روزانہ کرنا پڑتی ہیں۔ انھیں ایک ایک دن میں پچاس اور کبھی ساٹھ لباس تبدیل کرنا پڑتے ہیں، لیکن آخر انھوں نے اس رسم و رواج کے پرانے مردے کے کفن کو اتار کر رجعت پسند مصاحبوں کو خیرباد کہہ دیا اور وہ جدید ترین خیالات کے طرفدار بھی نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ جدید ترین خیالات کے پُر جوش حامی مصاحب بنائے جاتے ہیں اور ترقی پسند جماعت کے خیالات کے موافق وہ اپنی زندگی ڈھال رہے ہیں۔ مجھ سے اور امریکہ سے چار قدم آگے ان کی جدت پسندی ہے۔ اور قدیم رواج کو انھوں نے گرجا کے تاریک قبرستان میں دفنا دیا ہے۔

میری اس طویل تحریر کے پڑھنے میں ممکن ہے، تمھیں دردِ سر محسوس ہو لیکن میں نے تمھارے شبہات کا صاف اور واضح جواب دینا مناسب خیال کیا۔

تمھاری مخلص ——— ویلس سمپسن

——— (۳) ———

لندن

پیاری مارگریٹ!

تمھارا طویل ظرافت آمیز خط موصول ہوا۔ تم ہمارے مفصل حالات کے لیے بہت بے چین ہو۔ میری پیاری! میں تمھاری خواہش کے موافق تمام حجابات اٹھائے دیتی ہوں۔ اور تمام امور پیش کیے دیتی ہوں۔

بعض اخبارات غیر ذمہ داری کے ساتھ ہمارے معاملے میں بیان دے رہے ہیں اور سازش میں قوم کے بعض اعلیٰ افراد بھی اپنی کم ظرفی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن میں صرف نفسِ مطلب تمہارے سامنے پیش کرتی ہوں۔ تاکہ یہ اضطراب دُور ہو اور صحیح طور پر ہماری نسبت رائے قائم کر سکو۔ مستقبل انسان کے ہاتھ میں ہے، لیکن خود انسان ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ورنہ زمانہ اس کی تخریب کے لیے اپنی تمام ہلاکت سامانیوں کے ساتھ مقابلہ میں آ جاتا ہے، اور مجھے یہی اندیشہ ہے۔

قدیم و جدید لندن میں ۴۳ سالہ شخص جوان نہیں کہلاتا۔ اگرچہ محبت کا کوئی وقت نہیں ہے لیکن جوش اور جوانی کے بے قابو کر دینے والی غالب خواہش سنجیدگی کے ساتھ اس عمر میں عقل کے قبضۂ اختیار میں آ جاتی ہے۔ اور پھر تمہاری رائے سے مجھے بھی اختلاف نہیں، بلکہ ہر بصیرت کا مالک شخص سمجھ سکتا ہے، کہ میرے جسم و چہرہ میں اس قدر جاذبیت نہیں کہ نصف دنیا کے مالک کو اپنا والہ و شیدا بنا لے۔ بڑے بھاری بھر کم اخبارات کی تنقید حقیقت سے دُور اور بالکل پھسپھسی ہے اور پھر گزشتہ بیس سال میں جب سے کہ شہزادے نے مجرد رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد نے انھیں محبت کے جال میں پھانسنے کے لیے سینکڑوں رنگین تیتریاں پیش کیں لیکن شہزادے نے کسی کی طرف نگاہِ التفات نہ فرمائی۔

چند روز کا واقعہ ہے کہ میرے یہاں لندن کی ایک حسین ترین دلربا شہزادی مدعو تھی جو شہزادے کی داہنی جانب بیٹھی تھی اور اس نے اپنی پوری عشوہ فروشی سے شہزادے کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہا۔ یہی نہیں ہوا کہ شہزادے نے اس کی جانب گوشۂ چشم سے بھی نہیں دیکھا بلکہ اس صحبت میں کسی قسم کی دلچسپی کا بھی اظہار نہیں فرمایا۔ ایسے حالات میں ساحرانہ قوتوں کو میری جانب منسوب کرنا یا شہزادے کو "گرفتارِ حسن" قرار دینا کس قدر پست خیالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شہزادے کی طبیعت بالکل انقلاب پسند واقع ہوئی ہے۔ جیسا میں پہلے خط میں بھی لکھ چکی ہوں۔ انھوں نے حال ہی میں ایک زبردست جہاز کے افتتاح پر تقریر کرتے ہوئے کہا "کس قدر حیرت ناک بات ہے۔ ہم یہ زریں کھلونے بنانے کے لیے روپیہ صرف کر سکتے ہیں لیکن بے کس و ناچار غریبوں کی مدد کے لیے روپیہ صرف نہیں کر سکتے۔

وہ براہِ راست غریبوں کی ہمدردی کرتے ہیں اور سیاسی و مصلحت آمیز دفتری کارروائی کی بجائے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے بنفسِ نفیس اس طرف توجہ دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بادشاہ بھی ایک عام انسان ہے اور اسے عوام سے مل کر رہنا چاہیے مصنوعی رسم ورواج کی پابندی فطری لطافتوں سے خالی ہے۔ چنانچہ وہ گھوڑوں کی بگھی کی بجائے موٹر میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور تقریروں میں "ہم" اور "مابدولت" کے بجائے "میں" استعمال کرتے ہیں

——— جہاں انھوں نے قدیم تصنع سے لبریز رواج کو بالائے طاق رکھا، رجعت پسند مصاحبوں کو علیحدہ کر دیا وہاں یہ بھی کیا کہ اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ بھی عام طور سے کر دیا۔ چنانچہ بادشاہی کا بوجھ اٹھاتے ہی انھوں نے جو تقریر کی ہے وہ ان کی فطرت کا آئینہ ہے۔ خصوصاً وہ الفاظ قابلِ غور ہیں جو عوام سے ہمدردی کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ "اگرچہ میں اب بادشاہ کی حیثیت سے بول رہا ہوں، لیکن میں اب بھی وہی روشناس ہمدرد ہوں"

ایسے مستقل اور ترقی پسند صاحبِ دل کو اگر اپنا ہم خیال رفیقِ حیات مل جائے تو وہ یقیناً اس کو اپنے مقصدِ عظیم کی بنا پر ہر ممکن طریقہ سے حاصل کرنا پسند کرے گا۔ چنانچہ وہ مجھ سے کئی دفعہ میری تعریف کے سلسلہ میں مجھے پسند کرنے کے اسباب پر بحث کر چکے ہیں۔ وہ مجھے اکثر میری یہ باتیں یاد دلاتے ہیں۔

جب میں پہلی مرتبہ ان سے ملی تو ہم باغات اور زراعت کے متعلق

مسلسل گفتگو کرتے رہے۔ جب کبھی میں ان سے ملی، بے تکلف اور بے باکانہ بغیر کسی تصنع اور ریاکاری کے۔ میری باتوں میں زہر ملی ہوئی چاشنی اور حقیقت سے دُور چاپلوسی کا کوئی وجود نہ تھا۔

میں نے شاہی زریں لقموں کو جن میں کھانے کا صحیح مزا نہیں ہوتا، واضح طور پر ناپسند کیا۔ اور انگریزی کھانوں کی بے باکی کے ساتھ برائی کی۔ انھیں اپنے کھانے کھلائے اور انھوں نے ان کے تیار کرنے کی معلومات میں بڑی دلچسپی لی

ایک دفعہ ہم پیرس کے مشہور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا

"آپ ایک ہی قسم کے کھانے کھاتے ہیں جو شاہانہ ہوتے ہیں۔ حقیقت میں آپ صحیح مزے سے بالکل بے بہرہ ہیں میرے خیال میں آپ نے کھانے کا اصلی مزا چکھا ہی نہیں"

چنانچہ وہ میرے ساتھ ہوگئے اور ہم نے ایک معمولی ہوٹل میں جاکر کھانے کا لطف لیا۔

پیاری مارگریٹ! میں ان سے نہایت سادگی سے ملتی ہوں اور اس انسانی دنیا کو فرشتوں اور اچھوتوں کی دنیا بنانا نہیں چاہتی۔ تمام غریب دوست اب بھی مجھ سے وابستہ ہیں۔ میں نے شاہی افراد کی خاطر کسی پر دروازہ بند نہیں کیا اور نہ مغرور شہزادیوں کی طرح کسی شام اپنی سہیلیوں کو مطلع کیا کہ میں اعلیٰ حضرت کے ساتھ آج تفریح کے لیے جارہی ہوں۔

بہرکیف تمام دنیا کے مدبر اہل دماغ اپنی چالاکیوں کے ساتھ ایک طرف ہیں اور ہم دو صاف دل ایک طرف، جہاں تک ہوسکتا ہے میں انھیں انتہائی جسارت سے رسوم کہن کے خلاف انقلاب سے روکتی ہوں۔ لیکن وہ بہت زیادہ انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔

میں صاف صاف یہ اعلان کرچکی ہوں کہ اگر بادشاہ کی پوزیشن میں میری

وجہ سے کوئی فرق آتا ہو تو میں علٰحدگی کے لیے تیار ہوں۔ اس طرح کہ پھر میرا تذکرہ بھی نہ آئے لیکن انھیں یہ کہاں پسند! دیکھیے۔ آئندہ حالات کی رفتار کیا رہتی ہے۔ بس اب رخصت!

تمھاری مخلص ——— ولیس سمپسن

——— (۴) ———

لنڈن ۷ دسمبر ۱۹۳۶ء

پیاری مارگریٹ!

ہمارا افسانہ محبت تاریخ کا زریں باب بنتا جا رہا ہے۔ گورنمنٹ اور شہنشاہ میں ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی ہے۔ واقعات کی تیز روی برق سے بھی بازی لے گئی۔ عمیق غار کے کنارے لے جا کر کھڑے کر دیے گئے ہیں، یا صرف تنہا آگے بڑھیں یا میرے ساتھ واپس ہو جائیں ——— آہ شہنشاہ اس وقت تنہا ہیں، بے یار و مددگار۔ آرچ بشپ کے چوغے میں دشمنی کا اہرمن پھنکارے مار رہا ہے اور وزیر اعظم کے لباس میں ایک چٹان ہے پانی میں چھپی ہوئی۔

شہنشاہ کو بتایا گیا ہے کہ وہ کسی ایک کو چھوڑ دیں، یا تخت یا مجھے، آہ انگلینڈ کی مہذب ترین مخلوق کا بادشاہ، مساوات و ترقی کے دیوتاؤں کا سرتاج صرف ایک عورت سے شادی کرنے پر تخت سے دستبردار کیا جا رہا ہے۔

عام انسانوں کے حقوق سے وہ محروم ہے۔ سب کے لیے دنیا کا ترقی یافتہ جدید قانون ہے اور صرف بادشاہ کے لیے ہزاروں برس کا بوسیدہ رواج۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ کوئی قانون شہنشاہ کو شادی سے باز نہیں رکھ سکتا ——— لیکن اس نئی روشنی میں اندھیرا چھا رہا ہے اور افسوس کہ شہنشاہ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑ رہا ہے ——— لوگو! کس قدر حیرت ناک واقعہ ہے۔ کس قدر رحم کے قابل بات ہے۔ کیا آج تک کسی بادشاہ نے ہم مذہب مطلقہ عورت سے

شادی نہیں کی ــــــ کیا کسی بادشاہ کی خانگی زندگی پر حتیٰ کہ شادی کے معاملات میں بھی وزراء کے مشورے کو دخل ہوتا ہے ــــــ افسوس! صد افسوس!

صرف اس بات پر کہ شہنشاہ کا شادی کے معاملہ میں وزراء سے اختلاف ہے، لندن میں طوفانِ عظیم برپا ہے۔ مخلوق ہکا بکا ہے۔ تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ایک کہرام برپا ہے۔ زلزلہ آگیا ہے۔ وائٹ ہاؤس کی اینٹ اینٹ لرز رہی ہے، قیامت کا نمونہ ہے۔ افسوس! افسوس! اور پھر معاملہ صرف یہ ہے کہ شہنشاہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا کے تمام معاملات پسِ پشت ڈال دیے گئے ہیں۔ میرے جواہرات، لباس، سامان، ملازمین کے متعلق اتنی توجہ دی جارہی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کا اہم سے اہم معاملہ خاک ہے ــــــ روس تمام دنیا کو کمیونسٹ بنا سکتا ہے۔ اٹلی زمین کی چھاتی اپنی ٹھوکر سے دہلا سکتا ہے اور حبشہ کی اینٹ سے

اینٹ بجا سکتا ہے، ہٹلر اپنی نوآبادیات کے مطالبہ سے دنیا کو بھونچکا بنائے تو بنا سکتا ہے ــــــ جاپان چین کے پرخچے اڑا سکتا ہے، جنرل فرانکو سپین میں خون کے دریا بہا سکتا ہے ــــــ یہ سب ممکن ہے، لیکن شاہ لندن ایک عورت کو انگلینڈ کی ملکہ نہیں بنا سکتا۔

میں اس سے زائد اور کیا لکھوں کہ یہ تمام طاقتیں محبت کے آگے سرنگوں ہیں۔ یہ سب کچھ چھین سکتے ہیں، لیکن ہماری محبت نہیں چھین سکتے۔

تمھاری مخلص ــــــ ولیس سمپسن

ــــــ (۵) ــــــ

لندن

پیاری مارگریٹ!

وہی ہوا جو ہونا تھا۔ انھوں نے محبت کے مقابلہ میں غرور اور دھوکے سے بھری ہوئی دنیا ــــــ کائنات کی عظیم ترین مسندِ شاہی کو ٹھوکر مار دی

محبت کا مرصع زرنگار تاج ان کے سر پر جگمگا رہا ہے اور قبول عام و بقائے دوام کے نہ کملانے والے پھولوں کا ہار ہمارے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ ہم دنیا کی تاریخ میں محبت کے شاہکار ہیں۔ اور شاعری کی دنیا میں جیتی جاگتی سرمدی نظم!

تمہاری تعریف اور تار کا شکریہ!

تمہاری مخلص ——— ویلس سمپسن

پیٹر ٹاؤن شینڈ
شہزادی مارگریٹ

شہزادی مارگریٹ کا رومان

"سورج مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے مگر مارگریٹ جسے ایک بار دل دے چکی ہے اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی، اور اس کے لیے اسے کوئی بھی قربانی دینی پڑے تو وہ دریغ نہیں کرے گی"

سنسنی | بکنگھم محل کے بند کمرے میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ اور اس کی والدہ کی خفیہ ملاقات ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا، دونوں باہر آئیں۔ ان کے چہرے مغموم نظر آتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں شاہی خاندان کا ہر فرد فکرمند تھا۔ شاہی خاندان کا وقار خطرے میں پڑ گیا تھا۔

اگلے دن اخبارات میں نمایاں خبریں شائع ہوگئیں:

"شاہی خاندان سے جو ہو سکا اس نے کیا، خوبرو عاشق کو ملک سے باہر بھیج دیا گیا حسین شہزادی کو اس کے خاندانی وقار، اس کی ذاتی عظمت اور تخت و تاج کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا۔ کنٹربری کے لاٹ پادری نے اسے متنبہ کیا کہ چرچ اسے کبھی اجازت نہ دے گا کہ وہ ایسے شخص سے شادی کرے جو اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ وزیر اعظم نے اس کے چچا ایڈورڈ ہشتم کی مثال پیش کرتے ہوئے اسے محبت کے افسوسناک نتائج سے خبردار کیا اور آخری تدبیر یہ کی گئی کہ اُسے دُور دراز ملک میں سیر و تفریح اور دورے کی غرض سے بھجوا دیا تاکہ اُس دوران میں وہ اپنے مستقبل کے متعلق حالیہ فیصلے کو بدل کر کوئی اور فیصلہ کرے، مگر یہ سب تدبیریں ناکام رہیں۔ اور شہزادی نے اپنی بہن ملکہ الزبتھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ "سورج مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے مگر مارگریٹ جسے ایک بار دل دے چکی ہے اس کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی اور اس کے لیے اسے کوئی بھی قربانی دینی پڑے تو وہ دریغ نہیں کرے گی۔"

خفیہ مشورے | شاہی خاندان کے بڑوں کی ایک کونسل بیٹھی جس میں ملکہ الزبتھ کے علاوہ کنٹربری کالاٹ پادری اور شہزادہ فلپ بھی موجود تھا۔ قریباً تین گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ملکہ کا خیال تھا کہ چونکہ شہزادی اپنے ارادے سے کسی طرح باز نہیں آرہی اس لیے وہ اپنے طور پر اس شادی کی اجازت دے دے۔ مگر لاٹ پادری اس کے سخت خلاف تھا۔ اس نے مارگریٹ کے چچا ایڈورڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اُسے بھی اسی وجہ سے شادی کی اجازت نہ دی گئی تھی کہ ولیس مطلقہ عورت تھی۔ مسٹر چرچل جس نے ایڈورڈ کو اس کی محبت کے دوران بہت مدد دی تھی۔ اس نے بھی مارگریٹ کی شادی کی مخالفت کی۔

پیٹر | شہزادی جس شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی اس کا نام پیٹر ٹاؤن شینڈ تھا۔ اور شہزادی کے باپ جارج ششم کے پاس اس کے محل میں ملازم تھا۔ وہ رائل ایر فورس میں کپتان تھا۔ جارج ششم نے یکم اگست ۱۹۴۴ء کو اُسے اپنے محل میں مقرر کیا۔ بادشاہ اسے بہت چاہتا تھا اور اُسے "میرا بیٹا" کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھا۔ جب وہ محل میں آیا شہزادی کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ اور بڑھتی تھی۔ چنانچہ اسی وقت سے دونوں کی جان پہچان ہو چکی تھی۔ چونکہ ٹاؤن شینڈ کا بیشتر وقت محل میں گزرتا تھا۔ اس لیے شہزادی اس سے اکثر ملتی رہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہونے لگ گئے تھے۔

ٹاؤن شینڈ کی شادی ہو چکی تھی، اس کی بیوی کا نام روز میری تھا۔ وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ مگر دسمبر ۱۹۵۲ء میں اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ یہ طلاق بدکاری کے الزام میں دی گئی۔ طلاق کے بعد عدالت نے دونوں بچے ماں کے حوالے کر دیئے۔ بعد ازاں اس عورت نے جان ڈی لزلو نام ایک اور شخص سے شادی کر لی۔

ٹاؤن شینڈ جولائی ۱۹۵۳ء تک شاہی گھرانے میں ملازم رہا۔ مارگریٹ اور ٹاؤن شینڈ کی محبت کا آغاز اس وقت ہوا جب ٹاؤن شینڈ نے ابھی اپنی بیوی کو طلاق نہ دی تھی۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور مارگریٹ نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ جب محبت کا انکشاف ہوا تو ٹاؤن شینڈ کو فوراً برسلز (بلجیم) کے برطانوی سفارت خانہ میں بھیج دیا گیا تاکہ مارگریٹ سے اس کی ملاقات ہی نہ ہو سکے۔ اس سے قبل مارگریٹ کی ماں نے مارگریٹ پر

خاصا دباؤ ڈالا کہ وہ ٹاؤن شنیڈ کا خیال چھوڑ دے، کیونکہ اس سے شاہی خاندان کی عزت پر حرف آتا ہے، مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

قانونی جنجھٹ شہزادی کے راستے میں ایک اور بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ قانون کے مطابق اپنی بہن ملکہ الزبتھ سے اجازت لیے بغیر شادی نہ کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ پچیس سال کی ہو چکی تھی اس لیے اب اسے ملکہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ چرچ اُسے اس بات کی اجازت نہ دے سکتا تھا اور چونکہ انگلستان کا تاجدار چرچ کا سربراہ ہوتا ہے، اس لیے ملکہ الزبتھ چرچ کے سربراہ کی حیثیت میں اس شادی کی مخالفت کرنے پر مجبور تھی۔

مارگریٹ کا مسئلہ اس کے چچا ایڈورڈ کے مقابلہ میں قدرے آسان تھا۔ کیونکہ مارگریٹ براہِ راست تخت کی وارث نہ تھی۔ تاہم وہ ٹاؤن شنیڈ سے شادی اُسی صورت میں کر سکتی ہے کہ تخت سے دستبردار ہو جائے۔ اور تمام شاہی مراعات سے ہاتھ دھولے۔ اس صورت میں پارلیمنٹ کو اس کی شادی پر کوئی اعتراض نہ تھا، کیونکہ پھر وہ پرائیویٹ فرد کی حیثیت اختیار کر لیتی تھی۔ پارلیمنٹ نے طے کیا کہ اگر مارگریٹ ایسا کرنا چاہے تو پارلیمنٹ کو اطلاع دے تاکہ ہونے والے اجلاس میں ساری باتیں طے کر لی جائیں۔

شادی کی قیمت تب تخت سے دستبرداری کا بل پیش کیا جائے گا، جسے دونوں ایوان منظور کریں گے۔ اس بل کے رو سے مارگریٹ کو تمام شاہی اختیارات اور حقوق سے محروم کر دیا جائے گا، اور سول لسٹ کے چھ ہزار پاؤنڈ جو اسے دیے جاتے ہیں وہ بھی منسوخ کر دیے جائیں گے (شادی کی صورت میں پندرہ ہزار پونڈ ملتے ہیں) تاجدار کی طویل غیر حاضری کے دوران مارگریٹ کو کونسلر آف سٹیٹ کے جو فرائض انجام دینے ہوتے ہیں ان سے بھی وہ الگ کر دی جائے گی پھر وہ اپنے پسند کے شخص سے شادی کر سکتی ہے۔

یہ شادی چرچ آف انگلینڈ میں نہیں ہونے دی جائے گی۔ نہ ہی مارگریٹ کی بہن ملکہ الزبتھ اس شادی میں شرکت کرے گی۔ یہ انگلستان میں سول میرج کے انداز سے ہو سکے گی اگر چرچ میں ہو تو انگلستان کے باہر کسی چرچ میں ہو سکتی ہے انگلستان میں نہیں۔

شاہی گھرانے پر اثر ڈیوک آف ونڈسر کو جو رومانی حادثہ پیش آیا تھا اور جس کے باعث

وہ تاج و تخت چھوڑ کر ملک بدر ہوگیا۔ اسے ابھی بیس سال ہی گزرے تھے کہ شاہی گھرانے میں یہ دوسرا حادثہ رونما ہوگیا۔ اس حادثے نے شاہی خاندان کو بہت رنج پہنچایا خصوصاً مارگریٹ کی بہن اور مارگریٹ کی ماں اس صدمہ سے بہت رنجیدہ ہوگئیں۔ انھیں مارگریٹ سے بے حد محبت تھی۔ وہ کسی طرح یہ گوارا نہ کر سکتی تھیں کہ مارگریٹ موجودہ زندگی کو چھوڑ کر تکلیفوں میں پڑے مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ مارگریٹ ہر حال میں اپنے محبوب سے شادی کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔

ے دلبستگیٔ زیست کو رسوا نہیں کرتے
ہم مرتے ہیں مرنے کی تمنا نہیں کرتے

پیٹر کی مقبولیت | جس زمانے میں ٹاؤن شنیڈ جارج ششم کے ہاں ملازم تھا۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ کہا "اگر میرا کوئی بیٹا ہو تو میری خواہش ہے کہ وہ ٹاؤن شنیڈ جیسا ہو"۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو وہ بہت محبوب تھا۔ مارگریٹ بادشاہ کے پاس بہت آیا جایا کرتی تھی اور ٹاؤن شنیڈ بھی وہیں ہوتا تھا اس لیے دونوں بہت قریب ہوتے گئے۔ ٹاؤن شنیڈ اور اس کی بیوی ونڈسر پارک کے عقب میں ایک خوشنما فلیٹ میں رہنے لگے۔

دیرینہ رفاقت | ٹاؤن شنیڈ اور اس کی بیوی غریبوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اس لیے کہ ٹاؤن شنیڈ کو اپنے عہدے کی تنخواہ کے علاوہ صرف ایک ہزار پونڈ شاہی خدمات کے عوض میں وظیفہ کے طور پر ملتے تھے۔ اس آمدن میں وہ گزارا کر لیتے تھے، مگر ٹھاٹھ سے زندگی بسر نہ کر سکتے تھے۔ جب ان کا دوسرا بچہ پیدا ہوا تو جارج ششم خود اس بچے کا روحانی باپ[1] بن گیا۔ اس کے بعد بادشاہ اور ملکہ کبھی کبھی ٹاؤن شنیڈ کے ہاں بھی آتے۔ مارگریٹ بھی اپنی بہن کے ساتھ کبھی وہاں آتی۔ ملکہ ٹاؤن شنیڈ کی بیوی روزمیری کے ساتھ باتیں کیا کرتی اور مارگریٹ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتی۔ اس وقت وہ جوان ہو چکی تھی۔ جب کبھی بادشاہ اور ملکہ یا شاہی خاندان کا کوئی اور گروہ باہر دورے پر جاتا تو ٹاؤن شنیڈ بھی ان کے ہمراہ جاتا اور کئی کئی دن

---

[1] انگریزی دستور کے مطابق کسی کے ہاں بچہ پیدا ہو تو احباب یا عزیزوں میں سے کوئی شخص اس کا روحانی باپ بننے کی پیشکش کرتا ہے۔ یہ دستور مدت سے چلا آتا ہے۔

باہر گزرتے۔ اس دورے میں کبھی کبھی مارگریٹ بھی شریک ہوتی۔ اور اکثر دیکھا گیا کہ ٹاؤن شینڈ مارگریٹ کی خدمت کرنے میں اوروں کی نسبت زیادہ دلچسپی لیتا۔ وہ فرصت کے وقت مارگریٹ کے ساتھ کھیلا بھی کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب شاہی خاندان جنوبی افریقہ کے دورے پر گیا تو ٹاؤن شینڈ بھی ساتھ تھا اور ساڑھے تین ماہ تک اس دورے میں ان کے ساتھ شریک رہا۔ اس موقعہ پر ایک دفعہ بادشاہ نے اس سے یہ بھی کہا "پیٹر۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکوں گا؟" ادھر ونڈسر پارک میں پیٹر کی بیوی روز میری بھی یہ سوچ رہی تھی کہ میں پیٹر کے بغیر کیسے دن گزاروں گی۔

روحانی قرب ۱۹۵۰ء میں جب جارج ششم بیمار پڑا اور روز بروز کمزور ہوتا گیا تو ٹاؤن شینڈ بھی ہر وقت اس کے پاس رہنے لگا۔ کسی وقت بھی اس سے جدا نہ ہوتا۔ اب ٹاؤن شینڈ شاہی گھرانے کا انچارج تھا۔ اور سارا کام اسی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ جب بادشاہ کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی تو ٹاؤن شینڈ اور مارگریٹ کے سوا اور کوئی نہ تھا جو ہر وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتا۔ یہی دونوں اس کی دیکھ بھال میں لگے رہتے۔

۱۹۵۲ء میں بادشاہ مرگیا۔ اس کے بعد مارگریٹ اور ٹاؤن شینڈ کے تعلقات رنگ لائے اور دونوں میں گہری دوستی پیدا ہوگئی جس نے اس محبت کی شکل اختیار کرلی جو اب شاہی گھرانے اور حکومت کے علاوہ عام لوگوں کی بھی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔

مخالفت کا طوفان مارگریٹ کے ارادوں نے برطانوی کابینہ کو بھی پریشان کر دیا۔ انتھنی ایڈن کی کابینہ کے وزراء میں اس مسئلہ پر اختلاف رونما ہوگیا۔ ایڈن خود اس معاملہ میں غیر جانبدار رہا۔ شاید اس لیے کہ اس نے اپنی پہلی بیوی بیٹرس بلاکٹ کو جون ۱۹۵۰ء میں طلاق دے دی تھی اور اگست ۱۹۵۲ء میں لندن کے ایک رجسٹری آفس میں مسٹر چرچل کی بھتیجی کی لڑکی کلیریسا سے شادی کرلی تھی مگر رابرٹ سسل، مارکوئیس آف سالسبری نے جس کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی اور جو ایڈن کا گہرا دوست تھا اور بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اس نے ملکہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ چرچ اور مذہب کی محافظ ہے، اس لیے اسے اس شادی کی اجازت نہ دینی چاہیے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر پارلیمنٹ نے رائل میرج ایکٹ میں کوئی ایسی ترمیم کی

چاہی جس سے مارگریٹ کو اس کے عزائم میں مدد مل سکتی ہو، تو وہ کابینہ سے الگ ہو جائے گا سالسبری کے اس رویہ کے باعث ایڈن بھی خاموش رہا۔ اگر وہ درپردہ مارگریٹ کے حق میں بھی تھا تو اب وہ اس شادی کی حمایت میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اُدھر چرچ آف انگلینڈ کے سرکردہ پادریوں نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ یہ شادی مذہب کے خلاف ہے لہٰذا اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

جرم کا خوف مارگریٹ اس تمام صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھی۔ اور اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اگر اس نے اپنے ارادے کی تکمیل کرنا چاہی تو سارا ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا۔ مذہبی حلقے اس کے درپے ہو جائیں گے۔ شاہی خاندان میں بھی پھوٹ پڑ جائے گی۔ شاہی وقار پر زبردست دھبہ لگے گا اس کی بہن اور ماں کو بھی صدمہ پہنچے گا۔ کابینہ اس کی سخت مخالفت کرے گی۔ اور عین ممکن ہے کہ حکومت کے معاملات پر سخت بُرا اثر پڑے چنانچہ وہ اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ ~

ہوائے درد کچھ تو ہی خبر لے — چراغِ شوق ہے مدھم ہمارا

واہ ری دنیا وہ ونڈسر محل میں گئی تاکہ اپنی بہن کے پاس کچھ عرصہ گزارے۔ اس اثنا میں دونوں کے درمیان یہی مسئلہ زیرِ غور رہا۔ الزبتھ اب تک شادی کے حق میں تھی مگر اب تازہ حالات کے تحت وہ بھی محتاط ہو گئی۔ اس نے مارگریٹ کو خبردار کیا کہ حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ غلط قسم کی افواہیں پھیلتی جا رہی ہیں لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ تم اپنے فیصلے کا جلد از جلد اعلان کر دو۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اگر اس نے ٹاؤن سنیڈ سے شادی کرنے کا خیال نہ چھوڑا تو ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔

چند دنوں کے بعد نومبر ۱۹۵۵ء میں مارگریٹ کا اعلان اخبارات میں شائع ہو گیا:

"میں نے گروپ کیپٹن پیٹر ٹاؤن سنیڈ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے...

... چرچ کی عزت اور سلطنت کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کرنے کے بعد میں نے اپنے فرض کی انجام دہی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

~ مجھ کو منظور نہ تھا دامِ وفا پھیلانا — مجھ کو اس جرم کی سنگینی سے خوف آتا تھا

(تیسرا باب)

تاریخ کے مختصر رومان!

(ا) بادشاہ، بیگمات اور شہزادیاں

۱ - اشوک اعظم اور مالادیکا

۲ - کیخسرو اعظم کا رومان

۳ - پرتھوی راج اور سنجوگتا

۴ - باجی راؤ اول کا معاشقہ

۵ - ملکہ میری کے معاشقے

۶ - ہنری ہشتم کا سودائے عشق

۷ - ملکہ روس کے رومان

۸ - ملکہ انٹونٹ اور لوئیس شاہ فرانس

۹ - امیر فیصل کا رومان

(ب) - ڈکٹیٹر، حاکم اور دوسرے مشاہیر

۱ - حجاج کا عشق

۲ - لوئی پاسچر کا رومان

۳ - لارڈ نسلر کا رومان

۴ - گراہم بیل کا رومان

۵ - ابراہام لنکن کا رومان

۶ - لینن کا رومان

۷ - کارل مارکس کا رومان

۸ - چیانگ کائی شیک کا رومان

اشوک اعظم اور مالادیکا

اشوک اعظم ہندوستان کا نہایت طاقتور اور مشہور حکمران گزرا ہے۔ ۲۶۸ ق م میں تخت نشین ہوا۔ ہمالیہ سے مدراس تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے بدھ مذہب اختیار کیا اور اس کی اشاعت کے لیے بہت کچھ کیا۔ ابتدا میں فتوحات کے شوق نے اُسے متعدد جنگوں سے ہمکنار کیا بعد ازاں جب بدھ مذہب اختیار کیا تو جنگوں سے نفرت ہو گئی اور امن کی زندگی پسند کر لی۔ دنیا کے مختلف حصوں میں قریباً ۳۵ نادر اور دلچسپ تحریریں اب تک موجود ہیں جو پتھر کے عظیم الشان ستونوں یا چٹانوں پر کندہ ہیں اور ان میں بدھ مت کے اصول اور اس کی تعلیم بتائی گئی ہے۔ یہ اشوک کے زمانہ کی ہیں۔

دریائے مہاندی اور گوداوری کے بیچ میں کلنگ کا علاقہ ہے۔ اشوک نے ۲۶۱ ق م میں اس علاقے پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ یہ جنگ اتنی شدید تھی کہ ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اترے۔ چنانچہ اشوک کے دل کو اتنا صدمہ پہنچا کہ کچھ دنوں بعد بدھ مت اختیار کر لیا کیونکہ اس مذہب کے مطابق جنگ کو برا سمجھا جاتا ہے۔

جب کلنگ فتح ہو گیا تو وہاں کی شہزادی مالادیکا تحفے تحائف لے کر اشوک کے پاس اس کے دارالسلطنت پاٹلی پتر میں آئی، جو آجکل پٹنہ کہلاتا ہے۔ اشوک نے بڑی عزت سے اس کا استقبال کیا اور کئی روز تک مہمان رکھا۔ خوب آؤ بھگت کی۔ شہزادی اشوک پر فریفتہ ہو گئی اشوک بھی اس کے تیرِ نگاہ سے گھائل ہو چکا تھا۔ چنانچہ محبت بڑھتی گئی۔ بالآخر اشوک نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی اور اپنی ملکہ بنانا چاہا مگر مالادیکا نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنا سر اشوک کے قدموں میں رکھ دیا اور روتے ہوئے کہا میں اس قابل نہیں کہ ملکہ کہلاؤں۔ میرا باپ مارا گیا۔ اس کی سلطنت جاتی رہی۔ اب میرے لیے اس دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی میں اپنی عمر جوگن بن کر گزار دوں گی۔

بدقسمت شہزادی روتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی۔ بہترین لباس جو اس نے پہن رکھا

تھا اتار دیا اور جوگن کا لباس پہن کر جنگلوں کو سدھاری۔ ایسی گئی کہ پھر اس کا سراغ نہ مل سکا۔
بڑھاپے میں اشوک ایک اور نوجوان دوشیزہ پر فریفتہ ہوگیا، چنانچہ اس سے شادی کر لی یہ بڑی مکار اور بدطینت عورت تھی۔ اسے اشوک کے نوجوان بیٹے سے محبت ہوگئی مگر وہ نہایت پارسا نوجوان تھا۔ اس نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اس عورت نے اپنے سوتیلے بیٹے سے اس کا یوں انتقام لیا کہ اس پر تہمت لگائی کہ اس نے مجھ سے زبردستی بداخلاقی کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اشوک نے اپنی ملکہ کی بات پر یقین کرتے ہوئے مروجہ قانون کے مطابق بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں۔ بعدازاں جب حقیقت ظاہر ہوئی تو اشوک کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ اسی غم سے بیمار ہوکر مر گیا۔

کیخسرو اعظم کا رومان

کیخسرو ایران کا بڑا پُرشکوہ اور نیک دل شہنشاہ گزرا ہے۔ اس کی نیک سیرتی کے کئی واقعات تاریخوں میں آتے ہیں۔ اس کے زمانہ میں سلطنتِ اشوریہ کے شہر شوشان پر ابراداتوس کی حکومت تھی۔ اس کی ملکہ کا نام پانتھیا تھا۔ وہ نہایت حسین وجمیل تھی۔ اسے ایشیا کی خوبصورت ترین عورت کہا جاتا تھا۔ خدا نے حسن کے ساتھ بہادری، وفاداری، رحم، عدل و انصاف اور پاک دامنی کے زیور سے اُسے آراستہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابراداتوس اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ملکہ اس کے دل پر حکمرانی کرتی تھی، ملکہ بھی شوہر کے حق میں بہت وفادار ثابت ہوئی اور اُسے دل وجان سے چاہتی تھی۔

اتفاق سے ایرانیوں اور شوشانیوں کے درمیان جنگ کی ٹھن گئی۔ کیخسرو اعظم نے ایک بہت بڑا لشکر شوشان کو سر کرنے کے لیے بھیجا۔ بدقسمتی سے ابراداتوس دارالسلطنت میں موجود نہ تھا۔ اس کی غیرحاضری میں ایرانی لشکر نے اچانک شہر پر حملہ کر دیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ ملکہ خود ہتھیار سجا کر میدانِ جنگ میں آئی اور مردانہ وار لڑی مگر قسمت میں شکست لکھی تھی۔ ایرانی فتحیاب ہوئے۔ بہت سے لوگ قیدی بنا لیے گئے۔ ملکہ پانتھیا بھی گرفتار ہو گئی اور کیخسرو کے حضور میں پیش کی گئی۔

پانتھیا کے بےنظیر حسن سے کون واقف نہ تھا۔ سارا ایران اُسے جانتا تھا۔ جب وہ قید ہو کر آئی تو ملک بھر میں اس کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ بیگمات اور شہزادیاں اُسے دیکھنے کے لیے آئیں۔ دستور کے مطابق جب قیدی عورتوں کی تقسیم عمل میں لائی گئی تو سب کی یہ خواہش تھی کہ پانتھیا کو بادشاہ اپنے لیے قبول کرے۔ مگر بادشاہ ان باتوں سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا۔ اس نے پانتھیا کو اپنے حرم میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ پانتھیا بہت مغموم اور اداس تھی۔ بادشاہ نے جان لیا کہ اُسے شوہر سے جدا ہونے کا غم ہے۔ پھر یہ کہ وہ سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ وہ اُسے اپنے پاس رکھنے یا کسی اور کے سپرد کرنے کی بجائے اُسے واپس اسکے شوہر کے

پاس بھجوا دے ۔ مگر ابھی ایسا کرنے کا وقت نہ تھا، اس لیے کہ فوج نے تازہ تازہ فتح حاصل کی تھی اور کوئی نہ چاہتا تھا کہ شوشانیوں کا کوئی قیدی انھیں واپس کیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے اُسے اپنے ایک مخلص، وفادار اور نیک ملازم اور معتمد خصوصی کے سپرد کیا کہ اُسے امانت کے طور پر اپنے ہاں رکھے ۔ اس معتمد کا نام اراسپس تھا۔

پانتھیا اراسپس کے ہاں رہنے لگی۔ اسے یہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے مگر اراسپس نے اُسے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا۔ اراسپس نیک شخص تھا۔ اس نے بادشاہ کی سپرد کردہ امانت کو بڑی احتیاط سے رکھا۔ مگر بالآخر اس برق وش کے حسن نے اراسپس کو بھی متزلزل کر دیا۔ اور اس نے اپنی خواہش کا اس پر اظہار کیا۔ پانتھیا نے غصے میں آکر اُسے بُرا بھلا کہا اور صاف کہہ دیا کہ وہ بادشاہ سے شکایت کرے گی ۔ اراسپس اپنی حرکت پر سخت نادم ہوا۔ مگر پانتھیا نے اپنی عزت کو خطرہ میں خیال کرتے ہوئے اُسی دن اراسپس کا گھر چھوڑ دیا اور سیدھی کیخسرو کے دربار میں چلی آئی۔

اس وقت دربار لگا تھا۔ بادشاہ اور سب درباری موجود تھے ۔ پانتھیا کی اچانک آمد سے وہ سب حیران رہ گئے۔ بادشاہ جان گیا کہ ضرور کوئی وجہ ہے۔ پانتھیا نے آتے ہی بادشاہ کو سلام کیا اور اراسپس کے متعلق شکایت کی۔ بادشاہ نے اسی وقت اراسپس کو بلایا، سخت سست کہا اور اُسے دارالسلطنت سے باہر کسی دور دراز مقام پر مقرر کر دیا ۔

اب پانتھیا کیخسرو کے محل میں رہنے لگی۔ کیخسرو اس کا بہت خیال رکھتا۔ ابھی تک اس نے پانتھیا کے متعلق کسی غلط خیال کو دل میں جگہ نہ دی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی نظروں سے دُور اس کے معتمد کے ہاں رہتی تھی، مگر جب سے وہ محل میں آئی تھی اور پانتھیا کو اکثر اُسے دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس سے متاثر ہونے لگا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد کیخسرو اس کی طرف مائل ہو گیا اور بالآخر ایک دن اس سے کہہ ہی دیا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پانتھیا کو بادشاہ کی یہ بات ناگوار گزری اس نے صاف کہہ دیا کہ میرا شوہر زندہ ہے میں اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ نے اس کی منت سماجت کی مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہی ۔

اس نے بے خوف و خطر کہہ دیا کہ میری جان چلی جائے مگر میں کسی سے بھی نکاح نہیں کروں گی۔ اور نہ ہی اپنے دامنِ عفت پر حرف آنے دوں گی۔ بادشاہ اس کی بات سُن کر حیران رہ گیا، مگر بڑے دبدبے اور شان و شکوہ کا مالک تھا۔ فوراً خیال گزرا کہ پانتھیا مفتوح قوم سے تعلق رکھتی ہے پھر یہ کہ وہ میری قید میں ہے۔ اس کے باوجود میں نے اُسے شہزادیوں جیسے حقوق دے رکھے ہیں۔ پھر اُسے میرا احسان مند ہونا چاہیے اور میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے غصہ آگیا اور گرج کر بولا "آج سے ایک ہفتہ کے اندر اندر تم میری بیوی بن جاؤ گی۔"

ادھر کیخسرو نے پانتھیا سے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ادھر قدرت اپنا انتقام لینے کو اتر آئی۔ جب ابراداتوس کو پتہ چلا کہ اس کی غیر حاضری میں اس کا علاقہ ایرانیوں نے تاراج کر دیا ہے اور اس کی ملکہ کو لے گئے ہیں تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ملکہ کے واقعہ نے اس کے دل میں انتقام کی آگ لگادی۔ جس بیوی سے وہ تھوڑی دیر کی جدائی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اب ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ ملکہ کو حاصل کر کے رہے گا یا جان دے دے گا۔ اور اس کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ ایرانیوں پر دھاوا بول دے اور ملکہ کو ان کے قبضہ سے نجات دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

اس نے زبردست لشکر تیار کیا اور کیخسرو کے ملک پر حملہ بول دیا۔ ادھر شادی کا دن آ پہنچا ادھر شوشانیوں کے لشکر نے ایران کے دارالسلطنت کا محاصرہ کر لیا۔ کیخسرو کو ابراداتوس کے حملہ کی خبر ملی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ فوراً سب کام چھوڑ کر مقابلہ کو نکلا۔ شادی کا سلسلہ دھرا رہ گیا۔

گھمسان کا رن پڑا۔ شوشانیوں کی طاقت تو بہت تھی، مگر ایران کے شہنشاہ کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتے تھے۔ ابراداتوس محض جوشِ انتقام میں ایرانیوں پر چڑھ آیا تھا۔ تاہم وہ بڑی بے جگری سے لڑا۔ پانتھیا کو جب علم ہوا کہ اس کا شوہر آ پہنچا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح بھاگ کر شوشانیوں کی فوج میں جا پہنچی اور شوہر کے دوش بدوش لڑنے لگے۔ ادھر کیخسرو بھی اپنی فوج کے ساتھ لڑائی میں شریک تھا۔ دوران جنگ ابراداتوس اور کیخسرو کا سامنا ہو گیا۔ کیخسرو کی تلوار اس کی گردن پر پڑی۔ ابراداتوس اور اس کی محبوب ملکہ پانتھیا زمین پر تڑپتی ہوئی لاشیں

تھیں۔

کیخسرو کی آنکھیں اس وقت کھلیں، جب اُسے پتہ چلا کہ اُس نے پانتھیا کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کر دیا۔ اس کے دل پر زبردست چوٹ لگی۔ وہ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے لگا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کی تھی اور خود ہی اپنی محبت کو دفن بھی کر دیا تھا۔ اس جنگ میں میدان اس کے ہاتھ رہا، مگر پانتھیا ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے چلی گئی۔

پرتھوی راج اور سنجوگتا

ہندوستان پر محمد غوری کے حملہ کے وقت پرتھوی راج اجمیر اور دہلی کا راجہ تھا جو عام طور پر رائے پتھورا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اور اُسے "فخر راجپوت" بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت بہادر اور قابل حکمران تھا۔[1] شمالی ہند کے راجاؤں میں سب سے بڑا راجہ سمجھا جاتا تھا اور تمام دوسرے راجہ اس سے ڈرتے تھے۔ البتہ قنوج کا راجہ جے چند جو پرتھوی راج کا خالہ زاد بھائی بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا مخالف تھا اور دونوں میں سخت دشمنی چلی آتی تھی۔

جے چند کی حسین و جمیل بیٹی کا نام سنجوگتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کا باپ پرتھوی راج سے سخت عداوت رکھتا ہے اور اس کی عداوت کی وجہ محض حسد اور رقابت تھی۔ ورنہ پرتھوی راج کے بہادرانہ کاموں کی شہرت سن رکھی تھی۔ اگرچہ اُس نے اُسے دیکھا نہ تھا مگر وہ اچھے اوصاف ہی کے باعث اس سے محبت کرنے لگ گئی تھی۔ پھر جب اُسے پرتھوی راج کو دیکھنے کا موقعہ ملا تو وہ اس کے خوبصورت چہرے اور مضبوط جسم کو دیکھ کر اور زیادہ گرویدہ ہو گئی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ پرتھوی راج کے عشق میں بے تاب ہو گئی۔ مگر مجبور تھی۔ اپنے باپ کے دشمن

---

[1] مسلمانوں کو ہندوستان میں جتنے حریفوں سے واسطہ پڑا تھا ان میں پرتھوی راج سب سے مضبوط حریف تھا۔ چنانچہ ۱۱۹۱ء میں جب محمد غوری اور پرتھوی راج کا ترائن کے میدان میں آمنا سامنا ہوا تو پرتھوی راج دو لاکھ سپاہی اور تین ہزار جنگی ہاتھی لے کر مقابلہ پر آیا۔ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے راجے پرتھوی راج کے ساتھ تھے۔ راجپوتوں نے محمد غوری کی صفوں کو درہم برہم کر دیا اور اُسے زبردست شکست دی۔ خود محمد غوری گرتے گرتے بال بال بچا۔ محمد غوری نے اس شکست کا بدلہ اُسی سال اسی میدان میں لیا اور ایک لاکھ بیس ہزار کی جمعیت سے دوبارہ پرتھوی راج پر حملہ آور ہوا۔ پرتھوی راج کے ساتھ تین لاکھ سپاہی اور تین ہزار جنگی ہاتھی تھے مگر اس مرتبہ پرتھوی راج کو بری طرح شکست ہوئی۔ ہزاروں راجپوت مارے گئے۔ ہزاروں قید ہوئے پرتھوی راج بھی گرفتار ہو گیا اور قتل ہوا۔

سے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ پھر اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ شاید پرتھوی راج کو نہیں پا سکتی اور اسی طرح اس کے غم میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔

باپ کے ڈر سے وہ اپنے دل کی اندرونی کیفیت کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی، مگر محبت چھپائے نہیں چھپتی۔ ہوتے ہوتے یہ بات پرتھوی راج تک پہنچ گئی۔ پرتھوی راج کے دل پر سنجوگتا کے ان جذبات کا گہرا اثر ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے دشمن کی بیٹی اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے لیے ہر دم بے قرار رہتی ہے تو اسے سنجوگتا کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ وہ خود بہادر تھا۔ راجپوتوں کی غیرت و حمیت اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے سوچا میرا فرض ہے کہ ایک مظلوم لڑکی جو مجھ سے محبت کرتی ہے میں اس کی پوری پوری مدد کروں اور اس کی محبت کا حق ادا کروں۔ چنانچہ اس نے کرناٹکی نام ایک خادمہ کے ذریعہ سنجوگتا کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ کرناٹکی سنجوگتا کے ہاں ملازم تھی۔ وہ سنجوگتا اور پرتھوی راج کی محبت کی راہ میں نامہ و پیام اور ملاقات کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ کبھی کبھی پرتھوی راج اور سنجوگتا کی خفیہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ پرتھوی راج نے سنجوگتا سے عہد کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے اپنا کر رہے گا۔ ادھر سنجوگتا نے بھی پرتھوی راج کے قدموں میں زندگی گزارنے کی قسم کھائی۔

بالآخر وہ وقت آ گیا، جب جے چند نے سنجوگتا کو بیاہنے کا بندوبست کیا۔ دستور کے مطابق سوئمبر[1] کی رسم ادا ہونی تھی۔ جے چند کے محل کو بڑے شاندار طریقہ پر سجایا گیا۔ دور و نزدیک کے تمام راجے اور راجکمار مدعو کیے گئے۔ پرتھوی راج جے چند کا دشمن تھا اس لیے وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کے سوئمبر میں اُسے بھی دعوت دے۔ چنانچہ پرتھوی راج کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اسے ذلیل کرنے کے لیے اس کا بت بنا کر دربان کے طور پر محل کے دروازہ پر رکھ دیا گیا۔ سنجوگتا زرق برق لباس پہنے حاضر ہوئی۔ تمام راجوں اور راجکماروں کی آنکھیں اس کے

---

[1] اس زمانے میں ہندوؤں میں شادی کا یہ دستور تھا کہ مختلف لوگوں کو مدعو کیا جاتا۔ جس لڑکی کو بیاہنا مقصود ہوتا اُس کے ہاتھ میں ایک مالا دے دی جاتی وہ حاضرین میں سے جسے پسند کرتی۔ مالا اس کے گلے میں ڈال دیتی اور وہی اس کا شوہر سمجھا جاتا۔

قیامت خیز حسن کے سامنے خیرہ ہوگئیں۔ سب کے دل دھڑکنے لگے۔ پھولوں کی مالا سنجوگتا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی حاضرین محفل کے پاس سے گزرتی جا رہی تھی۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ مالا اُس کے گلے میں ڈالی جائے۔ سنجوگتا باری باری سے ہر ایک کے پاس سے گزری مگر مالا اسی طرح اس کے ہاتھ میں رہی۔ پھر اچانک اس نے محل کے دروازے کا رُخ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے پرتھوی راج کے بت کے پاس جا پہنچی۔

جے چند گھبرا اٹھا وہ دوڑ کر سنجوگتا کے قریب گیا۔ اُسے کچھ شبہ سا ہو گیا تھا۔ اپنی بے عزتی کے خوف سے اس نے مالا اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہی مگر پیشتر اس کے کہ جے چند ہاتھ بڑھاتا سنجوگتا نے مالا بت کے گلے میں ڈال دی۔

اُسی وقت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک سوار سنجوگتا کے قریب آکر رکا۔ ایک غیر معمولی وجیہہ اور طاقت ور شخص گھوڑے پر سے کودا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سنجوگتا کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا یا وہ جا نظروں سے غائب ہوگیا —————— یہ پرتھوی راج تھا ؎

وفا کے عہد سے دل مطمئن کہاں ہو گا
وفا کا عہد نبھاؤ تو کوئی بات بنے

باجی راؤ اوّل کا معاشقہ

ہندوستان کے مرہٹہ پیشواؤں میں باجی راؤ اوّل سب سے قابل اور مدبر حکمران تھا جس نے مرہٹہ سرداروں میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس نے دہلی کے مغل شہنشاہ کو شکست دے کے مرہٹوں کے اقتدار کو مضبوط کیا، بیس سال تک پیشوا رہا۔ مگر زندگی کے آخری سال بڑی مصیبت اور پریشانی کے عالم میں گزارے۔ اور بڑی المناک موت مرا۔ اس کے اس دردناک انجام کا باعث اس کی محبوبہ مستانی تھی۔ مستانی کے لیے پیشوا نے تمام عزیزوں اور سلطنت کے سرداروں کی مخالفت مول لی، سلطنت سے بھی محروم ہوا، نظر بندی کے دن گزارے مگر مستانی کی محبت آخر دم تک اس کے دل سے نہ گئی۔ مستانی نے بھی پیشوا کے لیے اپنی جان کی قربانی دی۔

باجی راؤ، بالاجی وشواناتھ[1] کا بیٹا تھا۔ جس نے ہندوستان میں مرہٹوں کی مضبوط حکومت قائم کی۔ اس کے بیٹے باجی راؤ نے باپ کی چھوڑی ہوئی سلطنت کو اور زیادہ وسیع اور مستحکم کیا۔ اس نے دہلی پر چڑھائی کی۔ دہلی کا بادشاہ بہت کمزور تھا اس نے نظام الملک سے مدد مانگی۔ نظام الملک نے بادشاہ کا ساتھ دیا مگر اس کے باوجود مرہٹوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے صلح کر لی اور ۱۷۳۶ء میں سرونج کے معاہدے کی رو سے مالوہ، چمبل اور نربدا کا درمیانی علاقہ مرہٹوں کو مل گیا شہنشاہ نے مرہٹوں کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔ باجی راؤ نے پرتگالیوں سے بسین کا قلعہ بھی لے لیا۔

---

[1] بالاجی وشواناتھ نے شہنشاہ دہلی سے مرہٹوں کے لیے بہت حقوق حاصل کیے۔ سید برادران نے اس کی بہت مدد کی اور اسے یہ حق دلایا کہ وہ دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کر سکتا ہے۔ سیوا جی مرہٹہ نے مغلوں کا جو علاقہ فتح کیا تھا، شہنشاہ دہلی نے اس سارے علاقے پر بالاجی وشواناتھ کا قبضہ [illegible] گیا گویا ہندوستان میں مرہٹوں کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ اس نے مال کا پیچیدہ نظام قائم کیا اور فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ اسی نے پیشوا کا عہدہ اپنے خاندان میں موروثی قرار دیا۔

باجی راؤ اپنے ملکی کارناموں کے طفیل لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ امراء اور افسر بھی اس سے خوش تھے۔ دوسرے علاقوں کے راجا اور حکمران بھی اس کی عزت کرتے تھے مگر جب سے اس نے مستانی کی محبت کا دم بھرنا شروع کیا تھا اور اُسے اپنے محل میں لے آیا تھا۔ تمام لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے اور اسے گدی سے اتارنے کے لیے بھی تیار ہو چکے تھے۔

مستانی نہایت خوبصورت اور خوش خصال عورت تھی مگر ادنیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق وہ ایک بیسوا کی لڑکی تھی جسے پیشوا نے اتفاقاً کہیں دیکھ لیا اور دل دے بیٹھا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہ بندھیل کھنڈ کے راجہ کی ناجائز بیٹی تھی جو راجہ نے خود باجی راؤ کو پیش کی تھی۔[1]

باجی ۱۷۲۰ء میں بائیس سال کی عمر میں پیشوا کی گدی پر بیٹھا، اس کے چار پانچ سال بعد اسے مستانی سے واسطہ پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ مستانی چونکہ ادنیٰ خاندان سے ہے۔ اس لیے اگر اس نے اس سے شادی کی خواہش کی تو اس کے عزیز و اقارب اس کی اجازت نہ دیں گے بلکہ وہ پیشوا کے خلاف ہو جائیں گے پھر دوسرے لوگ بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ چنانچہ اس نے کچھ مدت تک شادی کے بغیر اسے اپنے پاس رکھا مگر پوشیدہ طور سے۔ پھر اُسے محل میں لے آیا۔ اس پر لوگ بگڑ گئے۔

باجی راؤ کی شادی اپنے گھرانے کی ایک عورت کاشی بائی سے ہو چکی تھی۔ کاشی بائی بہت نیک خصلت اور رحم دل تھی۔ چنانچہ جب مستانی محل میں لائی گئی تو کاشی بائی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ یہ ضرور ہے کہ دل ہی دل میں ناخوش ہوگی مگر اس نے اپنے شوہر پر ناراضگی کا اظہار کبھی نہ کیا بلکہ وہ مستانی کی عزت کرتی تھی، مگر دوسرے رشتہ دار یہ برداشت نہ کر سکے۔ اب باجی راؤ نے بھی محبت سے مجبور ہو کر مخالفوں کے ساتھ سختی کا سلوک کرنا شروع کر دیا اور مستانی کے لیے پونا کے قریب ایک الگ محل بنا کر اسے اس میں رکھا۔ جب کبھی باہر جاتا مستانی کو ساتھ لے جاتا۔ بالآخر اسکے رشتہ داروں نے غضبناک ہو کر سازش کی اور مستانی کو پونہ میں نظر بند کر دیا۔ باجی راؤ کی

---

[1] بندھیل کھنڈ کے راجہ نے باجی راؤ کو ایک جاگیر بخشی تھی، جو مستانی کی اولاد کے لیے وقف رہی اور مستانی کی اولاد کو بعد ازاں "نواب بندا" کہا جانے لگا۔

مخالفت اتنی زیادہ تھی کہ وہ مستانی کو ترک کر دینے پر مجبور نظر آنے لگا۔ مگر اتفاق سے مستانی بھاگ کر ایک دن اس کے پاس آگئی۔ اور اس پر ایسا اثر ڈالا کہ اس نے ذاتی محل میں اُسے رکھ لیا۔

اب بعض عزیزوں اور فوجی سرداروں سے نہ رہا گیا انھوں نے دوبارہ مستانی کو قید کر لیا اور گمنام جگہ بھیج دیا۔ اس اثنا میں باجی راؤ بعض لڑائیوں اور ملکی جھگڑوں میں الجھ گیا۔ نظام نے مرہٹوں کے خلاف لشکر کشی کر دی تھی۔ باجی راؤ اس کے مقابلہ میں گیا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نظام سے فارغ ہو کر مستانی کے لیے کچھ کرے گا مگر اسے لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ وہ خاندیش[1] کے مقام پر بیمار رہا اور ۲۰ اپریل ۱۷۴۰ء کو دریائے نربدا کے کنارے وفات پا گیا۔

اب مستانی کو قید میں رکھنا بے سود تھا، چنانچہ اُسے رہا کر دیا گیا۔ جب اُسے باجی راؤ کی وفات کی خبر ملی تو وہ رونے لگی۔ فرطِ غم سے اس کا بُرا حال تھا، وہ زیادہ دن تک نہ جی سکی اور اپنے عاشق کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد خود بھی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

---

[1] یہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں سلطنت دہلی کا صوبہ تھا۔ فیروز شاہ کے عہد میں بھی دہلی کا باجگزار رہا۔ فیروز نے اپنے ایک مصاحب ملک راجا فاروقی کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا اور دوسرے صوبیداروں کی طرح اس نے بھی تیمور کے حملے کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہاں اسیر گڑھ کا مشہور قلعہ ہے۔ ۱۶۰۱ء میں اکبر نے خاندیش کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

ملکہ میری کے معاشقے

میری سکاٹ لینڈ کی مشہور ملکہ ہے جو سکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز پنجم کی بیٹی تھی۔ ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوئی۔ سولہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ شوہر کی وفات کے بعد لارڈ ڈارنلے سے شادی کی، مگر اپنے ایک اطالوی سیکرٹری ڈیوڈ ازو سے محبت کرنے لگی اور شوہر کے خلاف اس کے ساتھ ساز باز کرنے لگی۔ چنانچہ جب ڈارنلے کو پتہ چلا تو اس نے میری کے عاشق کو قتل کرکے میری کو قید کر دیا۔

جیل میں بھی اس کی آوارہ طبیعت قرار نہ پکڑ سکی اور اس نے پوشیدہ طور پر ایک شخص امل اُف باتھ ویل سے تعلقات قائم کر لیے، پھر دونوں نے سازش کر کے ڈارنلے کو مروا دیا اور اس واقعہ کے تین ماہ بعد باتھ ویل سے شادی کر لی۔

میری کی ان بے ہودہ حرکتوں سے سارا ملک اس کے خلاف ہو گیا اور عام لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ چنانچہ وہ سکاٹ چھوڑ کر انگلستان بھاگ گئی۔ مگر راستہ میں ملکہ الزبتھ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی اور انگلستان میں قید کر دی گئی۔ کامل بیس سال جیل میں گزارے مگر اس تمام مدت میں بھی وہ اسی قسم کی حرکتیں کرتی رہی۔ بالآخر ۱۵۸۷ء میں قتل کر دی گئی۔

میری کی ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکاٹ لینڈ کے لوگ عورت کو تخت پر بٹھانے کے خلاف ہو گئے۔ چنانچہ سکاٹ لینڈ کے مشہور مصنف جان ناکس نے عورتوں کی حکومت کے خلاف ایک ایسی کتاب لکھی جس نے سکاٹ لینڈ کے تخت کی وراثت سے عورت کو محروم کر دیا۔

ہنری ہشتم کا سودائے عشق

ہنری ہشتم انگلستان کا مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ ۱۵۰۹ سے ۱۵۴۷ تک حکومت کی۔ عیاش ہونے کے باوجود عیسائی مذہب کا بہت ہمدرد تھا۔ چنانچہ اس نے جرمنی کے مارٹن لوتھر کے پروٹسٹنٹ مذہب کے خلاف اور انگلستان کے لاٹ پادری کی حمایت میں ایک کتاب بھی لکھی، جس پر لاٹ پادری نے خوش ہو کر اُسے "محافظِ دین" کا خطاب دیا۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انگلستان میں بحری بیڑے کی بنیاد رکھی۔ مگر اس کی زیادہ شہرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے نصف درجن کے قریب شادیاں کیں۔

ایک حسین عورت این بولین سے اسے محبت ہو گئی۔ جب اُس نے اس سے شادی کرنی چاہی تو لاٹ پادری نے اسے مذہب کے خلاف قرار دیتے ہوئے سخت مخالفت کی۔ اس کی پہلی بیوی کیتھرائن موجود تھی اور مذہب کے رو سے وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرسکتا تھا۔ اگرچہ ہنری مذہب کا سختی سے پابند تھا اور اسے "محافظ دین" کا خطاب بھی دیا جا چکا تھا مگر جب اپنی خواہش کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس نے مذہب کو بالائے طاق رکھ دیا اور "ریفارمیشن" کے نام سے ایک قانون جاری کیا جس کے رو سے سب سے بڑا مذہبی سربراہ ہونے کے اختیارات لاٹ پادری کے بجائے خود سنبھال لیے اور اس طرح اپنی اس شادی کے لیے گنجائش پیدا کر لی۔ پھر یکے بعد دیگرے چھ شادیاں کیں۔

این بولین نہ صرف لاٹ پادری اور بادشاہ کے درمیان جھگڑا کھڑا کرنے کا باعث بنی بلکہ اس کی وجہ سے سلطنت کو کئی اور نقصان بھی پہنچے۔ پھر این بولین نے ملکہ بننے کے بعد بادشاہ سے بھی غداری کی اور اسی جرم میں ہلاک کر دی گئی۔

ملکہ رُوس کے رُومان

کیتھرائن دوئم روس کی وہ شہرۂ آفاق ملکہ ہے جس کے حُسن نے روس کی سرزمین میں فسادات اور کشت وخون کا بازار گرم کر دیا تھا۔ وہ جرمنی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۷۲۹ء میں پیدا ہوئی۔ جب وادیٔ شباب میں قدم رکھا تو یورپ کے کئی شہزادے اس کے حسن کی شہرت سن کر شادی کے خواہاں ہوئے۔ مگر کیتھرائن کی طبیعت آزادی پسند تھی اسے شادی کے نام سے چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تاعمر شادی نہ کرے گی۔ مگر وقت آیا جب اُس نے اپنی قیامت خیز جوانی کی امنگوں کے سامنے خود سپر ڈال دی اور بالآخر ایک نوجوان شہزادے کی طرف مائل ہوگئی۔ اس شہزادے کا نام رڈولف تھا اور وہ روس کے شہنشاہ پیٹر اعظم کا پوتا تھا۔

رڈولف مدت سے کیتھرائن کا گرویدہ ہوچکا تھا اور دوسرے شہزادوں کی طرف وہ بھی اس سے شادی کرنے کی کوشش میں لگا تھا بالآخر کیتھرائن نے اس کی محبت کی قدر کی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت بھی بڑھتی گئی اور دونوں سینٹ پیٹرز برگ کے شاہی محل میں پُرمسرت زندگی بسر کرنے لگے۔ عشق ومحبت کا یہ عالم تھا کہ شہزادہ سلطنت کے دوسرے تمام کاموں سے غافل ہوچکا تھا اور ہر وقت اپنی نئی بیوی کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہتا تھا۔ کئی مرتبہ اس کے باپ یعنی شہنشاہ نے اسے اشارے کنایوں سے سمجھایا بھی مگر وہ کیتھرائن میں اتنا کھو چکا تھا کہ شاید دنیا میں اس کا واحد مقصد وہی تھی۔ اس کے سوا اُسے نہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے کوئی غرض تھی اور نہ دنیا کے کسی اور کاروبار سے۔

رڈولف کا باپ ایک قابل اور مدبر شہنشاہ تھا، مگر اس سے بعض ایسے کام سرزد ہوئے جنھوں نے ملک کے بعض سیاسی معاملات کو الجھا دیا تھا۔ جب وہ مرگیا تو رڈولف نے پیٹر سوئم کے لقب سے تخت سنبھالا۔ اب کیتھرائن ملکہ کی حیثیت میں، روس کے تاج وتخت کی مالک تھی مگر بگڑے ہوئے سیاسی ماحول نے پیٹر کو تخت پر بیٹھتے ہی حکومت کے کاروبار میں الجھا دیا اور وہ ملک کی اصلاح میں ایسا مصروف ہوا کہ کیتھرائن کے لیے کم وقت نکال سکتا۔ ملکہ نے محسوس کیا کہ اس کا

شوہر شہنشاہ بننے کے بعد بدل چکا ہے اور اس کے ساتھ پہلے کی طرح محبت نہیں کرتا چنانچہ وہ اداس رہنے لگی۔ اُسے شوہر سے شکایت پیدا ہو گئی۔

اس اثنا میں ملکہ ایک اور شہزادے پر عاشق ہو گئی۔ یہ نوجوان شہزادہ بہت خوبصورت تھا اسے اکثر ملکہ سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ملکہ کو اس سے محبت ہو گئی اور دونوں کے تعلقات قائم ہو گئے۔ اب بادشاہ ان دونوں کی آنکھ میں راہ کا کانٹا بن کر کھٹکنے لگ گیا تھا جسے ہٹانا ضروری ہو گیا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ اپنی موت آپ مرجائے یا اسے قتل کر دیا جائے، چنانچہ شہزادے اور کیتھرائن نے باہم طے کیا کہ بادشاہ کو پوشیدہ طور پر قتل کر دیا جائے۔ آخر وہ وقت آگیا جب ملکہ نے بادشاہ کو کسی طریقے سے قتل کر دیا اور یہ قتل اتفاقی حادثہ قرار دیا گیا۔ ملکہ پر کوئی الزام نہ آیا۔

بادشاہ کے قتل کے بعد شہزادے نے ملکہ سے شادی کر لی اور روس کا تخت سنبھال لیا۔ اب وہ اپنے نئے شوہر کی آغوش میں عیش و راحت کے مزے لوٹنے لگی۔

دن گزرتے گئے۔ ملکہ کا دل نئے شوہر سے بھی سرد ہو گیا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ روس اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی۔ بادشاہ کو اس سلسلہ میں میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ لڑائی کے دوران وہ قید ہو گیا اور وطن سے دور جیل خانے کی تنگ کوٹھڑی میں دن گزارنے لگا۔ ادھر ملکہ نے بادشاہ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھایا اور اپنے نئے محبوب کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگی۔ رعایا اس کی ان حرکتوں سے نالاں ہو گئی اور اس کی مخالفت ہونے لگی۔ بادشاہ کی موجودگی ہی میں وہ حد سے زیادہ فضول خرچی کیا کرتی تھی، جو امرا اور وزیروں کو گوارا نہ تھی، مگر وہ بادشاہ کے خوف سے چپ رہتے تھے۔ اب بادشاہ کی غیر حاضری میں اس نے بے کھٹکے خزانہ برباد کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں بادشاہ نے اپنی ملکہ کو جیل سے خطوط بھیجے، مگر ملکہ نے انھیں پرِکاہ برابر اہمیت نہ دی اور نہ ہی کبھی ان کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ ملکہ اسے بھلا چکی ہے۔

ملکہ کا نیا دوست اگرچہ ملکہ کو بہت چاہتا تھا مگر وہ ملکہ سے شادی کرنے کا خیال کبھی دل میں نہ لایا، بلکہ ملکہ نے اپنے شوہر کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ اسے پسند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملکہ اپنے شوہر کے ساتھ ایسی بے مروتی نہ کرے۔ کم از کم اُسے اس کے خطوط کا جواب دے اور

قید کے ان تکلیف دہ اور المناک دنوں میں اُس کی حوصلہ افزائی کرے۔ ملکہ کو یہ باتیں ناپسند تھیں وہ شوہر سے متنفر تھی اور جس طرح پہلے شوہر کو مروایا تھا اسی طرح چاہتی تھی کہ بادشاہ بھی مر جائے تو اچھا ہے تاکہ وہ اپنی سرگرمیوں میں آزاد ہو سکے۔ ملکہ کا نیا دوست بادشاہ کا حامی تھا چنانچہ ملکہ کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ بادشاہ سے یا ملکہ کے دوسرے مخالفوں سے ساز باز نہ کر لے چنانچہ اس نے اپنے مشیروں اور معتمدوں کی مدد سے اسے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس پر ملک کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرنے کا الزام لگایا۔ مقدمہ چلا اور اسے قید کر دیا گیا بعد ازاں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ملکہ کی عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ جوانی کے ولولے اب سرد پڑتے جا رہے تھے چنانچہ اب اس کے خیالات بدلنے لگے۔ وہ اپنی سابقہ زندگی پر افسوس کرنے لگی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے اپنے شوہر کا ناحق خون کیا پھر دوسرے چاہنے والے کو بھی بلاوجہ موت کی آغوش میں پہنچایا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اسے بادشاہت سے نفرت ہونے لگی۔ وہ ہر وقت مغموم رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ اپنی سابقہ زندگی کے المناک حادثات پر غور کرتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ وہ پہروں رنج و غم میں گم رہتی۔ نہ طبیعت میں وہ پہلے سی جولانیاں باقی رہی تھیں اور نہ ہی دنیوی عیش و آرام کا خیال آتا تھا۔ کھانا پینا ترک ہو چکا تھا۔ آرائش و زیبائش کی طرف بھی کوئی دھیان نہ دیتی تھی۔ زندگی کے آخری پندرہ برس میں وہ سلطنت کے کاروبار سے بالکل الگ ہو کر گوشہ نشینی کے دن گزارتی رہی بالآخر ۱۷۹۴ء میں ستر برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔

ملکہ انٹونٹ اور لوئیس شاہ فرانس

میری انیٹونٹ فرانس کی وہ بدنصیب ملکہ ہے جو انقلاب فرانس کے دوران اپنے محبوب شوہر لوئیس شاہ فرانس کے ساتھ سولی پر لٹکائی گئی۔

میری آسٹریا کی شہزادی تھی ۱۷۵۵ء میں پیدا ہوئی۔ اس کا بے نظیر حسن چار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاق اور نیک سیرت تھی۔ اپنے حسن اور پاکیزہ اخلاق کی بدولت اس نے آسٹریا کے لوگوں کا دل موہ لیا تھا۔ اس کا باپ فرانسس اوّل اسے بہت پیار کرتا تھا۔ میری اس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ملکہ میریا تھریشیا بھی اپنی بیٹی کو دل و جان سے چاہتی تھی اور ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی رفاقت گوارا نہ کرتی تھی۔ وہ خود بھی بہت پاکیزہ اخلاق کی مالک تھی۔ رعایا اس پر جان نثار کرتی تھی۔ چنانچہ اس کی بیٹی بھی اُسی جیسے عادات و خصائل کی مالک تھی۔

لوئیس شانزدہم شہنشاہ فرانس نے ایک مرتبہ کسی دعوت کے موقعہ پر اُسے دیکھا تو اس پر جان چھڑکنے لگا۔ پہلی ملاقات نے ہی اُسے گرویدہ بنا دیا۔ چنانچہ وہ سیر و تفریح کے بہانے کئی مرتبہ آسٹریا گیا تاکہ اپنی محبوبہ کو دیکھ سکے۔ لوئیس نے میریا کے لیے شادی کا پیغام دیا۔ مگر بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر میری کا باپ اس کے لیے رضامند نہ ہوا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری کی عمر زیادہ نہ تھی۔ وہ بمشکل چودہ برس کی تھی۔ چنانچہ لوئیس بہت غمگین رہنے لگا۔ اس نے میری کو حاصل کرنے کے لیے بہت کوشش کی۔ بالآخر میری کے والدین رضامند ہو گئے اور دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

شادی کے وقت میری پندرہ برس کی تھی اور لوئیس سولہ سال کا تھا۔ ملکہ نے بڑے عالیشان جلوس کے ساتھ اپنے میکے کو خیرباد کہا۔ ایک عینی شاہد ویبر نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس روز ملکہ نے آسٹریا کو خیرباد کہنا تھا اس دن صبح تمام لوگ محل سرا کے سامنے جمع ہو گئے۔ انھیں اپنی ملکہ کے جدا ہونے کا اتنا غم تھا کہ ہزاروں لوگوں کے مجمع پر سکوت چھایا ہوا تھا اور ایک

لوئیس شانزدہم (فرانس)

ملکہ میری (آسٹریا)

بھی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بیشتر لوگ رو رہے تھے۔ جب محلسرائے کا دروازہ کھلا اور میری باہر آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ میری کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ چہرے پر رنج وغم کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر فرطِ غم سے اس کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔ بالآخر گلوگیر آواز میں لوگوں کا الوداع کہا۔ اس کے ساتھ کئی سہیلیاں اور ہم جولیاں بھی تھیں اور وہ سب کی سب رو رہی تھیں۔ بیس ہزار سوار اور پیدل شاہی ساز و سامان کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ جونہی میری گاڑی کے اندر داخل ہوئی، بگل بجنے لگے۔ جلوس روانہ ہوا اور رعایا چیختی چلاتی ساتھ روانہ ہوئی۔

میری اپنا میکہ چھوڑ کر فرانس کے شاہی محل میں ملکہ بن کر رہنے لگی۔ لوئیس اس کی اک اک ادا پر جان چھڑکتا تھا۔ اور اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ ملکہ کی زندگی قابل رشک تھی۔ وہ زندگی کی بہترین منزل میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ کلیدِ فرانس کی مالک تھی۔ بادشاہ اس پر حد سے زیادہ مہربان ہو گیا۔ چنانچہ سلطنت کے تمام امور میں ملکہ ہی کے مشورے لیے جاتے۔ لوئیس نام نہاد بادشاہ تھا۔ دولت اور عیش و آرام نے ملکہ کو بے قابو کر دیا۔ وہ حد سے زیادہ فضول خرچ ہو گئی۔ بادشاہ اُسے کسی بات پر نہ ٹوکتا تھا۔ سلطنت کے امراء اس کی رنگ رلیوں اور فضول خرچیوں کے باعث بادشاہ سے بگڑنے لگے۔ وہ پندرہ سال تک عیش و عشرت کی زندگی پر کاربند رہی، پھر اچانک اس کی تقدیر پلٹی اور اسے وہ سانحہ پیش آیا جس کے متعلق نہ وہ تصور کر سکتی تھی اور نہ ہی لوئیس کو کوئی گمان ہو سکتا تھا۔

۷ مئی ۱۷۸۹ء میں لوئیس نے جمعیت طبقات[۱] کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں جھگڑا ہو گیا اور عوام نے پادریوں اور امراء و رؤسا کے خلاف اپنے مطالبات منوا لیے۔ یہ انقلابِ فرانس کی بنیاد تھی۔ چنانچہ بعد ازاں جمعیت طبقات کے بجائے قومی اسمبلی کے نام سے اجلاس طلب ہوئے۔ اس اسمبلی نے ایک نیا آئین بنایا جس کے ذریعے ۱۷۹۲ میں بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کی گئی۔ اس آئین کے مطابق امیروں، پادریوں اور رئیسوں کے تمام امتیازی حقوق

---

[۱] (States General) یہ جمعیت تین طبقوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ امراء، رؤسا، پادری اور عوام مگر یہ تقسیم برائے نام ہوتی ہے سارے اختیارات امراء اور رؤسا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

ختم کر دیے گئے۔ غیر ممالک سے بادشاہ نے جو معاہدے کر رکھے تھے سب ختم کر دیے گئے۔ پھر عوام میں بادشاہت کے خلاف زبردست جوش پیدا ہو گیا۔

لوئیس وارسیلز میں تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ یہاں باغیوں کی فوج اکٹھی ہونے لگی ہے، وہ گھبرا گیا۔ جلد ہی اُسے خبر ملی کہ پیرس پر باغیوں نے حملہ کر دیا ہے اور شاہی جیل پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ بعد ازاں مختلف صوبوں میں بغاوت پھیل گئی۔ آن کی آن میں سارا ملک بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا، بادشاہ اور ملکہ دونوں گرفتار کر لیے گئے۔

لوئیس کو پھانسی دے دی گئی۔ میری کی دنیا تاریک ہو گئی۔ اُسے اپنی موت میں بھی شبہ نہ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی باری ہے مگر وہ مطلق نہ گھبرائی۔ محبوب شوہر کی موت کے بعد وہ خود بھی زندہ رہنا نہ چاہتی تھی۔ باغیوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر عدالت کے سامنے پیش کیا۔ ملکہ پر شاہی خزانہ برباد کرنے اور بادشاہ کو غلط راستوں پر لگانے کا الزام لگایا گیا۔ انقلابی جج نے ملکہ کو اس تمام ظلم و استبداد کی ذمہ دار قرار دیا۔ میری مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی کی گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ موت سے ڈر رہی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کا شوہر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ باغیوں نے اسے بڑی بے دردی سے پھانسی دی تھی ملکہ کی موت پر آنسو بہا رہی تھی۔

ایک وقت تھا کہ ملک کے بڑے بڑے لوگ مجرم کی حیثیت سے ملکہ کے سامنے بلائے جاتے ہیں اور شاہی رعب کے سامنے انھیں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور اب وہ وقت تھا جب ملکہ خود مجرم بنی کھڑی تھی اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہ تھا۔ جج نے ملکہ سے صفائی پیش کرنے کو کہا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور نفی میں سر ہلایا۔ فل بنچ نے ملکہ کے خلاف موت کا حکم صادر کر دیا۔ مجرموں کی گاڑی لائی گئی۔ مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں ملکہ کو اس میں سوار کرایا گیا اور پھانسی گھر پہنچا دیا گیا۔ راستے میں جہاں جہاں سے گاڑی گزرتی " انقلاب زندہ باد " کے نعرے سنائی دیتے۔

ملکہ نے ان نعروں کی طرف مطلق توجہ نہ دی، نہ ہی وہ ان سے متاثر ہوئی، اس پر جمہوریت پسندوں نے آوازے کسے۔ اُسے بے عزت کیا بلکہ بعضوں نے گالیاں بھی دیں۔

مگر ملکہ نے بڑے صبر و تحمل سے سنا اور برداشت کیا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف کی علامت تھی، نہ پریشانی کی۔

جلاد نے ملکہ کی گردن پر کوئلے کا نشان لگایا، اور گلوٹین کے تختہ پر بٹھا دیا۔ چشم زدن میں ملکہ کا سر جسم سے علیحدہ کر دیا گیا۔

امیر فیصل کا رومان

امیر فیصل مکہ کے حاکم شریف حسین کا بیٹا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جبکہ وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ ایک مدت تک اس موت کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ بالآخر پتہ چلا کہ فیصل کی وفات اپنی محبوبہ کی ناگہانی موت کی خبر سُن کر ہوئی۔ امریکہ کے ایک اخبار نے امیر کے عشق کی دردناک اور پُرالم داستان شائع کی۔ اور دنیا پہلی بار بادشاہ کے رومانی راز سے واقف ہوئی۔

شریف حسین ۱۹۰۸ء میں مکہ کا بادشاہ بنا۔ ۱۹۱۶ء میں انگریزوں کے ایما پر اس نے ترکوں سے بغاوت کر دی[1]۔ اسے قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے چار بیٹے تھے علی، عبداللہ، زید اور فیصل[2]۔ فیصل نظر بندی کے دنوں میں باپ کے ساتھ تھا۔ حکومت ٹرکی نے اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر دیا۔ وہ ٹرکی میں رہنے لگا۔

جوانی کا زمانہ تھا۔ فیصل عموماً سیر و تفریح کے لیے شہر کے باہر سبزہ زاروں میں چلا جاتا۔ یہاں پہلی مرتبہ ایک تیرہ سالہ یورپین لڑکی پر نظر پڑی۔ شہزادہ اسے دل دے بیٹھا۔

اس لڑکی کا نام اینی ٹا تھا۔ اس کا باپ ٹرکی میں انگریزی سفارت خانے کا ملازم تھا۔ شہزادے نے جرأت کر کے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، پھر روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ روابط بڑھتے گئے۔ اینی ٹا بھی شہزادے سے مانوس ہو گئی تھی

---

[1] اس بغاوت کے بعد وہ حجاز کا بادشاہ بن گیا۔

[2] شریف حسین نے اپنے بیٹوں میں سے علی کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ عبداللہ کو جنگ یورپ کے بعد انگریزوں نے شرق اردن کا بادشاہ بنا دیا۔ شرق اردن عرب کا وہ علاقہ ہے جو دریائے اردن کے مشرق میں حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ فیصل کو شام کا بادشاہ اور زید کو عراق کا حکمران بنانے کی تجویز ہوئی۔ مگر فیصل نے شام کے بارے میں فرانسیسیوں کی پالیسی قبول نہ کی اس لیے اسے نکلنا پڑا۔ زید کو کوئی حکومت نہ ملی۔

کچھ مدت بعد فیصل نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ لڑکی نے مجبوری ظاہر کی۔ کیونکہ وہ عیسائی تھی اور فیصل مسلمان۔ مذہب ان کے راستے میں مانع تھا۔ شریف حسین نظربندی کا دور ختم کر کے رہا ہو چکا تھا اور اب حجاز کی حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ فیصل بھی اس کے ساتھ حجاز واپس آگیا تھا، مگر اینی ٹا سے تعلقات بدستور قائم رکھے۔ اکثر اس سے ملنے کے لیے ٹرکی چلا جاتا۔ بالآخر باپ کو پتہ چل گیا۔ اور کچھ مدت بعد اس نے فیصل کی شادی اس کے چچا کی لڑکی سے کر دی۔

جب فیصل عرب افواج کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اینی ٹا اس سے ملنے کے لیے آیا کرتی تھی اور دونوں شہر اور سلطنت کے ہنگاموں سے دور پُرسکون فضا میں کئی کئی گھنٹے گزارتے۔ مگر یہ ملاقاتیں خفیہ ہوا کرتی تھیں۔ اس دوران میں دمشق پر فرانسیسیوں نے قبضہ کیا تو فیصل کو بھاگ کر لندن میں پناہ لینی پڑی۔

کچھ مدت بعد فیصل نے انگریزوں کی مدد سے عراق کی بادشاہت سنبھال لی۔ اب وہ آسانی سے اینی ٹا کو حاصل کر سکتا تھا، مگر ملکی معاملات بگڑ رہے تھے پھر اس کی اپنی صحت بھی خراب رہنے لگی، چنانچہ وہ تفریح کے لیے سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ اس اثنا میں اینی ٹا کی طرف توجہ کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ فیصل کو ہوٹل میں اس حادثے کی اطلاع ملی اور وہ صدمے کی تاب نہ لا کر جان بحق ہو گیا۔

ب ۔ ڈکٹیٹر، حاکم اور دوسرے مشاہیر

حجاج کا عشق

عبدالملک[1] بن مروان کے عہد خلافت میں حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر تھا۔ یہ بہت ظالم اور جابر شخص تھا۔

عبدالملک نے اسی کو افواج کا سپہ سالار بنا کر عبداللہ[2] بن زبیر سے لڑنے کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ اس نے عبداللہ کی لاش تین دن تک سولی پر لٹکائے رکھی۔ اس جنگ میں خانہ کعبہ کو بھی سنگ باری سے نقصان پہنچا۔ ان اسباب کی بنا پر حجاج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اس زمانہ میں نعمان کی بیٹی ہندہ حسن و جمال میں دُور دُور تک مشہور تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سارے عرب میں اس جیسی خوبصورت عورت نہ تھی۔ حجاج نے اس کی شہرت سُنی تو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے کارندوں کی وساطت سے اس نے ہندہ سے ملاقات کی صورت پیدا کرلی اور جب اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ واپس محل میں آیا تو حالت یہ تھی کہ ہر وقت ہندہ کا چہرہ اس کے سامنے رہتا۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ پہلے دن سے ہی اس نے

---

[1] عبدالملک بن مروان ۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ بہت بلند پایہ عالم تھا۔ ۳۹ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اسوقت صرف شام اور مصر اس کے قبضہ میں تھے۔ اور حجاز و عراق میں عبداللہ بن زبیر سے جنگ درپیش تھی۔ دوسری طرف سادات کے حامی بنو امیہ کے خلاف تھے۔ خارجیوں اور رومیوں سے بھی خطرہ درپیش تھا۔ ۸۶ھ میں وفات پائی۔

[2] عبداللہ بن زبیر مشہور صحابی زبیر بن العوام کے فرزند تھے۔ حضرت عائشہ رض ان کی حقیقی خالہ تھیں۔ شجاعت، حوصلہ مندی اور زہد و عبادت میں بے مثال تھے۔ جنگ جمل، فتح افریقہ اور قسطنطنیہ کی مہم میں شامل تھے۔ یزید کی بیعت کے معاملہ میں انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور امیر معاویہ کے انتقال پر خود خلافت کا اعلان کر دیا اور مکہ میں مقابلہ کرنے کی تیاری کی۔ حجاز کے لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ اموی فوجوں سے سخت مقابلہ ہوا۔ حجاج نے آپ سے جو سلوک کیا وہ اسی مقابلے کا نتیجہ تھا۔

ہندہ کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ چنانچہ دو لاکھ درم مہر کے عوض نکاح ہو گیا اور ہندہ حجاج کے محل میں آگئی۔

دن گزرتے گئے۔ حجاج ہندہ پر جان نچھاور کرتا تھا اور ہر طرح اس کی آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ ہندہ کسی دولت مند گھرانے سے نہ تھی۔ حجاج سے نکاح کرنے کے بعد وہ دولت میں کھیلنے لگی اور ہر طرح کا آرام اُسے میسر آگیا مگر دونوں کی طبیعت نہ مل سکی۔ حجاج تند مزاج، ظالم اور بد خصلت تھا۔ ہندہ اس سے محبت تو کرتی تھی مگر حجاج کی طبیعت اور مزاج کے سامنے ہندہ کی محبت بے سود ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ وہ حجاج کو اپنی بد قسمتی پر محمول کرنے لگی اور اکثر رنجیدہ رہتی۔ حجاج نے بھی جان لیا تھا کہ ہندہ اس کے ساتھ رہنے میں خوش نہیں۔

ہندہ کے دل میں حجاج کی محبت ختم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ نفرت نے دل میں جڑ پکڑ لی۔ وہ حجاج کو اپنے لیے مصیبت خیال کرنے لگی۔ ادھر حجاج بھی اس کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ہندہ کو ذلیل کرنے کے لیے عبداللہ بن طاہر کے ہاتھ مہر کے دو لاکھ درم اس کے پاس بھیجے اور کہلا بھیجا کہ میں نے تجھے طلاق دی، تیرے مہر کے دو لاکھ درم تجھے بھجوا رہا ہوں۔ اب جہاں تیرا جی چاہے چلی جا۔

ہندہ جہاں حسن و جمال میں لاثانی تھی وہاں اپنی سیرت، فصاحت و بلاغت اور غیرت و حمیت کے لحاظ سے بھی بہت اونچی تھی۔ حاضر جوابی میں بھی اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اس نے عبداللہ بن طاہر کی زبانی پیغام سُنا تو فوراً بول اٹھی "قاصد! تیری زبان مبارک ہو۔ تو نے مجھے بڑی جانفزا خوشخبری سنائی۔ میری خوش قسمتی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے ایک بد مزاج اور خونخوار انسان کی قید سے رہائی پائی۔ یہ دو لاکھ درم جو اس نے میرے لیے بھیجے ہیں اس خوشخبری سنانے کے عوض میں مَیں تجھے بخشتی ہوں۔ یہ میری طرف سے تیرا انعام ہے۔

طلاق کے بعد ہندہ اپنے گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اُسے نکاح کا پیغام بھیجا ہندہ نے انکار کر دیا۔ جب خلیفہ کی طرف سے پیہم اصرار ہونے لگا تو بالآخر وہ رضامند ہو گئی مگر شرط یہ لگائی کہ نکاح اسی صورت میں ہو سکتا کہ میں اپنے مکان سے جس محمل

میں سوار ہو کر آپ کے محل تک آؤں اس کا ساربان حجاج ہو۔

خلیفہ نے یہ شرط قبول کر لی اور اسی خط کی پشت پر لکھ بھیجا کہ حجاج حاکم کوفہ اس کی تعمیل کرے۔ حجاج نے رقعہ پڑھا تو دم بخود رہ گیا۔ مگر خلیفہ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ ناچار وہاں سے روانہ ہو کر ہندہ کے مکان پر آیا۔ جب ہندہ اور عبدالملک کا نکاح ہو گیا۔ ہندہ اور اس کی سہیلیاں اپنے اپنے محمل میں بیٹھ گئیں تو حجاج اپنی پوری پوشاک کے ساتھ محمل کے قریب آیا اور پا برہنہ ساربانوں کی اونٹ کی مہار پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ ہندہ کے ملازم اور اس کی سہیلیاں تمام راستہ اُسے چھیڑتے رہے، مگر وہ خاموش چلا جا رہا تھا۔

جب شاہی محل قریب آیا تو ہندہ نے اپنی سواری پر سے ایک دینار قصداً نیچے پھینک دیا۔ ساتھ ہی حجاج کو آواز دی "اے ساربان ہمارا ایک درم زمین پر گر گیا ہے اٹھا دو"

حجاج نے مہار روک لی اور سکہ اٹھایا تو وہ درم نہ تھا بلکہ دینار[1] تھا۔ بولا "حضور یہاں درم نہیں، دینار ہے۔" ہندہ نے جواب دیا، ہاں درم نہیں دینار ہے۔

پھر اپنی ایک سہیلی کے ہاتھ میں وہی دینار دیتے ہوئے بولی "دیکھو دینار ہے درم نہیں۔ خدا کا شکر ہے میرے ہاتھ سے چاندی کا سکہ گرا مگر میری خوش قسمتی سے وہ سونے کا سکہ بن گیا۔"

(درم چاندی کا سکہ ہوا کرتا تھا اور دینار سونے کا)

حجاج یہ بات سن کر بہت خفیف ہوا۔ مگر دم نہ مار سکا۔

---

[1] قدیم زمانہ میں عرب میں یہ سکہ رائج تھا۔ اس کا وزن ۴ء۶۵ گرین ہوا کرتا تھا۔ اس کی قیمت موجودہ پاکستانی سکہ کے حساب سے دس بارہ روپے ہوتی ہے۔ اسے اشرفی بھی کہا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں یہی سکہ رائج تھا اور اسی لیے زکوٰۃ، خراج اور مہر کا حساب اسی سکہ سے لگایا گیا ہے۔

لوئی پاسچر کا رومان

لوئی پاسچر وہ مشہور فرانسیسی سائنسدان ہے جس نے بکٹیریا کو دریافت کر کے بہت سی بیماریوں کے سدباب کا راستہ دکھایا اور اس طرح نسل انسانی پر بہت بڑا احسان کیا۔ اسی دریافت کے نتیجے میں آج ہزاروں لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ سے بچایا جاتا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ آخری عمر میں پیرس میں پاسچر انسٹی ٹیوٹ قائم کی جو آج عالمگیر شہرت اور اہمیت رکھتی ہے۔

ابتدا میں ڈرائنگ اور مصوری کیا کرتا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک یہی مشغلہ رہا پھر سائنس اور کیمسٹری کی طرف رجوع ہو گیا۔ چنانچہ ان علوم کو سیکھنے کے بعد چھبیس برس کی عمر میں پروفیسر بن گیا اور فرانس کے علاقہ سٹرس برگ کی اکیڈمی میں اس کا تقرر ہوا۔ یہیں سے اس کی رومانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اس اکیڈمی کے سربراہ کا نام لارنٹ تھا۔ میری لارنٹ اس کی نوجوان اور حسین بیٹی تھی پاسچر اسے دل دے بیٹھا۔ اور اُس سے شادی کرنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ وہ اپنی لیبارٹری میں بہت مصروف رہتا تھا تاہم اس مصروفیت کے دوران میری کا تصور اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔

اس زمانے میں دستور تھا کہ شادی کا خواہش مند نوجوان لڑکی کے والد یا سرپرست پر اپنی خواہش کا اظہار کرتا۔ چنانچہ لوئی پاسچر نے بھی جبکہ اُسے یہاں آئے صرف دو ہفتے ہی گزرے تھے۔ میری کے والد کو خط لکھا اور درخواست کی کہ میری کو اس سے بیاہ دینے کا اقرار کرے۔ میری سے پوچھا گیا تو اس نے باپ کو جواب دیا کہ میں فوری طور پر اپنا فیصلہ نہیں بتا سکتی۔ چنانچہ جب پاسچر کو خبر ملی تو اس نے میری کو لکھا کہ تم بے شک فوری طور پر میرے حق میں کوئی فیصلہ نہ دو، اور پوری طرح اطمینان کر لو مگر وقت تمہیں بتا دے گا کہ میں بظاہر سرد مہر یا شرمیلا سہی مگر میرے اندر ایک ایسا درد مند دل ہے جو تمہاری محبت سے لبریز ہے۔

میری پر اس کا بہت اثر ہوا۔ وہ شادی کے لیے رضامند ہوگئی اور ۲۹ مئی ۱۸۴۹ء کو دونوں کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد دونوں بڑی پُرمسرت زندگی گزارنے لگے۔ شادی سے قبل پاسچر کی طرف میری کا زیادہ میلان نہ تھا، مگر شادی کے بعد وہ اس کے اوصاف دیکھ کر دل و جان سے اس کی گرویدہ ہوگئی۔ پاسچر بھی اس کے جذبات کی بے حد قدر کرتا تھا اور ایک اچھا شوہر ثابت ہوا، مگر میری کی محبت پاسچر کے ان عزائم پر حاوی نہ ہوسکی، جو شروع ہی سے اس کے دل میں جگہ پا چکے تھے۔ وہ طبی تحقیقات کے میدان میں شاہسوار بن کر نکلا تھا اور نت نئے انکشافات کے لیے تگ و دو کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں اس کی سرگرمیوں اور اس کی مصروفیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ جس روز دونوں کی شادی قرار پائی تھی۔ اُس دن بھی یہ حالت تھی کہ شادی کا لباس پہنانے کے لیے پاسچر کو اس کی لیبارٹری سے پکڑ کر لانا پڑا۔ بہر حال میری نے اس کے ان کاموں میں رکاوٹ بننے کے بجائے اس کی ہمت بندھائی اور ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔

ان دنوں فرانس پر نپولین دوم کی حکومت تھی۔ اس کا بیٹا جو بعد ازاں نپولین سوئم کے نام سے مشہور ہوا۔ سٹرس برگ میں آیا۔ اُس کی آمد پر یونیورسٹی کے کارکنوں نے شہزادے کے استقبال کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ یونیورسٹی کے سرکردہ عہدے داروں نے شہزادے کو خوش آمدید کہا مگر پاسچر اپنی لیبارٹری میں تجربے کرنے میں اس قدر مصروف تھا کہ سارا دن گزر گیا وہ کمرے سے باہر ہی نہ آیا۔ اُسے معلوم تھا کہ آج شہزادہ یہاں آئے گا مگر اُس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ شام کو جب گھر واپس گیا تو اندر داخل ہوتے ہی میری سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے شہزادے کی آمد کا خیال ہی نہ رہا اور میں مصروف رہا ورنہ تمہیں آگرے جاتا۔ میری مسکرا دی اور مطلق کوئی شکایت نہ کی۔

یہ ضرور ہے کہ حد سے زیادہ انہماک کے وہ خلاف تھی۔ مگر اس نے پاسچر پر غصہ کبھی نہ کیا اور نہ ہی سختی سے اُسے اُس کے کاموں سے روکا البتہ اس کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے کبھی کبھی دبی زبان سے شکایت ضرور کی۔

اکیڈمی میں آئے دن جلسے اور کانفرنسیں ہوتی رہتی تھیں مگر پاسچر نے بہت کم ان میں شرکت کی۔ اسے بس اپنے ہی کام کی دھن تھی اور اس کی بیوی بالکل اُس کی ہم خیال تھی۔ پاسچر کو شور و غل سے بہت نفرت تھی خصوصاً جب وہ لیبارٹری میں کام کر رہا ہوتا، وہ کوئی آواز نہ سننا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ شور کی آواز سے انسان کی ذہنی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ میری اپنے شوہر کی سب سے بڑی مداح تھی۔

لارڈ لسٹر کا رومان

آجکل اپریشن کے ذریعہ بیشتر بیماریوں کا قلع قمع کردیا جاتا ہے۔ مگر آج سے قریباً نصف صدی قبل یہی اپریشن بہت کم کامیاب ہوتے تھے۔ اس لیے کہ اپریشن کے بعد مریض کا خون زہریلا ہوکر اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ لارڈ لسٹر وہ مشہور سرجن ہے جس نے اپریشن میں جراثیم کش طریقہ استعمال کرکے اس طریق علاج کو کامیاب بنادیا اور یہی طریقہ آج سرجری میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

لسٹر ۵ اپریل ۱۸۲۷ء کو انگلستان میں پیدا ہوا۔ یونیورسٹی کالج لندن سے ایم بی کی سند حاصل کی اور ایڈنبرا میں مشہور سرجن جیمز سیم کے ماتحت ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ سیم کے ماتحت کئی اور ڈاکٹر کام کرتے تھے مگر لسٹر میں اس نے اس پیشہ کی خاص صلاحیتیں معلوم کرلی تھیں چنانچہ وہ لسٹر پر بہت مہربان ہوگیا اور اس کی بہت عزت کرنے لگا۔ اس نے اسے اپنا ہاؤس سرجن مقرر کردیا۔ پھر اہم اپریشنوں میں لسٹر کو بھی ساتھ رکھنے لگا۔ سیم اور لسٹر میں خاصی دوستی ہوگئی۔

سیم اپنے وقت کا بہت بڑا سرجن مانا جاتا تھا۔ اس کی بڑی لڑکی کا نام اینز (AGNES) تھا۔ جو بہت خوبصورت اور دانا تھی۔ لسٹر کو اکثر اس سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان ملاقاتوں نے اُسے اینز کی طرف مائل کردیا اور وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔

لسٹر اپنے مہربان استاد سیم کی بہت عزت کرتا تھا چنانچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس سے اُس کی بیٹی کے لیے درخواست کرے۔ وہ ایسا کہنے سے ہچکچاتا رہا۔ لیکن جب صبر نہ ہوسکا، تو بالآخر اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔ سیم لسٹر کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ اس کی شرافت اور قابلیت کا مداح تو تھا ہی بیٹی کو اس کی زوجیت میں دینے سے ذرا تامل نہ کیا اور بالآخر ۲۲ اپریل ۱۸۵۶ء کو شادی ہوگئی۔ لسٹر کی عمر اس وقت انتیس سال کی تھی۔

شادی کے بعد دونوں بڑے پیار و محبت سے رہنے لگے۔ اینز ہمیشہ اس کے کاموں میں اُسے مدد دیتی۔ بعض اوقات سات آٹھ گھنٹے مسلسل اس کے ساتھ کام کرتی۔ لسٹر اُسے

نوٹ لکھاتا اور وہ کئی کئی گھنٹے نوٹ لکھتی رہتی اور ذرا تھکاوٹ محسوس نہ کرتی۔ لسٹر نے جتنی تحریریں چھوڑی ہیں ان میں سے بیشتر اینز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے بہت سے لیکچر بھی اس کی بیوی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔

اینز سینتیس سال تک لسٹر کے ساتھ رہی۔ لسٹر کے لیے اینز کی رفاقت اس کے تحقیقاتی کاموں میں بہت مفید ثابت ہوئی بالآخر ۱۸۹۳ء میں اس کی ہمدرد محبوبہ اور بیوی انتقال کر گئی جس نے لسٹر کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔

۱۹۰۳ء میں لسٹر خود بھی بیمار ہو گیا اور یہ بیماری کبھی نہ گئی۔ ۹ سال تک وہ بیمار رہا۔ اور بالآخر ۱۰ فروری ۱۹۱۲ء میں انتقال کر گیا۔

گراہم بیل کا رومان

ٹیلیفون کی ایجاد کا سہرا انگلستان کے مشہور موجد گراہم بیل کے سر ہے۔ جو ۱۸۴۷ء میں ایڈنبرا میں پیدا ہوا۔ ۱۸۷۰ میں امریکہ آیا اور بوسٹن کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا جہاں وہ بہرے لوگوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔ اسی پیشے کی وساطت سے وہ دنیا کے مشہور موجدوں کی صف میں جا پہنچا۔

بوسٹن میں اپنے پیشے کے سلسلہ میں وہ ایسی مشینوں کی دریافت میں لگا رہتا تھا جن کی مدد سے بہروں کی شنوائی کو بحال کیا جا سکے۔ اس کے شاگردوں میں میبل ہیرلڈ نام ایک نوجوان اور خوبصورت بہری لڑکی بھی تھی۔ گراہم بیل کو اس سے محبت ہو گئی۔ وہ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی اس محبت نے گراہم بیل کو اس کے مقاصد میں بہت مدد دی اور وہ اس طرح کہ اس کی اپنی محبوبہ بھی بہری تھی اور وہ اس کے اس نقص کو بھی دور کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنا بیشتر وقت مشینوں پر تجربہ کرنے کے علاوہ اپنی محبوبہ پر بھی تجربہ کرنے میں گزارتا۔ میبل ہیرلڈ نے اسے بتایا کہ ہونٹوں کی حرکت سے بات سمجھ لینا بہترین طریقہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گراہم بیل نے اس طریقہ کو دریافت کرنے اور اس کے لیے اصول وضع کرنے کے سلسلے میں بہت کچھ کیا اور بہروں کی تعلیم کے سلسلہ میں بہت کامیابی حاصل کی۔

۱۸۷۵ء میں بیل نے میبل ہیرلڈ سے شادی کر لی اور دونوں کامیاب زندگی بسر کرنے لگے اس سے اگلے سال اُس نے دنیا کے سامنے اپنی وہ نئی ایجاد پیش کی جس نے ہمیشہ کے لیے اس کا نام زندہ کر دیا۔ ٹیلیفون ایجاد ہو گیا اور آج ٹیلیفون کا نام سُنتے ہی گراہم بیل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میبل ہیرلڈ کے باپ کا نام گارڈنر ہیرلڈ تھا۔ جو بہت دولت مند تھا۔ جب عمر کے آخری ایّام میں گراہم بیل نے ٹیلیفون کمپنی بنائی تو اس کے ڈائرکٹروں میں گارڈنر بھی شامل تھا جس نے ہر ممکن طریقہ سے بیل کی مدد کی اور ٹیلی فون کو ترقی دینے میں بیل کا ہاتھ بٹایا۔

۱۹۲۲ء میں گراہم بیل نے وفات پائی۔

ابراہام لنکن

میری لنکن

ابراہام لنکن کا رومان

ابراہام لنکن ریاستہائے متحدہ امریکہ کا سولھواں صدر تھا۔ امریکہ کی ریاست کینٹکی[1] کا رہنے والا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں وکالت کرتا رہا پھر ترقی کرتے کرتے ۱۸۶۱ء میں امریکہ کا صدر بن گیا۔ ۱۸۶۴ میں دوبارہ صدر بنا۔ ۱۸۶۵ء میں قتل کر دیا گیا۔

ابراہام لنکن کی جوانی کے دنوں میں اس کے پڑوس میں میری ٹاڈ نام ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی رہتی تھی۔ اسے اکثر لنکن سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا اور لنکن کی خوبیوں کی بہت معترف تھی۔ چنانچہ اس کے دل میں لنکن کے لیے کشش پیدا ہو گئی۔ وہ اُسے چاہنے لگی۔ لنکن بھی اس لڑکی میں اپنے لیے دلکشی کے اوصاف دیکھتا تھا، مگر وہ طبعاً بڑا خاموش منش اور سنجیدہ تھا۔ زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتا۔ چونکہ وکالت اس کا پیشہ تھا اس لیے وہ فرصت کے اوقات میں زیادہ تر موکلوں کے ساتھ مصروف رہتا۔ اگرچہ اُسے بھی میری ٹاڈ سے محبت تھی اور وہ تنہائی میں اس کا تصور بھی جمائے رکھتا تھا مگر اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس نے میری ٹاڈ پر کبھی اپنے جذبات کے اظہار کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب وہ سیاست میں حصہ لینے لگا اور ملک کے طول و عرض میں اس کی شہرت پھیلی تو میری ٹاڈ کی محبت اور زیادہ رنگ لائی۔ بالآخر وہ خود ہی ایک دن اس کے پاس محبت کی بھیک مانگنے کے لیے جا پہنچی۔ ابراہام لنکن نے محبوبہ کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ دونوں کی ملاقاتیں نیا روپ اختیار کر گئیں۔ پھر ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر دونوں میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔

---

[1] یو ایس اے کے وسط میں مشرق کی جانب ایک ریاست۔ دریائے مسس پی کے طاس میں واقع ہے لوئی ویلی سب سے بڑا شہر ہے۔ فرینک فورٹ صدر مقام ہے۔ رقبہ ۴۰۱۰۹ مربع میل اور آبادی ۲۸ لاکھ سے اوپر ہے۔

لینن کا رومان

لینن روس کا مشہور انقلابی لیڈر ہے، جس نے زار روس کی شہنشاہیت کا تختہ الٹنے اور بالشویک حکومت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوا اور نئی حکومت کا صدر بنایا گیا۔

لینن ایک سکول ماسٹر کا لڑکا تھا۔ ۱۸۷۰ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اپنی زندگی کے چوّن سال اس نے کشمکش اور جدوجہد ہی میں گزارے۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے اقتدار و اختیار کی چیرہ دستیوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ حکومت وقت کے خلاف باغیانہ خیالات اس کے ذہن میں جگہ پاتے گئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان خیالات میں عملی حرکت کے آثار ہویدا ہونے لگے اور وہ ملکی سیاسیات میں حصہ لینے لگا۔ والدین نے اُسے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے لیے سینٹ پیٹرس برگ بھیج دیا جو آجکل اسی کے نام سے لینن گراڈ کہلاتا ہے۔ مگر لینن کی طبیعت کو یہ پیشہ راس نہ آیا اور وہ باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔ ۱۸۹۳ء میں جبکہ اس کی عمر انتیس سال کی تھی۔ وہ روس کی انقلابی جماعت کا سرکردہ رکن بن گیا اور اس پر حکومت کا عتاب نازل ہونے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں زندگی کے پہلے اور آخری رومان سے اس کا سابقہ پڑا، اور سیاست کے ساتھ ساتھ وہ رومانی میدان میں بھی اپنی طبیعت کے جوہر دکھانے لگا۔

اس نے ایک کلب میں پہلی مرتبہ روس کی مشہور ایکٹرس پولا کو دیکھا۔ پولا نہایت حسین دوشیزہ تھی۔ ایک موقع پر لینن کی اس سے گفتگو ہوئی۔ لینن نے اندازہ کر لیا کہ پولا اُس سے محبت کرتی ہے۔ لینن کے لیے پولا کی یہ روش تعجب انگیز تھی، وہ اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس کی زندگی ایسی تھی، جس میں رومانی کارگزاریوں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو سکتی تھی تاہم پولا نے اپنے حسن اور گفتگو سے لینن کو ایسا مسحور کیا کہ وہ اس کی طرف کھنچنے لگا۔

ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ انھیں کبھی کبھی تنہائی میں کیف پرور فضا میسر آجاتی تو کچھ

دیر کے لیے محبت کی رنگینیوں میں گم ہو جاتے مگر لینن کے لیے اس کا ماحول عشق و محبت کے لیے قطعاً موزوں نہ تھا۔ پولیس ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ اور جب سے پولا کے ساتھ سلسلہ جنبانی شروع ہوا تھا۔ پولا بھی حکومت کی نظروں میں مشکوک ہو گئی تھی۔ لینن اس صورتِ حال سے بے خبر نہ تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے پولا پر بھی کوئی آفت نازل نہ ہو۔ چنانچہ اس نے متعدد مرتبہ پولا کو خبردار کیا اور مشورہ دیا کہ وہ اس سے تعلق کم کر دے، مگر پولا اس پر کبھی رضامند نہ ہوئی۔ وہ لینن کی محبت میں دیوانی ہوئی جاتی تھی۔

جب لینن کی باغیانہ سرگرمیاں زیادہ نمایاں ہوئیں تو اسے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طویل غیر حاضری نے پولا کو سخت پریشان رکھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں لینن کو رہائی ملی مگر اب روس کے حالات سخت خطرناک تھے اور اس کا وہاں آنا نقصان سے خالی نہ تھا چنانچہ وہ پیرس چلا گیا، وہاں سے لندن گیا۔ پھر سنہ ۱۹۰۵ء میں جب روس میں بغاوت کی زبردست آندھیاں چلیں تو روس واپس آ گیا۔

پولا کے لیے لینن کی آمد ایک نئی زندگی کا آغاز تھا محبت کی باتیں پھر دہرائی جانے لگیں مگر لینن کی طبیعت کو سکون نہ تھا۔ وہ پولا کی خواہش کے مطابق اس سے نباہ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب انقلابی تحریک ناکام رہی، اور لینن کو دوبارہ گرفتاری کا خطرہ لاحق ہو گیا، تو اس کے ساتھ پولا کی جان بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ لینن نے پولا کو مشورہ دیا کہ وہ روس چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے تاکہ حکومت کی نظرِ عتاب سے بچ سکے مگر پولا وہیں رہنے پر مصر رہی۔ لینن نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں انقلابی آدمی ہوں۔ میرے پاس ان مشاغل کے لیے وقت ہی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم کسی پسند کے آدمی سے شادی کر لو۔ مگر پولا نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔

آخر لینن کے سمجھانے بجھانے پر پولا سوئٹزرلینڈ جانے پر رضامند ہو گئی۔ اس نے دکھے دل کے ساتھ اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا جس سے لینن بھی متاثر نظر آتا تھا مگر وہ بالکل خاموش تھا اور اس کی ہمت بندھا تا رہا۔

"پولا! مجھے بھی تم سے اسی قدر محبت ہے جتنی تمہیں مجھ سے مگر میں مجبور ہوں۔ تم میری یاد کو دل سے محو کر دو۔ اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک ملک آزاد نہیں ہو جاتا۔"

پولا چلی گئی۔ لینن اور پولا کی یہ آخری ملاقات تھی۔

کارل مارکس کا رومان

۱۹۱۷ء میں جب روس میں دوسرا انقلاب آیا اور بالشویک برسرِ اقتدار آئے تو اس موقعہ پر جس ہاتھ نے لوگوں کی رہبری کی وہ لینن کا ہاتھ تھا اور جس آواز نے ان کی رہنمائی کی وہ کارل مارکس کی آواز تھی۔ کارل مارکس ہی وہ شخص ہے جس نے کمیونزم کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ موجودہ دَور میں مارکس کی تعلیمات سیاسی حلقوں میں اہم موضوع بنی ہوئی ہیں۔

مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو رائن لینڈ[1] میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک یہودی وکیل تھا۔ بعد ازاں عیسائیت اختیار کر لی۔ سترہ سال کی عمر میں مارکس کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بان یونیورسٹی[2] میں داخل کیا گیا۔ اگلے سال وہ برلن یونیورسٹی میں چلا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مارکس ایک نوجوان لڑکی پر فریفتہ ہو گیا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ رومانی مشاغل بھی جاری رہے۔

اس لڑکی کا نام جینی تھا۔ برلن کے ایک رئیس وان فسٹ فیلن کی بیٹی تھی۔ مارکس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور جینی قریباً سولہ سال کی تھی۔ اُس نے جینی سے راہ و رسم پیدا کر لی اگرچہ وہ بچپن ہی سے انقلابی طبیعت کا آدمی تھا اور طالب علمی کے زمانہ میں اسی نوعیت کے مضامین لکھنے کی مشق کرتا رہتا تھا۔ تاہم جینی کی محبت نے اس پر ایسا غیر معمولی اثر کیا کہ وہ شاعر بن گیا۔ وہ شعروں کے پلندے جینی کو بھیجتا اور وہ پڑھ کر بہت خوش ہوتی۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے دو نظمیں لکھیں جو برلن کے ایک اخبار "اتھینم" میں شائع ہوئیں۔ روس کا عظیم الشان انقلابی لیڈر پہلی بار شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔

جینی بھی مارکس سے محبت کرتی تھی۔ مارکس اُسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا، مگر وہ امیر گھرانے سے تھی اور مارکس کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے اسے شبہ تھا کہ جینی کا باپ اسے داماد بنانے

---

[1] جرمنی کا علاقہ۔ رقبہ ۹۶۶ء۵ مربع میل، آبادی ۲۸ء۷ لاکھ کے قریب ہے۔ کوبلنز صدر مقام ہے۔

[2] جرمنی کی مشہور یونیورسٹی ہے۔ مغربی جرمنی کی پارلیمنٹ کا اجلاس یہاں ہوتا ہے۔ آبادی لاکھ سے اوپر ہے۔

کے لیے رضامند نہ ہوگا۔ تاہم اُس نے جرأت اور دلیری سے کام لیتے ہوئے جینی کے باپ پر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا جو غیر متوقع طور پر قبول کر لی گئی اور اُس نے بیٹی کو اس سے بیاہ دینے کی حامی بھر لی۔

اب مارکس نے اپنے مضامین اور نظموں کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس کے خیالات مذہب کے خلاف تھے اتفاق سے اسے اسی نوعیت کا ایک اخبار مل گیا اور مارکس اس اخبار کے مستقل مضمون نگاروں میں شامل ہوگیا۔ ایسے جاندار مضامین لکھے کہ اخبار کے مالک نے اُسے اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔

اب مارکس نے ایسے ایسے اداریے لکھے کہ حکومت کو پرچے پر سنسر بٹھانا پڑ گیا اور پرچہ بند ہوگیا۔

اب مارکس بے کار تھا۔ تاہم وہ دوسرے اخباروں میں مضامین شائع کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے جینی کے باپ سے سلسلہ جنبانی جاری رکھا اور بالآخر جینی سے شادی کر لی۔ گو اس کی زندگی بے حد مصروف تھی مگر جینی کی محبت سے ایک لحظہ کے لیے بھی غافل نہ ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے والہ وشیفتہ رہے اور ہنسی خوشی دن گزرتے گئے۔

مارکس نے ایک مرتبہ اپنے دوست آرنلڈ رگ کو خط میں لکھا۔ "میں جذبات سے ہٹ کر تمھیں لکھ رہا ہوں کہ میں آجکل سر سے پاؤں تک محبت میں ڈوبا ہوا ہوں۔ تاہم میری دلھن اور میں دونوں مل کر عرصے سے ایسی تھکا دینے والی اور غیر ضروری جنگیں لڑ رہے ہیں۔ جو کئی ایسے لوگوں کو لڑنی نصیب نہیں ہوئیں جو ہم سے عمر میں تین گنا بڑے ہیں اور جو اکثر اپنے "تجربہ کاریوں" کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔"

کئی سال کی انقلابی سرگرمیوں کے دوران مارکس مختلف علاقوں میں گھومتا رہا کئی علاقوں سے نکالا گیا اور بالآخر اپنی بیوی اور بچوں سمیت لندن میں رہنے لگا۔

لندن کے قیام میں اسے سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اسے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت تھی۔ مگر غربت کے باعث وہ انھیں کوئی آسائش مہیا کرنے سے قاصر رہا۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اخبارات اس کے مضامین شائع کرنے سے گریز کرتے تھے۔ جس مکان میں رہتے

تھے، وہاں سے انھیں نکال دیا گیا اور ایک خستہ جگہ پر دو معمولی سے کمرے کرایہ پر لے لیے۔
غربت کے ساتھ ساتھ صحت بھی گرنے لگی۔ دو بچے کمسنی ہی میں وفات پا گئے۔ مارکس کو سرطان ہو گیا۔ اس مرض کے علاوہ اور بھی کئی جسمانی شکائتیں پیدا ہو گئیں۔ حد سے زیادہ تنگدستی نے جینی کو اتنا پریشان کر دیا کہ بالآخر وہ مارکس سے شاکی رہنے لگی اور ان کی دیرینہ محبت سرد پڑ گئی۔ ان ایام میں مارکس کا ایک دوست اینجلز روپے پیسے سے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کر دیا کرتا تھا۔
رفتہ رفتہ یہ تنگدستی کم ہونے لگی۔ مارکس کے مضامین مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونے لگے۔ ۱۸۵۱ء میں وہ "نیو یارک ٹریبیون" سے منسلک ہو گیا پھر دوسرے پرچوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر اس کے سیاسی اور انقلابی عروج کا وہ زبردست دور آیا جب وہ دنیا کی عظیم شخصیت سمجھا جانے لگا۔ اینجل کی طرف سے اُسے ۳۵۰ پونڈ سالانہ ملنے لگے۔

جینی کو سرطان کے مرض نے آلیا۔ وہ کئی سال تک بیمار رہی۔ بالآخر ۱۸۸۱ء میں مر گئی۔ اس وقت مارکس خود سخت بیمار پڑا تھا۔ جینی کی وفات کے بعد وہ دو سال تک زندہ رہا اور بالآخر ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء میں لندن میں انتقال کر گیا۔

چیانگ کائی شیک کا رومان

چیانگ کائی شیک چین کا وہ مشہور حریت پسند لیڈر ہے جس نے ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ لیا پھر ۱۹۲۵ء میں قوم پرستوں کی قیادت سنبھالی اور کچھ مدت بعد چین کا صدر بن گیا۔

چیانگ ۱۸۸۷ء میں صوبہ چیانگ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ٹوکیو (جاپان) کے فوجی کالج میں تعلیم پائی۔ اور زندگی کا اکثر ابتدائی حصہ جاپان میں گزارا۔

اسے چین کے دلکش قدرتی مناظر سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ وہ تعلیم کے دوران اکثر چین آجایا کرتا تھا اور سمندر کے کنارے سیر کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک جھیل کے کنارے گھوم رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک باغ میں نوجوان لڑکی نظر آئی۔ نہایت خوبرو اور نازک اندام دوشیزہ تھی جو باغ سے پھول توڑ رہی تھی۔ چیانگ اس کا حسن دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ خاصی دیر تک اس کی حرکتوں پر غور کرتا رہا۔ بھولی بھالی صورت اسے بہت پیاری دکھائی دی۔ وہ لڑکی کو نہ جانتا تھا مگر بے تابی نے اسے سوچنے کا موقع نہ دیا وہ یکدم آگے بڑھا

"تم یہ پھول کیوں توڑ رہی ہو"

لڑکی نے ہاتھ روک لیا اور حیرانی سے نووارد کی طرف دیکھنے لگی پھر جلد ہی سنبھل کر متانت سے جواب دیا "میں گھر لے جاؤں گی، گلدستہ بناؤں گی۔ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟" "میں یونہی سیر کرنے آیا تھا، تمھیں دیکھا تو جی چاہا کہ کسی بہانے بات کر لوں، سو ہو گئی۔"

لڑکی مسکرا دی۔ شرم سے نگاہیں جھکا لیں۔ چیانگ کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے طویل باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ لڑکی قدرتی طور پر اس سے متاثر نظر آتی تھی۔ اس گفتگو نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ پھر متعدد مرتبہ ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔

اس لڑکی کا نام سونگ مے لنگ تھا، وہ ڈاکٹر سن یات سن[1] کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ڈاکٹر کی بیوی کی بہن تھی۔ رفتہ رفتہ چیانگ اس کے گھر جانے لگا۔ پھر ڈاکٹر سن یات سن اور اس کی بیوی سے بھی گہرے مراسم

[1] ۱۸۶۶ء تا ۱۹۲۵ء۔ ۱۹۱۲ء میں عبوری چین کا صدر تھا۔ پھر جلد ہی یوان شی کائی کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں ہانگ کانگ میں ہی باقاعدہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ اور جاپان میں پہلی مرتبہ چین کی انقلابی لیگ کی بنیاد رکھی اور ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں پیش پیش رہا۔ سرگرم حصہ لیا۔ چیوں کے بعد ہونے والی جنگ میں نانکنگ گورنمنٹ کی طرف سے جنوبی صوبوں کا صدر رہا

قائم کر لیے اور مے لنگ کیساتھ اس کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ مے لنگ بھی اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔
۱۹۱۱ء کا زمانہ تھا، چین کی انقلابی جماعت کیومن ٹانگ ملک میں بڑی طاقت حاصل کر چکی تھی۔ چیانگ بھی اس کا ممبر تھا اور ڈاکٹر سن یاٹ سن اس کا صدر۔ اسی سال چین میں انقلابی تحریک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔ چیانگ نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور اپنی قابلیت، تدبر، جوش وخروش اور حریت پسندی کے اعلیٰ نمونے دکھائے، جس نے ڈاکٹر سن یاٹ سن کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ انقلاب کے بعد ڈاکٹر نے چیانگ کو کیومن ٹانگ کی مستقل مجلس کا صدر مقرر کر دیا۔

اب چیانگ اور ڈاکٹر سن یاٹ سن میں گہری دوستی قائم ہوگئی۔ اکثر انھیں اکٹھا رہنے کا موقع ملتا۔ چیانگ اس کے ہاں آزادی سے آیا جایا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مے لنگ سے ملنے میں بڑی آسانی ہوگئی تھی اور محبت کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دُور ہوگئی تھیں۔ وہ دونوں شام کے بعد شہر سے باہر میدانوں اور باغوں میں گھومنے کے لیے جاتے۔

چیانگ کو انقلابی تحریک میں بہت مصروف رہنا پڑتا تھا۔ تاہم اسے مے لنگ سے اتنی محبت تھی کہ وہ روزانہ اس سے ملنے کے لیے آجایا کرتا تھا۔ بالآخر چیانگ نے خود ہی اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مے لنگ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی تاہم چیانگ کا خیال تھا کہ ان کی شادی میں مذہب کا سوال پیدا نہ ہوگا مگر مے لنگ نے اُسے بتایا کہ جب تک وہ خود عیسائی مذہب قبول نہ کرے شادی ممکن نہیں۔ اس کی والدہ نہ مانے گی۔ چیانگ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا اگر وہ مذہب تبدیل کر لے تو شاید قوم پسند اس کے خلاف ہو جائیں گے۔

کچھ مدت اسی تذبذب میں گزری۔ بالآخر ۱۹۲۵ء میں سن یاٹ سن کا انتقال ہوگیا۔ تو قوم پرستوں کی قیادت چیانگ کے ہاتھ میں آگئی اور وہی ملک کا سب سے بڑا ہیرو سمجھا جانے لگا۔ کچھ مدت تک وہ انقلابی تحریک کے سلسلے میں بہت مصروف رہا۔ اسے بالکل فرصت نہ ملی کہ وہ اپنے اور مے لنگ کے تعلقات کے متعلق کچھ سوچ سکے۔ آخر ایک دن اس نے اپنی محبت کو پائیدار اور دوامی حیثیت بخشنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے عیسائیت قبول کر لی اور ۱۹۲۷ء میں دونوں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوگئے۔ زندگی کی پُرمسرت گھڑیاں امن وسکون سے گزرنے لگیں۔

کتاب و مصنف	تعارف	قیمت
ٹھوکر رئیس احمد جعفری	ایک پری پیکر کی رومانی داستان کا حسین سنگم حسن و عشق کا معرکہ جس نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دو دوستوں کی رومانی سرگزشت	چار روپے آٹھ آنے
ساحل سے پہلے عابدی جعفر۔	رومان و محبت کی چھاؤں میں تین لڑکیوں کی کارگزاریاں معصوم لڑکیوں کی عصمت کو لوٹنے والا ماحول مگر یہ لڑکیاں اپنی عصمت بچاتی ہیں۔ حیرت انگیز جرأت اور قربانی کا مرقع۔	تین روپے آٹھ آنے
اور وہ ناچ رہی تھی عثمان علیم صدیقی	ایک طوائف کی سرگذشت جس پر سینکڑوں امیر اپنی جانیں قربان کرتے تھے۔ مردوں پر حکومت کرتی تھی طوائف کا عروج اور زوال، دلکش اور پر اثر داستان۔	تین روپے آٹھ آنے
محبت کے سوا عابدی جعفر	بیوی سے بیزار ہونے والے شوہر کی داستان، شدید محبت مرد کو عورت سے بیزار کر دیتی ہے، بیوی لڑتی ہے ہنستی ہے اور غرض کیا کچھ نہیں کرتی۔	چار روپے
زیب النساءٔ حسین انور	اس مغل شہزادی کی دلکش داستان جس کی ضیا باریوں نے ایران اور ہندوستان کو جگمگا دیا۔ عالمگیر کی چہیتی بیٹی جس نے علم و ادب کے پرچم کو بلند کیا۔	سات روپے بارہ آنے
بیرم خان حسین انور	مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال کے رفیق اکبر کے اتالیق کے دلکش رومانی واقعات۔ تاریخ میں یہ ناول موضوع کے اعتبار سے بالکل نیا ہے۔	سات روپے آٹھ آنے
بنی احمر کا خواب عشرت رحمانی	ابن سراج کے عشق و محبت کی عبرتناک داستان، محبت اور فرض کی جنگ، فرض کی کامیابی اور سچی محبت کی فتح۔ نہایت دلگداز ناول۔	تین روپے
پل صراط سعیدہ مظہر	ایک نوجوان کی دلگداز داستان جو ہرجائی ہوا اور بامراد نہ ہو سکا۔ اور صنف نازک نے محبت کا جواب محبت سے دیا گو ٹھکرا دی گئی۔ پھر خود بھی مرد کو ٹھوکر مار دی۔	چار روپے

کتاب منزل لاہور کے منتخب ناول